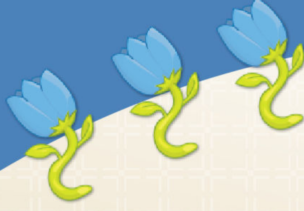
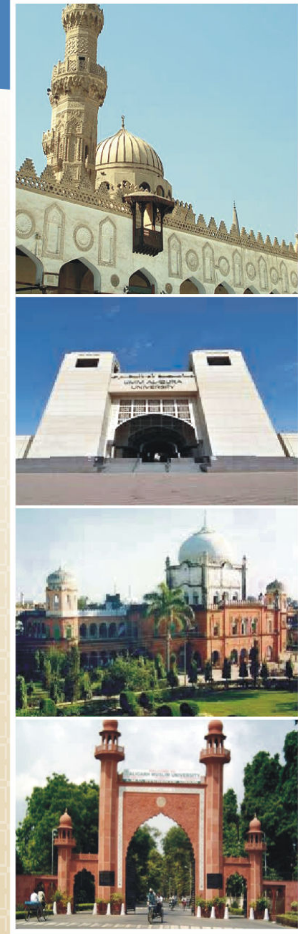




الشریعۃ

ماہنامہ

گوجرانوالہ



خصوصی اشاعت

ماہنامہ الشریعہ کا طرز فکر اور پالیسی:
اعتراضات و اشکالات کا جائزہ

جون ۲۰۱۴ء



www.alsharia.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خصوصی اشاعت

”ماہنامہ ”الشریعہ“ کا طرز فکر اور پالیسی:
اعتراضات واشکالات کا جائزہ“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وحدت امت کا داعی اور غلبہ اسلام کا علم بردار

ماہنامہ **الشریعہ** گوجرانوالہ

جلد: ۲۵ ○ شمارہ: ٦ ○ جون ۲۰۱۴ء

بیاد: حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ / حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

○

خصوصی اشاعت

”ماہنامہ ”الشریعہ“ کا طرز فکر اور پالیسی: اعتراضات واشکالات کا جائزہ“

(اضافی ملحق شمارہ جون ۲۰۱۴ء)

○

زر تعاون	خط وکتابت کے لیے	زیر اہتمام	شعبہ ترسیل
سالانہ 300 روپے	ماہنامہ الشریعہ	الشریعہ اکادمی	حافظ محمد طاہر
خصوصی اشاعت	پوسٹ بکس 331 گوجرانوالہ	ہاشمی کالونی کنگنی والا گوجرانوالہ	جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ
150 روپے	aknasir2003@yahoo.com	www.alsharia.org	0306-6426001

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد ۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

'الشریعہ' کی پالیسی اور مولانا زاہد الراشدی کا طرز فکر

حالیہ فتویٰ بازی: پس منظر وپیش منظر

کلمہ حق

محمد عمار خان ناصر

خصوصی اشاعت کا پس منظر اور مقصد

زیر نظر خصوصی اشاعت کی صورت میں مقالات ومضامین کا جو مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اس کا ظاہری تناظر تو علمی وفکری مسائل پر آزادانہ بحث ومباحثہ کے حوالے سے 'الشریعہ' کی پالیسی اور 'الشریعہ' کے رئیس التحریر ومدیر کے طرز فکر پر سامنے آنے والی چند تنقیدات ہیں، تاہم اس اشاعت کے مندرجات کو اس وقتی تناظر تک محدود نہ رکھنے کی شعوری سعی کی گئی ہے۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ مشمولہ مضامین میں جزوی اعتراضات واشکالات پر توجہ بہت کم دی گئی ہے، جبکہ ان اعتراضات کے پیچھے کارفرما مخصوص ذہنی مزاج اور فکری سانچے کو زیادہ موضوع بحث بنایا گیا اور وسیع تر علمی وتاریخی تناظر میں 'الشریعہ' کے اختیار کردہ منہج اور پالیسی کی فکری اساسات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک کسی بھی مسئلے پر بحث ومباحثہ اور نقد ونظر کا مثبت اور قابل استفادہ پہلو یہی ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں سامنے آنے والے سوالات کو مسئلے کی تہہ تک پہنچنے اور گہرائی میں جا کر اس کا تجزیہ کرنے کا ذریعہ بنایا جائے اور اعتراضات واشکالات کے جواب میں ضروری امور کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ''اسلوبِ حکیم'' کے تحت بحث کے دیگر متعلقہ پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے کی سعی کی جائے تاکہ مسئلے کا مالہ وماعلیہ ممکنہ حد تک قارئین کے سامنے آ سکے۔

خصوصی اشاعت کے مندرجات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلے حصے میں شامل مضامین دیوبندی فکر ومزاج میں اختلاف رائے اور اجتماعیت کے مابین توازن کے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور ان میں دیوبندی مکتب فکر کے اکابر اہل علم کی تحریروں اور طرز عمل کی روشنی میں اختلاف رائے کے حدود وآداب اور اختلاف کے باوجود مخالفین کے لیے علمی رواداری اور احترام کے چند نمایاں نمونے سامنے لائے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ 'الشریعہ' کے طرز فکر اور پالیسی اور مولانا زاہد الراشدی کی آرا ونظریات پر کیے جانے والے بعض

اعتراضات والزامات کے تجزیے کے لیے خاص کیا گیا ہے اور اس میں بالخصوص یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آزادانہ مباحثہ ومکالمہ کی روایت ہماری علمی تاریخ کا حصہ رہی ہے اور اسلام کے اجتماعی مزاج اور اسلامی اصول بحث وتحقیق کا ایک لازم اور ناگزیر حصہ ہے۔

تیسرا اور آخری حصہ فتوے بازی کی ایک مہم کے علمی واخلاقی پوسٹ مارٹم کے لیے مخصوص ہے جو حال میں بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے ''الشریعہ'' اور متعلقین ''الشریعہ'' کو گمراہ قرار دے کر ان کے مقاطعہ کی اپیل کی صورت میں جاری کی گئی۔ ''الشریعہ'' کے حوالے سے اختیار کیے جانے والے غیر علمی وغیر اخلاقی رویے کو آشکارا کرنے کے ساتھ ساتھ اس حصے میں انھی حلقوں کی طرف سے ماضی میں اسی نوعیت کے علمی وفکری مسائل میں اختیار کیے جانے والے طرز عمل کی بھی، بطور نمونہ، نشان دہی کر دی گئی ہے تاکہ قارئین اس طرز عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کا باعث بننے والے مخصوص نفسیاتی مزاج اور ذہنی سانچے کو بھی پیش نظر رکھ سکیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ مختصر کاوش زیر بحث موضوع سے متعلق 'الشریعہ' کے نقطہ نظر اور اس کے استدلال کی وضاحت کے لیے مفید ثابت ہوگی اور قارئین، ناقدین ومعترضین کے پیش کردہ مقدمے کے ساتھ ہمارے موقف کا موازنہ کر کے آزادئ فکر کے ساتھ کسی بھی نتیجے تک پہنچنے میں اسے مددگار پائیں گے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین

محمد عمار خان ناصر

۲۵ رمئی ۲۰۱۴ء

اختلافِ رائے اور اجتماعیت

دیوبندی فکر و مزاج کے تناظر میں

شیخ محمد اکرامؒ

دیوبند اور علی گڑھ میں ہم آہنگی کے لیے شیخ الہند کی مساعی

مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے بعد دیوبند کے جس بزرگ نے سب سے زیادہ نام پایا، وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے جنھوں نے تحریک خلافت کے آغاز میں وفات پائی اور جن کے مبارک ہاتھ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس ہوئی۔

وہ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں حصول تعلیم کے بعد پہلے وہاں مدرس اور ۱۸۸۸ء میں صدر مدرس ہوئے اور تینتیس سال تک اس عہدے پر نامزد رہے۔ آپ کے زمانے کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان جو کشیدگی تھی، وہ بڑی حد تک رفع ہوگئی۔ دیوبند اور علی گڑھ کے بانیوں کا آخری سرچشمہ فیض ایک تھا، یعنی ولی اللہی خاندان کی تعلیمات، لیکن ان کے مقاصد اور طریق کار میں بعد عظیم تھا۔ سرسید کا بڑا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضروریات پر تھی۔ پھر سرسید طبقہ امراء کے رکن تھے اور مولانا محمد قاسم جمہور کے نمائندے۔ سرسید کی خواہش تھی کہ اسلامی اقتدار کا وہ سائبان جن کے سایے کے نیچے صدیوں تک جمہور کو آرام ملا تھا اور علماء وصلحاء کو کام کرنے کا موقع میسر آیا تھا، کسی طرح بالکل تباہ وبرباد ہونے سے بچ جائے اور مولانا محمد قاسم کی نظر جمہور اور علماء کی فوری ضروریات پر تھی۔ اس کے علاوہ ملکی معاملات میں دونوں کا طریق کار مختلف تھا۔ جنگ آزادی میں سرسید، مولانا محمد قاسم اور ان دونوں کے ساتھیوں نے حصہ لیا تھا، لیکن سرسید نے ایک فریق کا ساتھ دیا تو دوسرے نے اس کے مخالف فریق کا۔

مولانا محمود الحسن کو بھی علی گڑھ سے کم اختلافات نہ تھے۔ انھیں سرسید سے پیر بھائی یا استاد بھائی ہونے کا بھی وہ ربط حاصل نہ تھا جو سرسید اور بعض بزرگان دیوبند کے درمیان تھا، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ان کے زمانے میں علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلیج پر ہونے کا سامان ہوا۔ ایک تو شاید مولانا محمود الحسن دیکھتے ہوں گے کہ خواہ سرسید اپنی تفسیر میں کچھ لکھیں، لیکن علی گڑھ میں مذہب اور دینیات کا صیغہ تو ارباب دیوبند کے سپرد ہے۔ جو بزرگ اس زمانے میں وہاں ناظم دینیات تھے، وہ داماد تھے مولانا محمد قاسم کے اور نواسے تھے مولانا مملوک علی کے اور فی الحقیقت ان کا شمار بزرگان دیوبند ہی میں ہوتا ہے۔

اسی طرح جہاد کے متعلق جو اختلاف علی گڑھ اور دیوبند میں تھا، اس میں بھی علی گڑھ پارٹی کے شبہات بے بنیاد نہ

تھے، بلکہ جب غدر کے وقت تھانہ بھون میں اس مسئلے پر وہ تاریخی بحث ہوئی جس میں حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے علماء نے حصہ لیا تو ان علماء ہی میں سے ایک محترم بزرگ مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ محدث نے، جو مولانا اشرف علی تھانوی کے استاد اور پیر طریقت تھے، کم وبیش وہی دلائل دیے جن کی بنا پر سرسید نے اس مرحلے پر مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ سے مختلف طریق کار اختیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے رفقائے کار نے ان دلائل کو قبول نہ کیا اور جب مولانا محمد قاسم نے کہا کہ ''کیا ہم حضرات بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان اور مفلس ہیں'' تو حاجی امداد اللہ، جو ابھی تک مذبذب تھے، ان سے متفق ہو گئے، لیکن یہ کہنا کہ مولانا شیخ محمد کے دلائل بے وقعت تھے یا واقعات نے انھیں غلط ثابت کیا، حقیقت کے خلاف ہوگا۔

مولانا محمود الحسن کو اعتراف تھا کہ اس مسئلے میں ارباب علی گڑھ کے شبہات بے بنیاد نہیں۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک خطبہ میں کہا ہے: ''اپنے استاد حضرت شیخ الہند سے ہم نے جو خاص باتیں سیکھی ہیں، ان میں سے ایک چیز جہاد کا مسئلہ ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں اس مسئلے پر ملک میں بڑی بحثیں ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ پارٹی جہاد کے معنی نئے طریقے پر کرتی تھی اور اس سلسلے میں ایسے شبہات لاتی تھی جن کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ خدا کے فضل سے ہمیں حضرت شیخ الہند کی صحبت کے فیض سے اس مسئلے میں پورا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کے طلبہ سے اس معاملے میں اگر ہماری گفتگو ہوتی تو ہم انھیں جہاد کا مقصود اصلی صحیح طرح سمجھا سکتے تھے۔''

اس کے علاوہ حضرت شیخ الہند کو احساس تھا کہ ان کے ہم خیال لوگ سکولوں اور کالجوں میں بھی اسی طرح ہیں جس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں۔ چنانچہ آپ نے ان کی طرف دست تعاون دراز کیا۔ آپ کے اس خطبہ صدارت کے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بمقام علی گڑھ پڑھا گیا، بعض فقرے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے طلبہ سے فرمایا:

> ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں، دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔''

مولانا محمود الحسن دیوبندی کو کالجوں کے طلبہ سے شبلی سے کہیں زیادہ شکایتیں تھیں، لیکن مولانا کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جب ان طلبہ میں سے انھیں کوئی مذہب کا پابند یا مذہب میں دلچسپی لینے والا ملتا تو مولانا اسے ''گوڈریوں کا لال سمجھ کر'' اس کی بے انتہا قدر کرتے، بلکہ ان کا یہ رجحان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان کے مخالف کہتے ہیں کہ ''حضرت کو نیچریوں سے مناسبت ہو گئی تھی۔'' (منقولہ در حیات شیخ الہند ص ۱۴۶)

شیخ الہند نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا، وہ ۱۹۰۶ء میں جمعیت الانصار کا قیام تھا جس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے تھے اور جس کے سلسلے میں ''علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا کہ

انگریزی خواندہ طلبہ جو تبلیغ کا شوق رکھیں، وہ دارالعلوم دیوبند میں جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں۔ دارالعلوم اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبہ کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے۔''

جمعیۃ الانصار کے سیکرٹری حضرت شیخ الہند کے معتمد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی تھے جو جماعت دیوبند میں ''حضرت شیخ کے دماغ'' گنے جاتے تھے اور جو طبعاً مخالف فریقین کے درمیان واسطہ بننے کے لیے خاص طور پر موزوں تھے۔ کچھ عرصے کے بعد چند مقامی مشکلات کی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنا کام دہلی منتقل کیا اور ۱۹۱۳ء میں وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ کی بنیاد ڈالی جس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک سیکرٹری علی گڑھ بھی شریک تھے۔ نواب موصوف نے نہ صرف چندوں کے لیے پرائیویٹ طور پر کوشش کی، بلکہ اخبارات میں بھی پرزور اپیل شائع کی اور لوگوں کو دائرہ کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔

بدقسمتی سے ان کوششوں میں سیاسی الجھنیں حائل ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے بعد شیخ الہند ہندوستان سے باہر چلے گئے اور علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان علمی اور روحانی ارتباط کا کام رک گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمود الحسن ہندوستان واپس لوٹے تو وہ دق کے مریض اور دنوں کے مہمان تھے، لیکن دیوبند اور علی گڑھ کے امتزاج کی سب سے اہم عملی کوشش ان کے مبارک ہاتھوں سے ابھی ہونے والی تھی۔ شدید مرض کی حالت میں آپ نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا جو ''علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ایسی آزاد درس گاہ تھی جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو'' اور جو اپنی کوتاہیوں کے باوجود علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان مل کر کام کرنے والوں کا آج سب سے بڑا مرکز ہے۔

شیخ الہند کی وفات ۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہوئی اور نعش دیوبند لے جا کر دفن کی گئی۔

(ماخوذ از ''موج کوثر'')

اختلافِ رائے اور اجتماعیت

دیوبندی فکر و مزاج کے تناظر میں

شیخ محمد اکرامؒ

دیوبند اور علی گڑھ میں ہم آہنگی کے لیے شیخ الہند کی مساعی

مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے بعد دیوبند کے جس بزرگ نے سب سے زیادہ نام پایا، وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے جنھوں نے تحریک خلافت کے آغاز میں وفات پائی اور جن کے مبارک ہاتھ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس ہوئی۔

وہ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں حصول تعلیم کے بعد پہلے وہاں مدرس اور ۱۸۸۸ء میں صدر مدرس ہوئے اور تینتیس سال تک اس عہدے پر نامزد رہے۔ آپ کے زمانے کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان جو کشیدگی تھی، وہ بڑی حد تک رفع ہوگئی۔ دیوبند اور علی گڑھ کے بانیوں کا آخری سرچشمہ فیض ایک تھا، یعنی ولی اللہی خاندان کی تعلیمات، لیکن ان کے مقاصد اور طریق کار میں بعد عظیم تھا۔ سرسید کا بڑا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضروریات پر تھی۔ پھر سرسید طبقہ امراء کے رکن تھے اور مولانا محمد قاسم جمہور کے نمائندے۔ سرسید کی خواہش تھی کہ اسلامی اقتدار کا وہ سائبان جن کے سایے کے نیچے صدیوں تک جمہور کو آرام ملا تھا اور علماء وصلحاء کو کام کرنے کا موقع میسر آیا تھا، کسی طرح بالکل تباہ وبرباد ہونے سے بچ جائے اور مولانا محمد قاسم کی نظر جمہور اور علماء کی فوری ضروریات پر تھی۔ اس کے علاوہ ملکی معاملات میں دونوں کا طریق کار مختلف تھا۔ جنگ آزادی میں سرسید، مولانا محمد قاسم اور ان دونوں کے ساتھیوں نے حصہ لیا تھا، لیکن سرسید نے ایک فریق کا ساتھ دیا تو دوسرے نے اس کے مخالف فریق کا۔

مولانا محمود الحسن کو بھی علی گڑھ سے کم اختلافات نہ تھے۔ انھیں سرسید سے پیر بھائی یا استاد بھائی ہونے کا بھی وہ ربط حاصل نہ تھا جو سرسید اور بعض بزرگان دیوبند کے درمیان تھا، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ان کے زمانے میں علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلیج پر ہونے کا سامان ہوا۔ ایک تو شاید مولانا محمود الحسن دیکھتے ہوں گے کہ خواہ سرسید اپنی تفسیر میں کچھ لکھیں، لیکن علی گڑھ میں مذہب اور دینیات کا صیغہ تو ارباب دیوبند کے سپرد ہے۔ جو بزرگ اس زمانے میں وہاں ناظم دینیات تھے، وہ داماد تھے مولانا محمد قاسم کے اور نواسے تھے مولانا مملوک علی کے اور فی الحقیقت ان کا شمار بزرگان دیوبند ہی میں ہوتا ہے۔

اسی طرح جہاد کے متعلق جو اختلاف علی گڑھ اور دیوبند میں تھا، اس میں بھی علی گڑھ پارٹی کے شبہات بے بنیاد نہ

تھے، بلکہ جب غدر کے وقت تھانہ بھون میں اس مسئلے پر وہ تاریخی بحث ہوئی جس میں حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے علماء نے حصہ لیا تو ان علماء ہی میں سے ایک محترم بزرگ مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ محدث نے، جو مولانا اشرف علی تھانوی کے استاد اور پیر طریقت تھے، کم وبیش وہی دلائل دیے جن کی بنا پر سرسید نے اس مرحلے پر مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ سے مختلف طریق کار اختیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے رفقائے کار نے ان دلائل کو قبول نہ کیا اور جب مولانا محمد قاسم نے کہا کہ ''کیا ہم حضرات بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان اور مفلس ہیں'' تو حاجی امداد اللہ، جو ابھی تک مذبذب تھے، ان سے متفق ہو گئے، لیکن یہ کہنا کہ مولانا شیخ محمد کے دلائل بے وقعت تھے یا واقعات نے انھیں غلط ثابت کیا، حقیقت کے خلاف ہوگا۔

مولانا محمود الحسن کو اعتراف تھا کہ اس مسئلے میں ارباب علی گڑھ کے شبہات بے بنیاد نہیں۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک خطبہ میں کہا ہے: ''اپنے استاد حضرت شیخ الہند سے ہم نے جو خاص باتیں سیکھی ہیں، ان میں سے ایک چیز جہاد کا مسئلہ ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں اس مسئلے پر ملک میں بڑی بحثیں ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ پارٹی جہاد کے معنی نئے طریقے پر کرتی تھی اور اس سلسلے میں ایسے شبہات لاتی تھی جن کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ خدا کے فضل سے ہمیں حضرت شیخ الہند کی صحبت کے فیض سے اس مسئلے میں پورا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کے طلبہ سے اس معاملے میں اگر ہماری گفتگو ہوتی تو ہم انھیں جہاد کا مقصود اصلی صحیح طرح سمجھا سکتے تھے۔''

اس کے علاوہ حضرت شیخ الہند کو احساس تھا کہ ان کے ہم خیال لوگ سکولوں اور کالجوں میں بھی اسی طرح ہیں جس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں۔ چنانچہ آپ نے ان کی طرف دست تعاون دراز کیا۔ آپ کے اس خطبہ صدارت کے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بمقام علی گڑھ پڑھا گیا، بعض فقرے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے طلبہ سے فرمایا:

> ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں، دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔''

مولانا محمود الحسن دیوبندی کو کالجوں کے طلبہ سے شبلی سے کہیں زیادہ شکایتیں تھیں، لیکن مولانا کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جب ان طلبہ میں سے انھیں کوئی مذہب کا پابند یا مذہب میں دلچسپی لینے والا ملتا تو مولانا اسے ''گوڈریوں کا لال سمجھ کر'' اس کی بے انتہا قدر کرتے، بلکہ ان کا یہ رجحان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان کے مخالف کہتے ہیں کہ ''حضرت کو نیچریوں سے مناسبت ہو گئی تھی۔'' (منقولہ در حیات شیخ الہند ص ۱۴۶)

شیخ الہند نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا، وہ ۱۹۰۶ء میں جمعیت الانصار کا قیام تھا جس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے تھے اور جس کے سلسلے میں ''علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا کہ

انگریزی خواندہ طلبہ جو تبلیغ کا شوق رکھیں، وہ دارالعلوم دیوبند میں جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں۔ دارالعلوم اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبہ کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے۔''

جمعیۃ الانصار کے سیکرٹری حضرت شیخ الہند کے معتمد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی تھے جو جماعت دیوبند میں ''حضرت شیخ کے دماغ'' گنے جاتے تھے اور جو طبعاً مخالف فریقین کے درمیان واسطہ بننے کے لیے خاص طور پر موزوں تھے۔ کچھ عرصے کے بعد چند مقامی مشکلات کی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنا کام دہلی منتقل کیا اور ۱۹۱۳ء میں وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ کی بنیاد ڈالی جس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک سیکرٹری علی گڑھ بھی شریک تھے۔ نواب موصوف نے نہ صرف چندوں کے لیے پرائیویٹ طور پر کوشش کی، بلکہ اخبارات میں بھی پرزور اپیل شائع کی اور لوگوں کو دائرہ کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔

بدقسمتی سے ان کوششوں میں سیاسی الجھنیں حائل ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے بعد شیخ الہند ہندوستان سے باہر چلے گئے اور علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان علمی اور روحانی ارتباط کا کام رک گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمود الحسن ہندوستان واپس لوٹے تو وہ دق کے مریض اور دنوں کے مہمان تھے، لیکن دیوبند اور علی گڑھ کے امتزاج کی سب سے اہم عملی کوشش ان کے مبارک ہاتھوں سے ابھی ہونے والی تھی۔ شدید مرض کی حالت میں آپ نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا جو ''علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ایسی آزاد درس گاہ تھی جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو'' اور جو اپنی کوتاہیوں کے باوجود علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان مل کر کام کرنے والوں کا آج سب سے بڑا مرکز ہے۔

شیخ الہند کی وفات ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہوئی اور نعش دیوبند لے جا کر دفن کی گئی۔

(ماخوذ از ''موج کوثر'')

مولانا قاری محمد طیبؒ

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل

[دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے شمارہ
جنوری رفروری ۱۹۷۹ء میں شائع شدہ مقالے سے اقتباسات]

۲۶ ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک غیر معمولی اور عظیم اجلاس میں شرکت ہوئی جس کا موضوع تھا ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ''۔ اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندوں اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلاء اور دانش وروں نے شرکت کی۔ اجلاس کی اہمیت صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی احمد کی شرکت سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ احقر ناکارہ کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا۔......

فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیّز ہے۔ فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کا امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اجتہاد کا دروازہ کلیتاً مسدود ہو جاتا اور شرائع فرعیہ امت کے سامنے نہ آ سکتیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے، مگر اجتہاد کی جنس بہر حال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی۔ اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دلائی ہے اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے انکشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے، بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے، کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم وجدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا کہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں میں قدیم وجدید کی دوئی ختم کر کے انھیں افکار ونظریات اور عقائد ومقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے، اس لیے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک وتحسین کی مستحق ہے۔......

اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول، اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت وسیاست اور عبادت ومدنیت بیک وقت جمع ہے، وقت کے مسائل کو نئی تشکیل وترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی جبکہ اس میں فقیہ المزاج

شخصیات، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلف صالحین کا اسوہ، مرادات خداوندی کے ساتھ تقید، رضاءِ حق کی پاس داری، اجتماعی صلاح وفلاح، اخروی نجات کا فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ ''فکر اسلامی تشکیل جدید'' دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آ جائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور تفقہ مزاج کی ضرورت ہے جس کی تفصیل عرض کی گئی، وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہچانتے ہوں۔ عصری حالات اور وقت کی ضرورت بھی ان کے سامنے ہوں۔ علوم عصریہ میں انھیں مہارت وحذاقت میسر ہو۔ دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھے ہوئے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں، کیونکہ حالات ہی اصل محرک فتاویٰ ہیں۔

اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں، لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت ومہارت کی حامل ہو۔ عموماً اور اکثر وبیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناگوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر وبیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی، لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی اور دوسری طرف ماہرین عصریات جب کہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بے گانہ بھی ہیں، اگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض انھی کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی۔ بہر دو صورت تشکیل جدید کا خاکہ ناتمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس تشکیل کے لیے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائے جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور وفکر اور باہمی بحث وتمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکروں کو کتاب وسنت اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لیے ہوئے گا جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا۔ نیز ایک طبقہ کا ہدف طعن وملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سدراہ نہ ہوگا۔

جمعیۃ علمائے ہند کا قیام: پس منظر اور مقاصد

[جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے موقع پر مرتب کیا جانے والا تاریخی تعارفی کتابچہ]

نومبر ۱۹۱۹ء کی آخری تاریخوں میں خلافت کانفرنس کے جلسے کی تقریب سے تمام اقطار ہند کے علما کی ایک معتد بہ جماعت دہلی میں جمع ہوگئی تھی۔ خلافت کانفرنس کے اجلاسوں سے فارغ ہونے کے بعد تمام علماے موجودین نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں صرف حضرات علما ہی شریک ہوئے۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب کی تحریک اور مولانا منیر الزماں صاحب و دیگر حاضرین کی تائید سے جناب فاضل علامہ حضرت مولانا مولوی محمد عبدالباری صاحب اس جلسے کے صدر قرار پائے اور مولانا کی اجازت سے حسب ذیل کارروائی شروع ہوئی۔

جشن صلح میں شرکت کے متعلق مذہبی نقطہ نظر سے بحث مباحثہ کے بعد متفقہ طور پر وہ فتویٰ مرتب کیا گیا جو انجمن اشاعت اختلاف جشن صلح دہلی کی طرف سے طبع ہوکر شائع ہو چکا ہے۔ تمام علماے حاضرین جلسہ نے بلا اختلاف اس پر اپنے اپنے دستخط فرما دیے اور اس اجتماعی حکم کا جو اثر اہل ملک پر ہونا چاہیے تھا، وہ خدا کے فضل وکرم سے بہ خوبی ظاہر وروشن ہوگیا۔

اسی جلسے میں یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ ہندوستان کے مختلف گروہوں اور مختلف اقوام کی متحدہ انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں جو متفقہ کوشش اور قوت اتحادی سے بہت کچھ ملک وقوم کی خدمت کرتی ہیں اور اتفاق واتحاد کی برکات سے خود بھی متمتع ہوتی ہیں اور قوم کو بھی فائدہ پہنچاتی ہیں، لیکن آج تک علماے ہند کی کوئی متفقہ جماعت یا انجمن قائم نہیں ہوئی اور بعض انجمنوں نے اس کی کوشش بھی کی تو وہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی، کیونکہ خیالات کا اختلاف اول تو انسان کی طبعی بات ہے۔ دوسرے مذہبی طبقے میں اختلاف چونکہ مذہبی رنگ پکڑ جاتا ہے، اس لیے اس کا دفعیہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی غیر مذہبی گروہ کے افراد میں اگر اختلاف ہوتو فریق مغلوب اگرچہ اپنے خیال کو صحیح بھی سمجھتا رہے، لیکن بہ وجہ اس کے کہ اس کے خلاف کثرت رائے سے فیصلہ ہوگیا ہے، وہ بغیر کسی پس وپیش کے اس فیصلے پر عمل کر سکتا ہے، لیکن مذہبی گروہ میں اگر ایسا اختلاف ہوتو فریق مغلوب سوائے ایسی صورت کے کہ اس کو اپنے خیال اور رائے کی غلطی کا یقین ہو جائے، کسی صورت میں اپنے اعتقاد ویقین کے خلاف عمل کو جائز نہیں سمجھتا، اگرچہ اس کے اعتقاد کے خلاف کتنی ہی زیادہ تعداد کے لوگ رائے دیتے ہوں۔ یہ ایک ایسا مرحلہ تھا کہ اس کا حل کوئی آسان کام نہیں تھا۔

تاہم بحث ومباحثہ کے بعد تمام علماے حاضرین نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ علما کی جماعت بھی ایسے امور میں جو تقریباً تمام مذہبی فرقوں میں متفق علیہ ہیں، متفقہ طور پر شریک ہو کر کام کر سکتی ہے اور بہ اقتضاے زمانہ اسی صورت سے مذہبی وقار اور علمی شوکت قائم رہ سکتی ہے کہ علما اپنی ایک مضبوط اور مقتدر جمعیت قائم کریں اور صرف مشترکہ مذہبی و سیاسی امور میں عامہ اہل اسلام کی رہنمائی کا فرض ادا کریں۔ ان کی آواز اسی وقت باوقعت آواز ہوگی جب کہ وہ ایک باقاعدہ منظم جماعت کی طرف سے بلند ہو اور ان کی تعلیم ورہنمائی کی تکمیل اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ یہ اسے اتفاق واتحاد کی قوت سے موثر بنائیں۔

یہ ایسے امور تھے کہ ان کی معقولیت میں کسی کو کلام کرنے کی گنجایش نہ تھی۔ اس لیے تمام حاضرین جلسہ نے بہ اتفاق طے کر لیا کہ ایک جمعیت قائم کی جائے اور اس کا نام جمعیت علمائے ہند رکھا جائے۔ اس کے حلقے کو تمام ہندوستان کے لیے وسیع کر دیا جائے اور ہر گوشہ ملک سے اس کے ارکان واعضا بہم پہنچائے جائیں اور عامہ اہل اسلام کی فلاح و بہبود کے ذرائع و وسائل پر غور کر کے سچی مذہبی خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی رہنمائی کی جائے۔

چنانچہ اسی وقت تمام حاضرین نے جمعیت کی رکنیت منظور فرمائی اور جمعیت علمائے ہند قائم ہو گئی اور قرار پایا کہ آئندہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہونے والے ہیں اور مسئلہ خلافت ومسائل ٹرکی پر بحث کرنے کے خیال سے علمائے اسلام کی معقول تعداد وہاں جمع ہوگی، اس لیے مناسب ہے کہ اس موقع پر جمعیت علمائے ہند کا جلسہ بھی کیا جائے اور ابتدائی مراحل طے کر لیے جائیں۔ مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری ومولوی سید محمد داؤد صاحب نے جمعیت علمائے ہند کے موجودہ اراکین کو امرتسر میں تشریف لانے کے لیے اسی وقت دعوت دے دی اور بالاتفاق طے ہو گیا کہ جمعیت کا جلسہ آئندہ دسمبر میں بہ مقام امرتسر منعقد ہوگا۔

مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب نے تحریک کی کہ جمعیت علمائے ہند کے لیے بالفعل کوئی عارضی صدر اور عارضی ناظم مقرر کر لیا جائے تاکہ امور ضروریہ کے انصرام کی ایک آسان سبیل میسر ہو جائے اور صدارت کے لیے میں مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب کا نام اور نظامت کے لیے مولانا حافظ احمد سعید صاحب کا نام پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ مولانا مولوی محمد کفایت اللہ صاحب نے قبول صدارت سے بہت کچھ عذر کیا، لیکن حضرات حاضرین نے اس تحریک کو، جس کی تائید مولانا سلامت اللہ صاحب، مولانا مظہر الدین صاحب، مولانا محمد اکرم خاں صاحب ودیگر علماء کر چکے تھے، منظور کر دیا اور بالآخر مولانا کو بھی منظور کرنا پڑا اور مولانا حافظ احمد سعید صاحب نے بھی نظامت قبول فرمائی۔ اس کے بعد بہ اتفاق حاضرین مولانا محمد اکرم خاں صاحب ایڈیٹر اخبار محمدی، مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اس کام کے لیے منتخب کیے گئے کہ جمعیت کے مقاصد وضوابط کا مسودہ تیار کریں اور جمعیت کے آئندہ دسمبر میں منعقد ہونے والے جلسے میں بہ مقام امرتسر پیش کریں۔ اس کے بعد دعائے خیر وبرکت پر جلسہ برخاست ہوا۔

دہلی کے اس جلسے میں علمائے ذیل موجود تھے:

حضرت مولانا عبدالباری صاحب　　　　مولانا سلامت اللہ صاحب

مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب
حضرت پیر محمد امام صاحب سندھی
مولانا اسد اللہ صاحب سندھی
مولانا سید محمد فاخر صاحب
مولانا مولوی محمد انیس صاحب
مولانا خواجہ غلام نظام الدین صاحب
مولانا محمد کفایت اللہ صاحب
مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی
مولانا سید کمال الدین صاحب
مولانا قدیر بخش صاحب
مولانا تاج محمود صاحب
مولانا محمد ابراہیم صاحب دربھنگہ
مولانا خدا بخش صاحب مظفر پوری
مولانا مولا بخش صاحب امرتسری
مولانا عبدالحکیم صاحب گیاوی
مولانا محمد اکرم صاحب
مولانا منیر الزماں صاحب
مولانا محمد صادق صاحب
مولانا سید محمد داؤد صاحب
مولانا سید محمد اسماعیل صاحب
مولانا محمد عبداللہ صاحب
مولانا آزاد سبحانی صاحب

(ماخذ: ''سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ: ایک سیاسی مطالعہ'' از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری)

مولانا محمد فیاض خان سواتی*

اکابر علماء دیوبند کا اجتماعی مزاج اور علمی رواداری

اکابر علماء دیوبند نے دو قسم کا کام کیا ہے۔ ایک وہ جو علمی و تحقیقی ہے اور ہمارے لیے مستقل راہنما ہے اور دوسرا وہ جو وقتی ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے انجام دیا اور ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس دور کے اکابرین ایسی حکمت عملی اختیار کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں قائم ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کو بطور نمونہ اور مثال کے پیش کیا جا سکتا ہے جس کے تحت تمام مسالک کے لوگ شامل ہیں اور اس بورڈ کے تحت ان کی وقتی ضروریات ان کی مسلکی اور فقہی رعایت رکھتے ہوئے پوری کی جاتی ہیں، حالانکہ اس ادارہ میں شریک وہ علماء اس سے متفق نہیں ہوتے۔ یہ بورڈ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کی مشاورت سے قائم ہوا تھا بلکہ اس کے پہلے چیئرمین بھی وہی تھے۔ ان کے بعد اب تک اس بورڈ کے چیئرمین دیوبندی اور ندوی علماء کرام ہی مسلسل چلے آرہے ہیں۔

ایسے فورم اور بورڈ قائم کرنے میں اکابر کا نمونہ موجود ہے اور ہمارے ان اکابر نے امت کی اجتماعی ضروریات کے پیش نظر فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

☆ ہمارے شیخین کریمینؒ نے تو ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں کل جماعتی مجلس تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے گرفتاری دی تھی اور کئی ماہ جیل میں رہے تھے جو مشترکہ فورم تھا اور اس کے سربراہ بریلوی مکتبہ فکر کے مولانا ابو الحسنات قادری مرحوم تھے۔

☆ امام اہل السنۃؒ نے ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران پاکستان قومی اتحاد کے پلیٹ فارم سے نہ صرف گرفتاری دی تھی اور ایک ماہ جیل میں رہے تھے بلکہ ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے جب ایف، ایس، ایف کے کمانڈر نے ریڈ لائن عبور کرنے پر گولی مار دینے کی دھمکی دی تھی تو کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے امام اہل السنۃؒ یہ کہہ کر ریڈ لائن کراس کر گئے تھے کہ ''مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور شہادت کی تمنا رکھتا ہوں۔''

یہ پلیٹ فارم بھی مشترکہ فورم تھا جس کے سربراہ مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ تھے اور ان کے ساتھ مرکزی قیادت میں مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم، علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم، میاں طفیل محمد مرحوم اور آغا مرتضیٰ پویا بھی شامل تھے۔

* مہتمم جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

☆ اسی تحریک نظام مصطفیٰ میں مفسر قرآنؒ نے گرفتاری کے لیے اپنے گلے میں قرآن کریم لٹکا کر گوجرانوالہ کے سب سے بڑے جلوس کی قیادت کی تھی، لیکن ان کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔

☆ پاکستان کے لیے ۲۲ دستوری نکات مرتب کرنے والا فورم بھی تمام مکاتب فکر کا مشترکہ فورم تھا جس کی صدارت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کی تھی، اور اس میں تمام مسالک دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ، مودودی وغیرہ بھی شامل تھے۔

☆ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں گوجرانوالہ میں سب سے بڑا جلسہ مدرسہ نصرۃ العلوم کی جامع مسجد نور میں محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ بانی و مہتمم الجامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کی صدارت میں ہوا تھا جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء شریک تھے حتیٰ کہ سید محبوب علی شمسی اور ع، غ کراروی جن کا تعلق شیعہ مکتبہ فکر سے تھا انہوں نے بھی خطاب کیا۔

☆ قومی اتحاد، اسلامی جمہوری اتحاد، ملی یکجہتی کونسل، متحدہ مجلس عمل، اتحاد تنظیمات مدارس اسلامیہ وغیرہ ایسے مشترکہ پلیٹ فارم ہیں جن میں علماء دیوبند اب تک شامل چلے آ رہے ہیں۔ ایسے فورم یا بورڈ کی تشکیل کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہ اکابرین ہی کے طرز و روش کا تسلسل ہے۔

دیگر مکاتب فکر کی کتب پر تقریظات و تصدیقات

اکابر علماء دیوبند نے قدیماً و حدیثاً دیگر مسالک کے لوگوں کی کتب پر تقاریظ، تصدیقات، تاثرات اور تبصرے لکھے ہیں اور لکھوائے بھی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مسلک دیوبند کے سرخیل اسیر مالٹا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری مرحوم کی ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' پر عربی میں تقریظ لکھی ہے۔ (ص۲) عقائد دیوبند کی متفقہ دستاویز ''المہند علی المفند'' کے مرتب حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بھی اسی تفسیر پر عربی میں تقریظ لکھی ہے۔ (ص۲) مؤرخ اسلام حضرت مولانا علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی اسی تفسیر پر عربی میں تقریظ لکھی ہے۔ (ص۲)

(۲) امام الاولیاء شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ''ترجمہ قرآن'' پر متعدد علماء دیوبند کی آراء کے ساتھ مولانا محمد چراغ مرحوم کی رائے بھی درج ہے۔ (ص۱۴) حضرت لاہوریؒ کے مطبوعہ ۳۳ رسائل پر کئی مسالک کے علماء کی تصدیقات دیکھی جا سکتی ہیں، مثلاً ابوالبرکات سید احمد رضوی اور محمد دیدار علی رضوی (ص۸۴) مولانا محمد چراغ مرحوم (ص۱۵۷) مولانا عبدالواحد غزنوی سلفی (ص۵۴)

(۳) سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کے ''ترجمہ القرآن المسمٰی بہ کشف الرحمٰن'' پر کئی اکابر علماء دیوبند کی آراء کے ساتھ مولانا عبدالوہاب آروی صدر آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس دہلی کی رائے بھی مطبوعہ ہے۔ (ج۱ص۱)

(۴) ترجمان دیوبند امام اہل السنۃ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ فاضل دیوبند کی دو کتب ''احسن الکلام''

اور ''مقام ابی حنیفہؒ'' پر جمعیۃ اشاعت التوحید والسنۃ پاکستان کے مرکزی راہنما مولانا قاضی شمس الدین مرحوم کی تقاریظ موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: احسن الکلام (ص ۲۶) اور مقام ابی حنیفہؒ (ص ۲۷)۔

(۵) عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی امیر حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ العالی فاضل دیوبند نے غیر مقلد عالم ابو ہشام محمد اعجاز اپل کی کتاب ''زاد عقبیٰ'' پر تقریظ لکھی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں ص ۷) اس کتاب پر دو غیر مقلدین اور تین دیگر دیوبندی علماء کی بھی تقریظات ہیں۔

(۶) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ''قاموس الفقہ'' پر کئی علماء دیوبند کی تقاریظ کے ساتھ ساتھ مولانا جلال الدین انصر عمری، امیر جماعت اسلامی ہند کی تقریظ بھی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں ص ۱۸۲) رحمانی صاحب کی دوسری کتاب ''جدید فقہی مسائل'' پر مولانا شاہ امان اللہ قادری سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کی تقریظ بھی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں ج ا ص ۱۸)

(۷) حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی فاضل دیوبند کی کتاب ''محاسن موضح قرآن'' پر کئی علماء دیوبند کے تاثرات کے ساتھ مولانا محمد یوسف امیر جماعت اسلامی ہند کے تاثرات بھی (بطور تقریظ) درج ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں ص ۲۸)

(۸) دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ المدنی مدظلہ العالی نے مولانا معین الدین خٹک مرحوم کی بخاری شریف کی شرح ''معین القاری'' پر تقریظ لکھی ہے۔

(۹) مولانا محمد چراغ مرحوم کی کتاب ''چراغ ہدایت'' پر سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں انہوں نے مولانا چراغ کی کتاب ''العرف الشذی'' کی تعریف علامہ محمد انور شاہؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ (ملاحظہ ہو چراغ ہدایت ص ۲۸ تا ۴۸)۔

(۱۰) عصر حاضر میں قائد اہل السنۃ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین چکوالیؒ فاضل دیوبند جو مسلک دیوبند کے بے لوث اور بے لچک راہنما تھے اور اسی مسلکی بنیاد پر انہوں نے جمعیۃ علماء اسلام کے جمہور علماء دیوبند سے علیحدگی اختیار کر کے تحریک خدام اہل السنۃ والجماعۃ کی بنیاد رکھی تھی اور خلافت راشدہ حق چار یارؓ کے نعرہ کے وہ بانی سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے حضرت مولانا محمد نافع جھنگوی زید مجدہ فاضل دیوبند کی تصانیف کی بڑی مدح فرمائی ہے۔ خصوصاً ''رحماء بینھم'' پر تو جید علماء دیوبند نے تصدیقات بھی لکھی ہیں۔ اس کتاب پر تصدیقات و تقریظات لکھنے والوں میں مندرجہ ذیل شخصیات بھی شامل ہیں۔

(۱) جسٹس پیر کرم شاہ الازہری بھیروی

(۲) پیر محبّ اللہ شاہ پیر آف جھنڈا سندھی

(۳) مولانا اللہ یار خان چکڑالوی میانوالوی

(۴) رب نواز چچازاد خواجہ قمر الدین سیالوی

(۵) پروفیسر محمد اسلم لاہوری

(۶) مولانا محمد چراغ گوجرانوالوی

(۷) مولانا محمد اسحاق صدیقی ندوی سندیلوی

(تفصیلات کے لیے دیکھیں: رحماء بینھم کا ابتدائیہ اور ماہنامہ فقاہت لاہور ص ۵۵ تا ۶۲ شمارہ ستمبر ۲۰۰۹ء)

مزید براں اگر اکابر کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو علماء دیوبند کے طرز فکر میں وسعت اور رواداری کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً عقائد دیوبند کی مستند کتاب ''المہند علی المفند'' پر حنفیوں دیوبندیوں کے علاوہ مالکیہ، شوافع، حنابلہ اور عرب وعجم کے کئی مفتیان کرام اور علماء عظام کی تصدیقات موجود ہیں۔ ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں جا بجا فتاویٰ پر دیگر مسالک کے علماء اور مفتیان کرام کی تصدیقات اور دستخط درج ہیں۔ سید الخطاطین مرشد عالم حضرت سید محمد انور حسین المعروف شاہ نفیس الحسینیؒ کا رسالہ ''حکایت مہر وفا'' کا تو ایک بار ضرور ہی مطالعہ کرنا چاہیے جو خاص اسی موضوع پر ہے کہ دیگر مسالک خصوصاً بریلوی مکتبۂ فکر کے کئی اہم علماء اور گدی نشینوں نے اکابر علماء دیوبند کی شخصیات اور ان کی کتب پر کیا تاثرات بیان کیے ہیں۔

دار العلوم الشہابیہ کے بانی حضرت مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی مرحوم اپنی قرآن کریم کی تفسیر ''معالم القرآن'' پارہ اول کے حرف آغاز میں رقمطراز ہیں:

> ''پیش نظر کتاب میں تفسیر وتشریح کی جو کوشش کی گئی ہے، اس کی بنیاد یہی ہے۔ اس سلسلے میں اولیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے افادات کو دی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ ان بزرگوں کے تفسیری افادات پورے پورے اس میں آ جائیں۔ ان دو بزرگوں کے علاوہ میں نے جن کے علوم سے استفادہ کیا ہے، ان کی کچھ تفصیل یہ ہے...... مولانا ثناء اللہ امرتسری ......مولانا نعیم الدین مراد آبادی...... مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی...... پیر محمد کرم شاہ بھیروی...... مولانا امین احسن اصلاحی۔''

مزید لکھتے ہیں:

> ''جس مقام پر تلاش وجستجو کے باوجود ان بزرگوں سے کوئی خاص بات نہ ملی تو پھر جن اعاظم مفسرین سے میں نے استفادہ کیا ہے، ان کے نام یہ ہیں...... نواب صدیق حسن خان...... محمد بن علی شوکانی......'' (معالم القرآن پارہ اول ص ۸ و ص ۹)

مفسر قرآن کا طرز عمل

والد ماجد مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی نے اپنی زندگی میں جن معدودے چند کتب پر تقاریظ لکھی ہیں، ان میں دار العلوم الشہابیہ کے سابق شیخ الحدیث پروفیسر حضرت مولانا میاں منظور مرحوم فاضل دیوبند کی

ابوداؤدشریف کی شرح بھی شامل ہے۔ میرے پاس اس تقریظ کی نقل موجود ہے۔ میاں صاحب موصوف اپنے پیش رَو مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی مرحوم کی طرح جماعت اسلامی سے متاثر تھے اور یہ بات اہل علم کے ہاں معروف ہے۔

مفسر قرآنؒ کی کتب پر جن لوگوں نے تقاریظ لکھی ہیں اور خطوط لکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہ ہم نے ''مفسر قرآن نمبر'' میں درج کر دی ہیں۔ وہاں ملاحظہ فرمالی جائیں۔ (ص ۱۱۱ تا ص ۱۲۹) ان میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب (بریلوی مکتبہ فکر) کا خط بھی شامل ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''یہ کتاب (دمغ الباطل) اپنے موضوع پر ایک دائرۃ المعارف ہے......(اس کا) مقدمہ آپ کے علم وفضل پر دال ہے......(ص ۱۲۸)......میاں منظور مرحوم نے بھی ''نماز مسنون کلاں'' پر تقریظ لکھی ہے۔ (دیکھئے نماز مسنون کلاں ص ۷)

مفسر قرآنؒ اپنے مسلک پر جس قدر متصلب تھے، شاید ہی کوئی ہو۔ انہوں نے ہمارے لیے اس باب میں بہت سے راہنما اصول چھوڑے ہیں۔ وہ اہل علم کی قدر کرتے تھے، چاہے وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ جہاں دیگر مسالک کے غلط نظریات وافکار کی برملا تردید فرماتے تھے، وہاں ان کی صحیح باتوں کو ماننے سے ابا نہیں فرماتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات میں بہت سے غیر مقلد علماء کا ذکر کرتے ہوئے مبنی براحترام انداز اختیار کیا ہے۔ مثلاً

''فقہ کی معتبر ترین کتاب ہدایہ......سید نذیر حسین دہلویؒ اہل حدیث بزرگ ہوئے ہیں، وہ بڑے شوق سے اپنے مدرسہ میں یہ کتاب پڑھایا کرتے تھے۔'' (خطبات سواتی ج ۴ ص ۱۸۴)

''دادی اور نانی سے بھی نکاح حرام ہے، اس میں کسی مسلک والے کا اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں غلطی مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ سے ہوئی جو اہل حدیث بزرگ تھے انہوں نے ایک موقع پر اپنے اخبار میں شائع کر دیا تھا کہ نانی کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ (خطبات سواتی ج ۴ ص ۱۹۱)......پھر جب علماء نے اس پر گرفت کی تو انہوں نے توبہ کر لی جس کا ذکر ان کے اپنے فتویٰ میں موجود ہے، ہم مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کی قدر کرتے ہیں اور ان کو اچھائی سے یاد کرتے ہیں کہ انہوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے رجوع کر لیا۔'' (خطبات سواتی ج ۴ ص ۲۰۳)

''غیر مقلدین میں بھی بڑے سنجیدہ اور قابل علماء ہوئے ہیں۔ ان میں سید نذیر حسین دہلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا میر ابراہیم سیالکوٹیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ اور آپ کے شہر (گوجرانوالہ) کے مولانا محمد اسماعیلؒ قابل ذکر ہستیاں ہیں جنہوں نے ہمیشہ انصاف کا دامن تھامے رکھا اور کبھی کسی پر ناجائز اعتراض نہیں کیا اور نہ فروعات کے معاملہ میں کسی کو گمراہ یا کافر کہا ہے۔ یہ حضرات دوسرے مسالک کے علماء کا احترام کرتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں بھی پڑھتے رہے ہیں......(خطبات سواتی ج ۴ ص ۱۸۹)

''مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کا ترجمہ بھی ٹھیک ہے تاہم خود اہل حدیث علماء نے تسلیم کیا ہے کہ ان کی تفسیر میں بعض غلطیاں موجود ہیں۔'' (تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن ج ۱ ص ۷۷)

''ہم تو تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں گرفتار تھے، لیکن مولانا چراغ مرحوم بھی ان دنوں مودودی تحفظ کی تحریک

میں گرفتار تھے۔ان سے جیل میں مودودی کے غلط نظریات کے بارہ میں میری گفتگو بھی ہوئی، لیکن وہ غصہ کھا گئے اور فرمایا: آئندہ میرے ساتھ اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔ ویسے وہ بڑے بااخلاق آدمی تھے، میں نے ان سے کہا کہ مجھے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' پڑھادیں تو انہوں نے انکار کر دیا۔جیل میں ان کی قبر (یعنی جگہ) اور میری ساتھ ساتھ تھی۔ وہ نماز بھی پڑھا دیتے تھے اور کھانا وغیرہ بھی تقسیم کر دیتے تھے۔'' (مفسر قرآن نمبر ص ۱۴۴)

''میں نے ابھی آپ کے سامنے ''رحمۃ للعالمین'' کے مصنف علامہ سلیمان منصور پوری کا ذکر کیا ہے۔ یہ صاحب مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث اور غیر مقلد تھے، مگر نہایت منصف مزاج اور تعصب سے پاک تھے۔ اکثر غیر مقلد حضرات تو بہت تجاوز کرتے ہیں، ائمہ احناف کو برا بھلا کہتے ہیں اور تقلید ائمہ کو شرک قرار دیتے ہیں، مگر علامہ منصور پوری نہایت صالح آدمی تھے جنہوں نے نہایت عمدہ سیرت لکھی ہے......

......اس موقع پر مولوی غلام رسول صاحب کا ذکر بے محل نہ ہوگا آپ بھی اہل حدیث تھے مگر نیک صالح اور غیر متعصب آدمی تھے......مولوی غلام رسول منصف مزاج صحیح عالم دین تھے ان کا وعظ اتنا پر اثر ہوتا تھا کہ ہندو اور سکھ بھی اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتے تھے......مولوی غلام رسول صاحب غیر مقلد ہونے کے باوجود رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے انہوں نے اس موضوع پر فارسی زبان میں رسالہ (رسالہ تراویح) بھی لکھا ہے جو دو تین مرتبہ شائع ہوا اس کا اردو ترجمہ (ینابیع کے نام سے) ہمارے شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب نے کیا اور ہمارے ادارے نے شائع کیا۔'' (خطبات سواتی ج ۵ ص ۲۴۷)

......علامہ محمد سلیمان منصور پوری کا ذکر کیا تھا تین جلدوں میں ان کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کمال درجے کی تصنیف ہے جس کو محنت شاقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ (خطبات سواتی ج ۵ ص ۲۶۴)

حضرت والد محترمؒ نے اپنی کتاب ''الاکابر'' میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے متعلق لکھا ہے کہ

''جس کی لازوال تقریر بے مثال، مطالعہ کا شائق، سیاست کا شہسوار، مفکر عالی مرتبت، بقول شورش کاشمیری (مرحوم) کہ اپنے دور میں ایشیا کا سب سے بڑا مسلمان، روایتی طور پر نہ مقلد نہ غیر مقلد، بلکہ اپنی ذہنی اور عقلی تفوق کی بنا پر مجتہدانہ شان کا مالک، جو فرائض میں رفع یدین نہ کرتا تھا اور نوافل میں کرتا تھا۔'' (الاکابر ص ۲۴۴)

مولانا ابوالکلام آزاد داڑھی کٹواتے تھے، اور آزاد ذہن کے مالک تھے۔ بایں ہمہ مفسر قرآنؒ نے ان کے رسالہ ''افسانہ ہجر و وصال'' پر شاندار مقدمہ لکھا ہے اور ان کی کتاب ''مبادئ تاریخ الفلسفۃ'' کو اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے۔ مفسر قرآنؒ کی تفسیر ''معالم العرفان فی دروس القرآن''، ''دروس الحدیث''، ''خطبات سواتی'' اور دیگر کتب کا مطالعہ کیا جائے تو اکابر علماء دیوبند کی طرز اور روش کے کئی زاویے وا ہوتے ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ دیوبندیت ایک بحر بیکراں کا نام ہے۔ یہ محدودیت اور سطحیت کا نام نہیں ہے۔ دیوبندیت وہ ہے جو اپنا اثر دوسروں پر چھوڑتی ہے، دوسروں سے مرعوب نہیں ہوتی۔

مولانا وقار احمد*

مذہبی اختلافات اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا طرز عمل

بانی دارالعلوم دیوبند الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام الزماں شاہ ولی اللہ دہلوی کے علمی وعملی وارث تھے۔ مسلمانان برصغیر کی تاریخ میں وہ ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار مکمل طور پر ختم ہوگیا، اس وقت مسلمانوں کو اپنی بقا اور تشخص کو باقی رکھنے میں کئی طرح کے مسائل کا سامنا تھا۔ مولانا نانوتوی ان حالات میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے میدان عمل میں بڑھے اور مسلمانوں کے دین وعقیدہ اور تہذیب وثقافت کو محفوظ بنانے میں بھرپور قائدانہ کردار ادا کیا۔ مولانا نانوتوی حساس اور دردمند دل رکھنے والے مفکر عالم تھے، چنانچہ آپ نے اہم ملی مسائل کے حل کے لیے بنیادی نوعیت کے اقدامات کیے۔

اس زمانہ میں مسلمانان برصغیر کو درپیش دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ آپس کے اختلافات اور جھگڑے تھے جن میں مسلمان حد اعتدال سے آگے بڑھے ہوئے تھے، بلکہ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کی تکفیر کے درپے تھے۔ مولانا نانوتوی کے شاگرد اور جانشین شیخ الہند محمود حسن دیوبندی نے مسلمانوں کی تباہی کے دو اسباب میں سے دوسرا سبب آپس کے اختلافات اور جھگڑوں کو ہی قرار دیا ہے۔ مولانا نانوتوی نے اس مسئلہ میں مسلمانان ہند کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے انہیں صبر اور برداشت کا درس دیا اور اہل علم کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ چھوڑا۔

مولانا اختلافی مسائل میں جنگ وجدل کو ہمیشہ ناپسند کرتے تھے۔ اختلافی مسائل میں آپ کی تمام تر تعلیم اظہار رائے کی آزادی کے ساتھ ساتھ برداشت اور حسن خلق کی تھی۔ لاحاصل مباحث میں الجھنے کو مولانا ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں اسی طرح کے مسائل پر اپنے قلبی جذبات اور رنج کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

> ''اس زمانہ میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے۔ ہاں بالعموم ابنائے روزگار میں فہم وانصاف ہوتا تو یہ فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلاف اٹھ جاتے مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعداء ہیں کہ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے اور یہ عداوت باہمی موجب تفریق دگر ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا اور بے سمجھے دوسروں کی رسم وراہ کو غلط سمجھتا ہے۔'' (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۹)

*فاضل جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔ لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج، خان پور، ہری پور

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا نانوتوی کے نزدیک اختلاف سے گریز اور اتحاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آدمی اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو دبا کر بیٹھ جائے، بلکہ ان کی عبارت سے یہ سمجھ آتا ہے کہ اختلاف کو موجب عداوت نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوسروں کی بات کو سنا جائے اور بحث وتمحیص کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

مسلمانوں کے باہمی اختلافات پر مناظرہ وجدل کا بازار گرم کرنے کو مولانا فضول اور لغو فعل سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''آپ کا خط ملا، دیکھ کر رنج ہوا۔ کیا خدا کی قدرت ہے کہ آج کل جس طرف سے صدا آتی ہے، یہی آتی ہے کہ وہاں مسلمانوں میں اختلاف ہے، وہاں نزاع ہے۔ کہیں سے اتفاق کی خبریں نہیں آتیں۔ ہاں کفار کے جتنے افسانے سنے جاتے ہیں کہ یوں اتفاق ہے، اس طرح اتحاد ہے۔ بجز انا للہ وانا الیہ راجعون کے اور کیا کہیے۔ آپ کی خوشنودی خاطر منظور ہے، اس لیے جواب لکھتا ہوں، ورنہ ایسے جھگڑوں میں دخل دینا محض فضول سمجھتا ہوں۔'' (''الامام محمد قاسم نانوتوی: حیات، افکار، خدمات'' ص:۲۲۴، ۲۲۵ بحوالہ ''تذکرہ و سوانح الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی''، تالیف: مولانا عبدالقیوم حقانی}

فروعی مسائل میں مولانا کا مسلک:

علماء امت میں عہد صحابہ سے ہی فطری تقاضے کے تحت اجتہادی مسائل میں اختلافات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور آج تک قائم ہے۔ مگر دور عروج میں علماء محققین نے اس طرح کے مسائل میں کبھی بھی فتویٰ بازی، توہین وتحقیر اور الزام تراشی کی روش اختیار نہیں کی۔ دور زوال میں اہل علم نے اسلاف کے طرز عمل کو چھوڑتے ہوئے ان مسائل پر محاذ قائم کیے اور باقاعدہ جماعتیں بنا کر ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے۔ مولانا نانوتوی نے مسلمانوں کو اس طرح کے محاذوں سے روک کر دوبارہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمانوں میں چرچا کر کے افتراق وشقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فطرتاً کارِہ تھے اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اسی طرح فرعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفاً عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے، ان کے متعلق آپ کا خیال تھا، اور کتنا پاکیزہ خیال تھا، اسی قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ ''طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں'' اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ ''اگر ایک طرف ہو رہیے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے گا'' آگے ارقام فرماتے ہیں ''اس لیے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔'' (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۹)

مولانا نانوتوی عموماً مسلمانوں کے اختلافی مسائل میں الجھنے سے گریز کرتے، مگر کبھی بامر مجبوری اس قسم کے کسی

موضوع پر قلم اٹھانا بھی پڑ جاتا تو اندازِ تحریر ایسا رکھتے کہ جس سے باہمی رواداری کو فروغ ملے۔ باوجود نقطہ نظر کے مختلف ہونے کے آپس میں عدوات وشقاوت کا راستہ نہ نکل پائے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی رقم طراز ہیں:

''آپ کا ایک طرزِ عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموماً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ان پر بمشکل قلم اٹھاتے تھے۔ پوچھنے اور دریافت کرنے پر، کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطہ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا، اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالالتزام اسی قسم کے الفاظ [طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں] فرماتے چلے گئے ہیں۔'' (سوانح قاسمی ج۲ص۳۹)

مولانا نانوتوی فروعی مسائل میں مسلک اعتدال پر قائم تھے اور ان مسائل کی وجہ سے کسی کی تحقیر وتنقیص کو درست نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی آپ کے معروف شاگرد مولانا منصور علی خان کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''عمل ان کا حنفی تھا، مگر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے اور حضرت امام اعظم اور حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور حضرت مجدد الف ثانی کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے علوم کو سب بزرگان دین کے علوم سے اعلیٰ وافضل بتلاتے تھے۔'' (سوانح قاسمی ج۲ص۳۷)

فروعی مسائل میں مولانا نانوتویؒ کے اسلوب ومزاج پر بحث کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ رائے میں اختلاف کی آزادی کے فطری حق کو محفوظ کرتے ہوئے اہل علم کو مذکورہ بالا نوعیت کے مسائل میں ایک ایسے اسلم واحکم طریقہ کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہے جس کی اگر پابندی کی جائے تو ایک بہترین شائستہ باادب ماحول نزاعی مسائل کے سلسلہ میں پیدا ہوسکتا ہے۔'' (سوانح قاسمی ج۲ص۵۶)

فروعی اعتقادی مسائل میں انداز بحث:

مسلمانوں کے ہاں وہ مسائل جن کا کسی نہ کسی صورت کچھ اعتقادیات سے بھی تعلق ہے، انہی کی بنیاد پر سب سے زیادہ جماعتیں اور نعرے وجود میں آئے ہیں۔ عموماً اسی قسم کے مسائل پر مختلف لوگوں کو اہل سنت میں داخل اور خارج کیا جاتا رہا۔ مولانا نانوتوی نے ان مسائل میں بھی جو کہ اعتقادیات میں درجہ دوم کی حیثیت رکھتے ہیں، راہ اعتدال پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی۔ انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ حیات انبیاء کا بھی ہے۔ مولانا نانوتوی نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام ''آب حیات'' لکھی اور اپنے پیر ومرشد جناب حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے اس کی تصدیق بھی کروائی۔ اسی کے حوالے سے اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''زیادہ کیا عرض کروں! ہاں اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ یہی ہے اور میں جانتا ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی رہے گا، مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا، نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں نہ منکروں سے دست وگریباں ہوتا ہوں۔ خود کسی سے کہتا نہیں پھرتا، کوئی پوچھتا ہے اور اندیشہ فساد نہیں ہوتا تو اظہار میں

دریغ بھی نہیں کرتا۔ آپ بھی اس امر کو ملحوظ رکھیں تو بہتر ہے۔'' (لطائف قاسمیہ ص ۵)

مخالف معاصرین کا احترام:

آج ہمارے ہاں اکثر یہ مرض پایا جاتا ہے کہ مخالف چاہے جتنا بڑا عالم اور متقی ہو، ہم اس کو کسی بھی قسم کی اہمیت اور عزت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے، بلکہ ایسے مواقع پر بنیادی انسانی اخلاقیات کو بھی ترک کر دیتے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ مولانا اپنے ایک معاصر بزرگ مولانا شاہ عبدالسلام ہسوی (جن کے ساتھ مولانا کو دیہات میں نماز جمعہ کے حوالے سے اختلاف تھا) کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجمع البحرین شریعت وطریقت، مخدوم ومطاع خاص وعام جناب مخدومنا مولانا سید عبدالسلام صاحب دام برکاتہ۔'' (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۴۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد وضاحت کرتے ہیں کہ مولانا نانوتوی جن کو ان القابات کے ساتھ یاد فرما رہے ہیں، یہ کوئی غیر معروف بزرگ تھے۔ (ملاحظہ ہو سوانح قاسمی ج ۲ ص ۴۰) اس سے مولانا نانوتوی کی اخلاقی عظمت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

مدرسہ کی نئی عمارت کی تعمیر کے موقع پر جب حاجی محمد عابد صاحب کے ساتھ اختلاف ہو گیا تو کس عمدہ طریقہ سے ان کو منا کر لائے۔

''ارواح ثلاثہ میں حاجی عابد صاحب مرحوم کے اختلافی نقطۂ نظر کو بھی واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ جلسہ تقسیم انعام میں سیدنا الامام الکبیر نے جب سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے حاضرین جلسہ کو دعوت دی تو حاجی صاحب تلملا اٹھے اور غصہ میں چھتہ کی مسجد میں جا کر بیٹھ گئے۔ سیدنا الامام الکبیر مجمع کے ساتھ مدرسہ کی زمین کی طرف چل پڑے، مجمع آگے بڑھ گیا اور خود چھتہ کی مسجد میں پہنچ کر حاجی صاحب سے منت سماجت کی جس پر وہ رو پڑے۔ دونوں بغل گیر ہوئے صفائی ہو گئی۔ ان کو ساتھ لے کر سیدنا الامام الکبیر بھی مجمع میں تشریف لائے۔ دلچسپ لطیفہ ارواح ثلاثہ کی روایت کا یہ ہے کہ بایں ہمہ کشاکشی مدرسہ کی یہ زمین حاجی عابد صاحب مرحوم ہی کے نام خریدی گئی تھی، لکھا ہے کہ ''بیع نامہ'' ان ہی کے نام لکھوایا گیا تھا۔ اسی میں یہ بھی ہے ۴ گز پہلی دفعہ زمین کا یہ قطعہ خریدا گیا تھا۔'' (حاشیہ سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۲۶)

سرسید احمد خان کی طرف سے اپنے مذہبی وتفسیری اصولوں کی وضاحت پر مبنی ایک تحریر نقد وتبصرہ کے لیے معاصر اہل علم کو بھیجی گئی تو مولانا محمد قاسم نانوتوی نے پیر جی محمد عارف صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں ان پر مفصل تبصرہ کیا۔ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے۔ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کر ان کا

شا کی اور ان کی طرف سے رنجیدۂ خاطر ہوں۔'' (تصفیۃ العقائد ص ۲۶)

خط کے آخر میں مولانا نانوتوی نے لکھا کہ:

''دیکھیے، سید صاحب راضی ہوتے ہیں یا ناخوش ہو کر در پے تردید قلم اٹھاتے ہیں، مگر میں نے بھی ٹھان رکھی ہے کہ ایسی جھگڑے میں پڑ کر اپنی اوقات خراب نہ کیجیے۔ ہاں، اگر آثار انصاف پرستی جناب سید صاحب کی طرف سے نمایاں ہوئے اور بحکم امرھم شوریٰ بینھم اپنے خیالات سابقہ وحال میں مجھ سے بھی مشورہ کریں گے تو ان شاءاللہ حسب ارشاد المستشار موتمن مشورہ خیر سے دریغ نہ کروں گا، مگر جب اپنی حیثیت اور ان کی وجاہت پر غور کرتا ہوں تو یہ خیال ایک آرزوئے خام نظر آتا ہے اور خود مجھ کو اپنے اس جنوں پر ہنسی آتی ہے۔ خیر ہر چہ بادا باد، اب تو آپ کی خدمت میں اس مسودہ ہی کو ارسال کرتا ہوں۔ بر بنظر مصلحت چند در چند یہ گذارش ہے کہ آپ بہت جلد ان اوراق کی نقل کرا کر مقابلہ کر کے نقل کو جناب سید صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیں اور اس اصل کو بجنسہ بہت جلد میرے پاس واپس بھیج دیں اور میری طرف سے بعد سلام یہ گذارش کر بھیجیں کہ اگر اثنائے تحریر میں کوئی کلمہ مخالف طبع بوجہ جہل وغفلت مجھ سے سرزد ہو گیا تو معاف فرما دیں کہ ہم قصباتی [یعنی دیہاتی لوگ] انداز گفتگو سے خوب واقف نہیں۔'' (تصفیۃ العقائد ص ۲۷)

اس کے بعد سر سید احمد خان کے نام براہ راست خط میں ان سے یوں ادب واحترام سے مخاطب ہوتے ہیں:

''بعالی خدمت جناب سید احمد خان صاحب عافاہ اللہ وایای فی الدنیا والآخرۃ

کمترین ہیچ مدان محمد قاسم بعد سلام مسنون گذارش پرداز ہے کہ کل دوشنبہ کے دن دیوبند سے آپ کا وہ عنایت نامہ جس میں تیرہ سوال متعلق زمین وآسمان تھے، اس ہیچ مدان کے پاس پہنچا اور باعث حیرت ہوا۔ وجہ سوال دیر تک سوچی، کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ لتس پر آپ جیسے عاقل وفہیم وواقف کار کلام اللہ وحدیث کی طرف سے ان سوالوں کا آنا اور بھی تعجب انگیز ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کیوں اس جھگڑے میں پڑیے اور اپنی اوقات کو خراب کرائیے۔ پر آپ کی عنایتوں کی مکافات تھوڑی بہت ضروری سمجھ کر جواب سوالات بتفصیل تو نہیں لکھتا، ہاں بتقریب جواب خط کچھ اشارہ کیے جاتا ہوں۔'' (تصفیۃ العقائد ص ۲۸)

مسلکی مخالفین کے ساتھ طرز عمل:

ہندوستان کے خاص ماحول میں بعض اہل علم نے مولانا نانوتویؒ سے شدید نوعیت کے اختلافات کا اظہار کیا، یہاں تک کے بعض حضرات نے فتوائے کفر سے بھی دریغ نہیں کیا اور حضرت کے بیان کردہ مفاہیم کو نہ سمجھتے ہوئے ان پر فتوائے کفر داغ دیا۔ ایسے حضرات کے ساتھ بھی مولانا انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے اور ان کو ان کے فعل میں معذور سمجھتے ہوئے ان کے اس عمل کی تاویل فرماتے تھے۔ جب کبھی مولانا کے تلامذہ میں سے کسی نے ایسے حضرات کے خلاف کوئی سخت جملہ استعمال کیا تو اس کو فوراً روک دیا۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مولانا اشرف علی تھانوی سے نقل کیا ہے: حضرت مولانا محمد قاسمؒ سے کسی نے کہا کہ میرٹھ کے مولانا عبدالسمیع صاحب بیدل بکثرت میلاد پڑھتے اور پڑھواتے ہیں، آپ کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا کہ بھائی، ان کو حب رسول کا بڑا درجہ حاصل ہے۔ دعا کرو مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ (ملفوظ حکیم الامت، ۱۲رمضان ۱۳۴۵ھ)

یہ سوال چونکہ دوسرے ایک عالم کی شخصیت اور اپنی ذات کے تقابل کا تھا، اس لیے اس وقت کسی مسئلہ کی تحقیق کی جاتی تو وہ اپنے نفس کی طرف سے مدافعت اور دوسرے عالم کی شخصیت پر جرح ہوتی۔ اس سے اجتناب فرمایا اور تواضع کا پہلو اختیار کیا۔ اگر صرف مسئلہ پوچھا جاتا کہ مروجہ قسم کی محفل میلاد کا کیا حکم ہے تو وہی فرماتے جو ان کی تحریرات اور فتاویٰ میں مذکور ہے۔'' (مجالس حکیم الامت، تحریر و ترتیب از مفتی محمد شفیع صاحب، ص ۱۲۴)

مولانا تھانوی کے حوالے سے ہی مفتی محمد شفیع صاحب نے مزید درج ذیل تین واقعات بھی نقل کیے ہیں:

ایک مشہور پیر صاحب بازاری عورتوں کو بھی مرید کر لیتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مجلس میں کچھ لوگ ان کو برا کہنے لگے تو حضرتؒ نے بہت خفا ہو کر فرمایا کہ تم نے ان کا عیب تو دیکھ لیا، یہ نہیں دیکھا کہ وہ راتوں کو اللہ کے سامنے عبادت گذاری اور گریہ وزاری کرتے ہیں۔ لوگوں کو خاموش کر دیا اور اشارہ اس بات کی طرف کیا کہ کسی شخص کے اچھے عمل کو اچھا اور برے عمل کو برا کہہ دینا تو دینی حق ہے، لیکن کسی شخص کو برا یا بھلا اس کے مجموعہ اعمال کی بنا پر کہا جا سکتا ہے جس کا عموماً لوگوں کو علم نہیں ہوتا، اس لیے کسی شخص کی ذات کو برا کہنے میں بہت احتیاط چاہیے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے خاص بے تکلف مرید امیر شاہ خان نے ایک مرتبہ فضل رسول صاحب جو اس زمانے کے اہل بدعت میں سے تھے، ان کا نام بگاڑ کر فضل رسول کے بجائے فصل رسول حرف صاد کے ساتھ کہا۔ حضرتؒ نے ناراض ہو کر سختی سے منع فرمایا کہ وہ جیسے بھی کچھ ہوں، تم تو آیت قرآنی و لا تنابزوا بالالقاب کے خلاف کر کے گناہگار ہو ہی گئے۔

ایک معروف و مشہور اہل بدعت عالم جو اکابر دیوبند کی تکفیر کرتے تھے اور ان کے خلاف بہت سے رسائل میں نہایت سخت الفاظ استعمال کرتے تھے، ان کا ذکر آ گیا تو فرمایا: میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان کے متعلق معذب ہونے کا گمان نہیں، کیونکہ ان کی نیت ان سب چیزوں سے ممکن ہے کہ تعظیم رسول ہی کی ہو۔ (مجالس حکیم الامت، تحریر و ترتیب از مفتی محمد شفیع صاحب ص ۱۲۴، ۱۲۵)

غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی رواداری کا رویہ:

یہاں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ مولانا نانوتوی صرف مسلمانوں کے مابین ہی امور اتفاقیہ پر زور نہ دیتے تھے بلکہ آپ غیر مسلموں کے ساتھ بھی رواداری اور بقائے باہمی کے قائل تھے اور اس کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مناظروں میں قصداً کوئی ایسا جملہ نہیں کہا جس سے ہندو عوام کی دل شکنی ہو۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی ج ۲ میں ان مناظروں کی تفصیلی روداد بیان کی ہے اور یہی تاثر ظاہر کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ

ہو سوانح قاسمی ج ۲)

مولانا کے عہد کا ہی یہ واقعہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند جیسی خالص اسلامی درسگاہ میں ہندو لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''۱۲۹۴ھ کی روداد میں اطلاع بھی دی گئی ہے کہ ''یہاں تک کہ بعض بعض ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں۔'' روداد ۱۲۹۴، ''ہندو لڑکے پڑھتے تھے۔'' ظاہر ہے کہ مطلب اس کا یہی ہوسکتا ہے، اور یہی ہے بھی کہ خاص سہولتوں کی وجہ سے دیوبند کے مقامی ہندو باشندے بھی کبھی کبھی فارسی اور حساب وغیرہ کے پڑھنے اور سیکھنے کے لیے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کو مدرسہ کی ان ابتدائی کلاسوں میں شریک کر دیتے تھے جن میں ان مضامین کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس سے کچھ اور ثابت ہوتا ہو یا نہ ثابت ہوتا ہو، لیکن تعلقات کی شگفتگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت کیا ہوسکتا ہے۔'' (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۳۳)

سالانہ روداد میں بھی یہ اعلان کیا گیا کہ ''چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیت مذہب وملت'' اور غیر مسلموں سے چندہ قبول بھی کیا گیا۔ خصوصاً منشی نول کشور کا مدرسہ کی سالانہ رودادوں میں لکھا گیا ہے کہ انہوں نے درسی کتب مدرسہ کو عطیہ کی ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۳۳)

منشی نول کشور کی طرف سے مختلف سالوں میں متعدد کتب مدرسہ کو ہدیتاً وصول ہوئی اور اس کے ساتھ ان کا روزنامہ ''اودھ اخبار'' بھی دارالعلوم میں ہدیۃً آتا تھا۔ اسی طرح راوامر سنگھ کا اخبار ''سفیر بوڈھانہ'' بھی مدرسہ میں ہدیۃً آتا تھا۔ مدرسہ کی روداد میں ان کا نام لے کر شکریہ ادا کیا گیا اور یوں دعا دی گئی ہے: ''اور سب صاحبوں کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعا خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانجات کو دم بدم ترقی عطا فرمائے۔'' (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۱۶)

مولانا نانوتوی کے عہد میں دارالعلوم کو بعض غیر مسلم بھی چندہ دیتے تھے۔ دارالعلوم کی رودادوں میں ان کے نام مذکور ہیں جن میں منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہردواری لال، لالہ بیجناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوا رام سوار کے نام مولانا گیلانیؒ نے ذکر کیے ہیں اور ان کو دوامی چندہ دینے والوں میں شمار کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۱۷)

تبلیغ دین میں مولانا نانوتویؒ کا اسوہ حسنہ

مولانا نانوتویؒ دین کے داعی اور مبلغ تھے۔ عامۃ المسلمین کو دین متین پر قائم رکھنے اور دیگر لوگوں کو دین اسلام کے سمجھانے کے لیے آپ نے مثالی اسوہ چھوڑا ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے گمراہ فرقوں اور لوگوں کو دین کی دعوت دینے اور دین خالص کو ان تک پہنچانے کے لیے مولانا کا اسوہ اہل علم کے لیے مشعل راہ ہے۔ مسلمانوں میں شیعہ سنی کے درمیان لڑائی اور اختلاف ابتدائے عہد سے چلا آ رہا ہے، اس اختلاف نے مسلمانوں کو مختلف مواقع پر سخت نقصان بھی

پہنچایا ہے۔مولانا نانوتوی پر بھی اس اختلاف کا خاص اثر تھا۔اسی سے متاثر ہوکر آپ نے شیعہ سے اختلافی مسائل پر کئی رسائل اور خطوط رقم فرمائے،مگراس کے باوجود آپ نے نہ تو شیعہ سے مقاطعہ کیا اور نہ ہی تبلیغ کے مواقع پر عام مولویوں کے رکھ رکھاؤ اور تکلفات کو کبھی باقی رکھا۔اس حوالے سے مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی میں ایک واقعہ نقل کیا ہے:

''پور قاضی ہی کے شیعوں کے متعلق مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں پور قاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا۔ حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر پور قاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک وفد ان کے سر برآوردوں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہوکر پور قاضی کے شیعوں کو ممنون فرمایا جائے۔خلاف توقع بجائے انکار کے حضرت نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہوسکتا ہوں۔جو شرط پیش کی گئی،اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا،شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں ''جو کچھ عرض کروں،اسے سن لیں۔''

وفد نے اس شرط کو تو منظور کرلیا،مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے'' پہلے مجلس ہوگی،اس میں حلوا بھی تقسیم ہوتا ہے،وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔'' آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے،حلوا جو دیا گیا،اسے بھی لے لیا،جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہوگئیں،تب ماتم کی اسی مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور وصیت ترکت فیکم الثقلین کتاب الله و عترتی (میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں،اللہ کی کتاب اور اپنی اولاد) پر ایک مفصل ومبسوط تقریر فرمائی۔ سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لیے حضرت والا نے فرمایا،علم وعمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔علم کے لیے تو اللہ کی کتاب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت پاک میں نسلی مناسبت کی وجہ سے عمل کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہونی چاہیے۔

الغرض ماتم کی اس مجلس میں اسی اجمال کی تفصیل کچھ ایسے رنگ میں کی گئی،کہ بجائے ماتم کے وہ تبلیغ کی مجلس بن گئی،روایت کے آخر میں مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ اس وعظ کے بعد بہت سے لوگوں نے توبہ کی۔بظاہر اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ شیعی عقائد سے تائب ہوکر لوگ سنی بن گئے۔'' (سوانح قاسمی ج۲ص۶۶،۶۷)

یہ واقعہ جب لوگوں میں پھیلا تو سطحی قسم کے لوگوں نے مولانا کے اس عمل پر اعتراض کیا،تو مولانا گیلانی ہی کے الفاظ میں ان کے جواب میں فرمایا:''اگر میں نے حلوا لیا اور قبول کرلیا تو ان کی مجلس میں کلمہ حق بھی تو پہنچا دیا۔'' (سوانح قاسمی ج۲ص۶۸)

واقعہ کو مکمل تفصیل اور تجزیے کے ساتھ نقل کرنے کے بعد مولانا گیلانیؒ رقم طراز ہیں:

''روایت جس طریقہ سے ہم تک پہنچی ہے، اعتماد کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے اور گو یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن تبلیغی فرائض سے صحیح معنوں میں سبک دوشی کی اثر آفریں اور نتیجہ خیز راہ یہی ہوسکتی ہے، مگر شرط اول اس راہ میں یہی ہے کہ جبہ و دستار کے خود تراشیدہ احترامی وساوس سے دل و دماغ کو پاک کر کے فرض کے حقیقی احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کیا جائے۔'' (سوانح قاسمی ج۲ص ۶۹)

مولانا نانوتوی کے اس طرز عمل کے نتائج کس حد تک موثر ثابت ہوئے۔؟ مولانا کے پوتے قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند سوانح قاسمی کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''لیکن جہاں ان گنگ میکروں نے شیعیت کو اپنے اثر واقتدار سے رواج دیا، وہاں حضرت والا کی تاثیری قوت خود ان گنگ میکروں پر بھی اپنا کام کر گئی۔ ان سادات بارہہ میں سے خانجہاں پور، رتھیڑی، اور منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر تائب ہوئے، اور سنی بنے اور اس قدر گرویدہ اور محبّ بن گئے کہ ان کی دیوبند کی آمد و رفت مثل اہل بیت کی آمد و رفت کے ہوگئی ہے۔ احقر کے یہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام فاطمہ ہے (سلمہا) تو سید نور الحسن صاحب رئیس رتھیڑی اس کے لیے کپڑوں کے جوڑے اور بچگانہ زیور اسی انداز سے بنوا کر لائے، جیسے اپنے خاندان میں کسی قریبی عزیز کے یہاں ولادت ہونے پر یہ چیزیں لائی جاتی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا جاتے وقت اپنے قبیلہ اور عائلہ کو ہدایت فرما کر گئے تھے کہ مشکلات کے وقت مولوی سید محمد نبیہ صاحب رئیس خان جہان پور کی طرف رجوع کریں۔ یہ خاندان بحمد اللہ پکے سنی اور ریاستوں کے باوجود نہایت متدین اور متشرع ہیں۔'' (حاشیہ سوانح قاسمی ج۲ص ۷۲)

مولانا نانوتویؒ کی زندگی کا آخری حصہ ہندووں اور عیسائیوں سے مناظروں میں گزرا، اس ضمن میں آپ کے بعض مناظرے اور اسفار بڑے معرکۃ الآراء ہیں جن کی روداد یں مستقل کتابوں کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر مباحثوں کا انتظام حکومتی مشنری کی طرف سے ہوا جن کے مقاصد میں اہم ترین ہندوستان کی آبادی کو آپس میں دست و گریبان کرانا تھا۔ مگر اس میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شرکت نے ان کو اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی میں اس موضوع پر مستقل بحث کی ہے اور رودادوں سے بطور خاص اس پر استشہاد کیا ہے کہ مولانا نانوتوی نے ان مناظروں میں ہندووں کے ساتھ روئے سخن میں خاص طرز عمل کو اختیار فرمایا جس سے ہندو ان کے قریب ہوگئے۔ ان مناظروں میں مولانا نانوتوی نے تبلیغ کے لیے عمدہ نمونہ پیش کیا۔ مولانا گیلانی نے اس نمونہ کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں۔ ایک موقع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور مجھ سے اگر پوچھتے ہیں، تو چاندا پور میں جو کچھ سیدنا الامام الکبیر نے کہا اور کیا، اگر ایک طرف دین حق کی تبلیغی ذمہ داریوں میں اس سے جاگ پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اگر اہم فکر معقول سے کام لیتے ہوئے آپ کے طریقہ سے چاہیں تو یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بغیر کسی تلخی اور ناگواری کے غیر قوموں کے درمیان بود و باش اختیار کر کے تبلیغ حق کے اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کا حکیمانہ طریقہ کیا ہوسکتا ہے، آپ کے

حکیمانہ طریقہ کار کی تفصیل واقعات وشواہد کی روشنی میں پیش ہو چکی ہے۔اس کو بار بار پڑھیے اور جو نتیجے اس سے حاصل ہو سکتے ہیں، ان کو حاصل کیجیے۔حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی بادشاہی کے زمانے میں ''ہندومی زند شمشیر اسلام'' کا تماشا اگر دیکھا گیا تھا تو شاید یہ اتنا تعجب انگیز نہ تھا،لیکن خدا شناسی کے اسی میلہ میں جب مسلمانوں کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں کالے پادری مولیٰ داد کی طرف سے گندگی اچھالی جا رہی تھی اور سیدنا الامام الکبیر اسی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ اعلان کر رہے تھے: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین بھی ہمارے نزدیک مثل توہین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم موجب کفر وارتداد ہے۔'' (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۴۶۶)

الغرض مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی میں اس کے متعدد نمونے پیش کیے ہیں کہ کس طرح مولانا نانوتوی نے ان مناظروں میں لب ولہجہ اختیار کیا کہ ہندو بجائے دور ہونے کے قریب ہی آئے۔

مبلغین ومناظرین کو ''سوانح قاسمی'' کے اس حصہ کو بطور خاص مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جس میں ان کے مناظروں ومباحثوں پر بحث کی گئی ہے۔مولانا گیلانی نے ڈیڑھ سو سے زائد صفحات پر اس بحث کو نقل کیا ہے اور اس میں موجودہ دور میں تبلیغ کے لیے عمدہ رہنمائی پیش کی ہے۔الحاصل مسلمانوں کو عموماً اور دیوبندی نسبت رکھنے والے احباب کو خصوصاً امام محمد قاسم نانوتوی کی حیات مبارکہ کو توجہ سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ہمیں اپنے رویوں کی اسلاف کے کردار کی روشنی میں اصلاح کرنی چاہیے۔

مولانا قاری محمد طیبؒ

اختلافِ رائے کے آداب

کسی عالم سے فرض کیجیے کہ آپ کسی مسئلے میں مختلف ہو جائیں یا دوسرا عالم آپ سے مختلف ہو جائے تو مسئلے میں اختلاف کرنا تو جائز ہے جب اپنے کو دیانتاً علی التحقیق سمجھے لیکن بے ادبی اور تمسخر کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے کیونکہ بے ادبی اور تمسخر کرنا دین کا نقصان ہے اور اختلاف کرنا محبت سے، یہ عینِ دین ہے۔ دین جائز ہے اور خلافِ دین جائز نہیں۔ اختلافِ رائے کا حق حاصل ہے حتیٰ کہ اگر ذاتی رائے اور مشورہ ہو تو انبیاء علیہم السلام سے بھی آدمی رائے میں مختلف ہو سکتا ہے۔ احکام اور اوامر کا جہاں تک تعلق ہے، اختلاف اور رائے زنی جائز نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''کسی مومن اور مومنہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ جب حکم آ جائے اللہ اور رسول کا تو پھر اس کے سامنے چوں چرا کی جائے۔''

تو جہاں تک احکامِ دین کا تعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ فرما دیں تو تامل بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ قبول نہ کرے۔ لیکن اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں کہ میری ذاتی رائے یہ ہے تو اگر آدمی نہ مانے تو اس پر کوئی الزام و ملامت نہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اختلافِ رائے اگر اہل اللہ اور علما میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن بے ادبی یا تذلیل کسی حالت میں جائز نہ ہوگی اس لیے کہ وہ بہرحال عالمِ دین ہے جس سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس کا مقام و منصب بطور نائب رسول کے ہے، اس کی عظمت واجب ہوگی۔ ہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر عمل کرتے ہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پچاسوں مسئلوں میں ان سے اختلاف کرتے ہیں، مگر ادنیٰ درجے کی بے ادبی قلب میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی نہیں آتی اور جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واجب التعظیم ہیں، ویسے ہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی۔ دونوں آفتاب و ماہتاب ہیں۔ دونوں سے نور اور برکت حاصل ہو رہی ہے۔ کسی طرح جائز نہیں کہ ادنیٰ درجے کی گستاخی دل میں آ جائے۔

گستاخی جہالت کی علامت ہے

گستاخی اور استہزا کرنا جہالت کی بھی علامت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو نصیحت کی اور فرمایا کہ فلاں مقتول زندہ ہو جائے گا اگر بقرہ (گائے) ذبح کر کے اس کا گوشت اس سے چھو دیا جائے تو اس پر بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ: اتتخذنا ھزوا؟ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ اس بات میں کیا تعلق ہے کہ گوشت سے مردے کو

جلا دیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اعوذ بالله ان اکون من الجاهلین۔ ''اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔'' یعنی دل لگی اور تمسخر جاہلوں کا کام ہے۔ عالموں کو مناسب نہیں کہ تمسخر کریں اس لیے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔ تو ایک ہے رائے کا اختلاف اور کسی عالم سے مسلک کا اختلاف اور ایک ہے بے ادبی۔ بے ادبی کسی حالت میں جائز نہیں، اختلاف جائز ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ اور مولانا احمد رضا خانؒ

میں نے مولانا تھانویؒ کو دیکھا کہ مولانا احمد رضا خان صاحب مرحوم سے بہت سی چیزوں میں اختلاف رکھتے تھے۔ قیام، عرس، میلاد وغیرہ مسائل میں اختلاف رہا۔ مگر جب مجلس میں ذکر آتا تو فرماتے، ''مولانا احمد رضا خان صاحب''۔ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھنے والے شخص نے کہیں بغیر ''مولانا'' کے ''احمد رضا خان'' کہہ دیا۔ حضرت نے ڈانٹا اور خفا ہو کر فرمایا، عالم تو ہیں۔ اگر چہ اختلافِ رائے ہے، تم منصب کی بے حرمتی کرتے ہو، یہ کس طرح جائز ہے؟ رائے کا اختلاف اور چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کو ہم خطا پر سمجھتے ہیں اور صحیح نہیں سمجھتے مگر ان کی توہین اور بے ادبی کرنے کا کیا مطلب؟

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مولانا'' نہ کہنے پر برا مانا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اہلِ علم میں سے تھے۔ وہ تو نام بھی کسی کا آتا تو ادب ضروری سمجھتے تھے، چاہے بالکل معاندہی کیوں نہ ہو، مگر ادب کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔

کفر کا فتویٰ لگانے والوں سے مولانا نانوتویؒ کا سلوک

میں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا کہ دہلی میں قیام تھا۔ حضرت کے خدام میں سے چند مخصوص تلامذہ ساتھ تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ، دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن امروہویؒ، حاجی امیر شاہ خان صاحب مرحوم، یہ بھی وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہم جولیوں میں بیٹھ کر فرمایا کہ بھئی لال کنویں کی مسجد کے جو امام ہیں، ان کی قراءت بہت اچھی ہے۔ کل صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھ لیں۔ تو شیخ الہندؒ نے غصے میں آ کر فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی بے غیرت، وہ ہمارے حضرت کی تکفیر کرتا ہے، ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ اور بڑا سخت لہجہ اختیار کیا۔ یہ جملے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کان میں پہنچے۔ اگلے دن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ان سب شاگردوں کو لے کر اسی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کی خاطر پہنچے، اس امام صاحب کے پیچھے جا کر نماز پڑھی، سلام پھیرا۔ چونکہ یہ اجنبی تھے، نمازیوں نے دیکھا کہ ہیں تو علما صورت تو پوچھا کون ہیں؟ معلوم ہوا کہ مولانا محمد قاسمؒ ہیں اور وہ ان کے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور یہ مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ ان کے شاگرد ہیں۔ امام کو سخت حیرت ہوئی کہ میں رات دن ان کو کافر کہتا ہوں اور یہ نماز کے لیے میرے پاس آ گئے۔ امام نے خود بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا کہ حضرت، میں آپ کی تکفیر کرتا تھا، میں آج شرمندہ ہوں۔ آپ نے میرے پیچھے نماز پڑھی، حالانکہ میں آپ کو کافر کہتا رہا۔ حضرت نے فرمایا، کوئی بات نہیں، میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی قدر

ہے اور زیادہ عزت دل میں بڑھ گئی ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ آپ کو جو روایت پہنچی کہ میں توہین رسول کرتا ہوں تو آپ کی غیرتِ ایمانی کا یہی تقاضا تھا۔ ہاں البتہ شکایت اس کی ہے کہ روایت کی تحقیق کرنی چاہیے تھی۔ فرمایا کہ میرے دل میں آپ کی غیرتِ ایمانی کی قدر ہے، ہاں شکایت اس لیے ہے کہ ایک بار تحقیق کر لیتے کہ خبر صحیح ہے یا غلط۔ تو میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ یہ خبر غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجے میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرے اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں: **اشھد ان لا الٰہ الا اللہ** ۔ اب امام بے چارہ قدموں میں گر پڑا، بچھا جاتا ہے۔

تو بات صرف یہ تھی کہ ان حضرات کے دلوں میں تواضع للہ اور ادب مع اللہ اس درجہ رچا ہوا تھا کہ نفسانیت کا شائبہ نہ رہا تھا۔ استہزا اور تمسخر تو بجائے خود غلط ہے، اپنے معاندوں کی بھی بے قدری نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح محمل پر اتار کر یہ کہتے کہ جو ہمیں کافر کہتے ہیں، یہ ان کی قوتِ ایمانی کی دلیل ہے۔ البتہ یہ تحقیق کر لینی چاہیے کہ واقعہ میں ہم توہین رسول کرتے ہیں؟ ہم معاذ اللہ دشمنانِ رسول ہیں یا دوستانِ رسول؟ اس کی تحقیق ان کو واجب تھی، بلا تحقیق حکم نہیں لگانا چاہیے۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور تادّب دین کی بنیاد ہے جس کو عارف رومی نے کہا ہے:

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم گشت از فضلِ رب

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں اس کا کوئی مقام نہیں جو گستاخ اور بے ادب ہے۔ اس زمانے میں چونکہ بے ادبی اور گستاخی کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں، فرقہ بندی زیادہ ہو گئی ہے، ایک دوسرے کے حق میں زبانِ طعن و ملامت اور زبانِ تضحیک کھولنا بہت معمولی بات بن گئی ہے، اس واسطے میں نے یہ سمع خراشی آپ لوگوں کی کی کہ اگر کسی عالم سے اختلاف آ بھی جائے تو اگر آپ خود عالم ہیں تب آپ پر فرض ہے کہ دوسرے کا احترام کریں اور اگر آپ متّبع ہیں اور وہ اقتدا کر رہا ہے دوسرے عالم کی، تو عمل تو اپنے مقتدا و متبوع کی تحقیق پر کریں مگر دوسرے کے ساتھ تمسخُر کرنا آپ کے حق میں بالکل جائز نہیں بلکہ آپ یہ تاویل کریں کہ اس کے ہاتھ میں بھی حجت ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو وہ کہتا ہے، عند اللہ وہ بھی مقبول ہے۔ ہر مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور اس پر عتاب اور عذاب بھیجنے لگیں تو یہ خدا کا مقابلہ ہوگا۔ حق تعالیٰ کے ہاں اجتہادی خطا پر بھی ملامت نہیں۔ آج کل فروعی اختلافات کی وجہ سے تمسخُر بڑھ گیا ہے۔ یہ دین کے منافی ہے۔ بے شک آدمی عمل اپنی تحقیق پر کرے اور دوسرے کو معذور رکھے۔ ادب اور احترام میں کمی نہ آنے دے، یہ دانائی کی بات ہے۔

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرزِ عمل

ائمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے تھے لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے تو امام

صاحب کا مسلک ہے کہ نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ سے کہنا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں زور سے کہنا افضل واولیٰ ہے۔ مگر جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا، مجھے حیا آتی ہے اس صاحبِ مزار سے کہ اس کے قریب آ کر اس کے اجتہاد کے خلاف کروں۔ یہ ادب اور تادّب ہے یعنی جس حد تک گنجائش ہو۔ ایک تو حرام وحلال اور جائز وناجائز کا فرق ہے کہ ایک کے ہاں جائز، دوسرے کے ہاں حرام۔ اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتے مگر جہاں اولیٰ وغیر اولیٰ کا فرق ہے، وہاں ادب ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے افضل پر عمل ترک اور غیر افضل پر عمل کیا امام صاحب کی رعایت سے، حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں مگر یہ ادب کا عالم تھا اور یہ ادب اور تادّب کی بات تھی۔

مسائل اور جذباتِ نفسانی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی اختلافات تھے۔ ائمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل میں جو اختلافات ہیں، وہ صحابہؓ میں بھی تھے لیکن باوجود اس کے اس ادب واحترام اور عظمت وتعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی۔ اس لیے ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ مسائل کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات کو نکالنے میں مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔ اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہؓ لڑتے کیونکہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا۔ اس کے بعد ائمہ مجتہدین کے ہاں لاٹھی چلتی، پھر علماء ربانیین آپس میں لڑتے۔ مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔ یہ دراصل اختلافِ رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات نکالتے ہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے۔ جب مسلمان کے پاس یہ چیزیں نہ رہیں، نہ جائیداد، نہ مکان، نہ سلطنت تو سوچا کہ بھئی دین کو لڑنے کا ذریعہ بناؤ اور مسائل کو آڑ بناؤ۔ تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں۔ اختلاف کرنے کی گنجائش ہے مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے فروعی اختلاف پر عیسائی جج کا طنز

ایک عرصہ پہلے ایک یورپین عیسائی کلکٹر تھا۔ اس کے زمانے میں احناف اور اہلِ حدیث میں لڑائی ہوئی ''آمین'' کہنے پر۔ حنفیوں نے آہستہ پڑھی، اہلِ حدیث نے زور سے کہی تو لاٹھی چل گئی۔ بہت سے لوگوں کا سر ٹوٹ گیا۔ مقدمہ کلکٹر کے ہاں گیا۔ فریقین کے وکلا نے کلکٹر کو مقدمہ سمجھایا تو اس نے کہا کہ بھئی ''آمین'' کوئی جائیداد ہے یا بلڈنگ ہے کہ اس پر لڑتے ہیں؟ وکلا نے کہا، نہیں۔ ''آمین'' ایک قول ہے جو زبان سے نکالتے ہیں۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث آئی ہے کہ ''آمین'' زور سے کہو، دوسرے کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے کہ آہستہ پڑھو۔ اس نے کہا، جس کو جو حدیث معلوم ہے، اس پر عمل کرے، لڑتے کیوں ہو؟ اور اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اور سمجھ میں آنے والی بات بھی نہ تھی۔ بہرحال، اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا کہ میں مقدمہ کی مثل دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں ''آمین'' کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ''آمین بالجہر'' یعنی زور سے پڑھنا۔ ایک ''آمین

بالسر'' یعنی آہستہ پڑھنا۔ اور ایک ''آمین بالشر'' یعنی جھگڑنے لڑنے کے لیے پڑھنا، لہٰذا میں دونوں کو سزا دیتا ہوں۔ گویا اس نے بتایا کہ اختلافی مسائل نہ لڑائی کے لیے ہوتے ہیں نہ باہمی نزاع کے لیے۔ وہ دیانتاً حجت سے رائے قائم کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ تو یہ ہمارے قلوب کا فساد ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات نکالنے کی آڑ بنالیا ہے اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا ڈالنے اور گروہ بندیوں کے لیے رہ گیا ہے۔

اختلافی مسائل میں راہِ صواب

اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو، مگر لڑنا کیوں ہے؟ وہ اپنی قبر میں جائے گا اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے۔ کیونکر اس سے مسخر گی کرو اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزا کرے۔ آپ نے بیان کیا، امر بالمعروف کا حق ادا ہو گیا۔ اب اگر کوئی بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اگر اس کے پاس کوئی حجت ہے تو وہ عنداللہ جواب دے گا۔ تم ذمہ دار نہیں ہو نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے۔ اور پھر دین منوانا (یعنی اصول دین پر کسی کو مجبور کرنا) بھی ضروری نہیں، چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا منوانا ضروری ہو۔ بہرحال آج کل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس سے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

ایک شخص اجتہادی رائے کے بارے میں اتنا جمود کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے، یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں، فساد ہے۔ تو ایک چیز چلانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان۔ ماننے والے مانیں گے، تم ذمہ دار اور خدائی ٹھیکیدار نہیں ہو۔ ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چباتے رہنا، اس سے خواہ مخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آ گئی۔ ہاں ایک ہیں دین کے اصول۔ نماز فرض ہے، روزہ فرض ہے، زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ آپ زور سے کہہ سکتے ہیں لیکن فروعی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں؟ تو یہ تبلیغی چیزیں ہی نہیں، آپ زور کہاں سے دیتے ہیں؟ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذہب ہی نہیں۔ آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو، تم شافعی بن جاؤ، حنفی مت بنو۔ یہ ترجیحی مذاہب ہیں، تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا افضل ہے اور فلاں عمل نہیں۔ تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذہب مت بناؤ کہ اگر کسی عالم کی کوئی جزئی تحقیق ہو، خواہ مخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔

بہرحال آج کل یہ چیز پیدا ہو گئی ہے۔ بہت گستاخی، جسارت اور جرات ہو رہی ہے۔ اس واسطے یہ چند باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے عمل کی۔ اللھم افتح لنا بالخیر واختم لنا بالخیر۔

(خطبات حکیم الاسلام، جلد دوم)

انتخاب وترتیب: محمد عمار خان ناصر

اختلاف کے حدود وآداب، رواداری اور احترام

اکابر اہل علم کے طرز عمل کے چند نمونے

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے سرسید سے متعلق ایک فتویٰ آپ کے دستخطوں کے لیے پیش کیا۔ مولانا نے ان لوگوں سے کہا کہ بھائی! میں پہلے تحقیقات کرلوں، آیا وہ کافر ہیں بھی یا نہیں۔ چنانچہ تحقیقات کی غرض سے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سرسید کو تین سوالات لکھ کر بھیجے: (۲) خدا پر آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ (۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ (۳) قیامت کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

سرسید احمد خاں نے ان سوالات کے جواب میں لکھا: (۱) خدا تعالیٰ مالک ازلی اور صانع تمام کائنات ہے۔ (۲) بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر (۳) قیامت برحق ہے۔

جب سرسید کا یہ جواب مولانا قاسم نانوتوی کے پاس پہنچا تو آپ نے ان لوگوں سے جو فتویٰ پر دستخط کرانے آئے تھے، فرمایا ''تم اس شخص کے خلاف دستخط کروانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے؟'' (عبید اللہ (م)، مقالات یوم شبلی، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۶۸، ۶۹)

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے نام خط سے اقتباس:

''آپ نے انگریزوں کی نسبت اعتراض فرمایا ہے کہ ابتدائے سلطنت سے انگریزوں کا مطمح نظر حرارت ایمانی کا قلوب سے سلب کرنا تھا جو انھوں نے متعدد اور مختلف طریقوں سے اپنے مقصود کے حاصل کرنے کی تدبیریں کیں اور اس میں کامیاب ہو گئے اور من جملہ ان تدبیروں کے علی گڑھ کالج کی بنا بھی ہے کہ جس کے بانی نے حب مال وجاہ کی آڑ میں ترقی دنیا کا سبز باغ دکھلا کر مسلمانوں کے دل سے وہ تنفر اور توحش عن النصاریٰ بالکل نکال دیا جو اسلام کے لیے روح رواں تھا۔ اس کے متعلق مجھ کو اسی قدر عرض کرنا ہے کہ آپ غور فرماویں کہ یہ قصور کس کا ہے؟ نصرانیوں کا قصور ہے یا آپ کا؟...... بانی علی گڑھ کی نیت کا علم خدا ہی کو ہے کہ اس نے اس کالج کی کی بنا کس نیت پر ڈالی۔ اگر اس کی نیت یہ

ہے کہ اکی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں سے حرارت وغیرت ایمان سلب ہو جاوے تو اس کا محاسبہ خدا تعالیٰ شانہ کے یہاں ہے اور اگر اس کی نیت یہ نہیں تھی، بلکہ اس کی نیت محض دنیاوی ترقی تھی جس طرح میں گزشتہ تقریر میں عرض کر آیا ہوں تو پھر فرمایئے کہ یہ ہمارا ظن کیا ظن فاسد نہیں ہوگا؟'' (مطبوعہ ماہنامہ ''الصیانہ'' لاہور، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۹، ۲۰)

مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ

ایک مرتبہ کوئی صاحب سرسید کے بارے میں تذکرہ کر رہے تھے کہ اس نے شریعت محمدی میں بڑا تنزل اور اختلاف پیدا کیا ہے۔ ہزاروں حملے شریعت پر کیے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے یہ باتیں سن کر کہا کہ ''ان کی ظاہری تقریر کو نہ دیکھو، ان کے قلب کو دیکھو کہ کیسا ہے''۔

مولانا محمد علی مونگیری خلیفہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت قبلہ حجرہ میں بیٹھے تھے کہ چند مولوی صاحبان صحن میں لڑ رہے تھے کہ سرسید روایات صحیحہ کا انکار کرتا ہے، تواتر کا انکار کرتا ہے، کافر ہے۔ حضرت قبلہ حجرہ سے نکلے، مسجد میں تشریف لائے اور مولانا مونگیری سے فرمایا ''یہ لوگ اس بے چارے کو کافر بناتے ہیں، مگر اس کے قلب کو دیکھو کہ کیسا ہے۔'' (''کمالات رحمانی'' از شاہ تجمل حسین بہاری، بحوالہ صدق جدید، ۵/ مئی ۱۹۶۱ء)

مولانا اشرف علی تھانویؒ

سرسید احمد خان سے متعلق خیالات:

''سرسید کا عقیدہ توحید اور رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا، بلا وسوسہ اور نہایت پختہ تھا جیسا کہ ان کی بعض تصانیف سے مجھ کو ظاہر ہوا اور قرآن وحدیث کی جو توجیہات انھوں نے کیں، ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ گو اس کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ غلط تھا، اس لیے میں ان کو نادان دوست کہتا ہوں۔'' (اشرف السوانح از خواجہ عزیز الحسن مجذوب، جلد اول، ص ۲۱۵)

''سید احمد بڑے حوصلے کا آدمی تھا، مگر انھوں نے خواہ مخواہ دین میں ٹانگ اڑا کر اپنے آپ کو بدنام کیا، ورنہ ان کو تو لوگ دنیا کا تو ضرور ہی پیشوا بنا لیتے۔ بڑے محبّ قوم تھے۔ دین میں رخنہ اندازی کرنے کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اسی سے نقصان ہوا۔....... یہ جو مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا، یہ غلط ہے بلکہ بڑا دانش مند تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ انگریز برسر حکومت ہیں۔ ان سے بگاڑ کر کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان سے مل کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' (ملفوظات حکیم الامت، ج ۱۱، ص ۲۶۷۔۲۶۹)

''خطبات حکیم الاسلام'' (مولانا قاری محمد طیبؒ) سے اقتباس:

''ایک دن حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی مجلس میں غالباً خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبؒ یا کسی اور نے یہ لفظ کہا کہ: ''احمد رضا یوں کہتا ہے۔'' بس حضرت بگڑ گئے۔ فرمایا: ''عالم تو ہیں۔ ہمیں توہین کرنے کا کیا حق ہے؟ کیوں نہیں تم نے

مولانا کا لفظ کہا؟'' غرض بہت ڈانٹا ڈپٹا۔ بہر حال ہم تو اس طریق پر ہیں کہ قطعاً ان کی بے حرمتی جائز نہیں سمجھتے۔ کافر فاسق کہنا تو بڑی چیز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو خلاف سنت امور ہیں، انھیں ظاہر کرتے ہیں کہ بدعات ہیں، خلاف سنت ہیں، انھیں ترک کرو۔ لیکن کرنے والوں کی توہین کریں، یہ نہیں ہے۔'' (ج ۵، ص ۲۲۲)

''الافاضات الیومیہ'' سے اقتباس:

''ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے اکابر اہل بدعت کی مذمت میں بھی غلو نہیں فرماتے، کیونکہ یہ اہل بدعت اگر اپنے علماء کے کہنے سے غلطی اور دھوکہ میں ہیں تو معذور ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرماویں۔ اور اگر قصداً ایسا کرتے ہیں تو مواخذہ فرمائیں گے، ہم کیوں اپنی زبان گندہ کریں؟ اس لیے اپنے بزرگوں کو کچھ زیادہ کہتے ہوئے یا لکھتے ہوئے نہیں دیکھا'' (الافاضات الیومیہ جلد دوم ص ۷۵)

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

''سوال: زید حنفی المذہب نے اپنی بیوی ہندہ کو ایک مجلس میں بحالت غیظ وغضب ومرض میں بیک زبان تین طلاقیں دے دیں۔ پھر پچھتایا اور نادم ہوا کہ گھر ویران اور بال بچے دربدر ہو جائیں گے۔ اشد ضرورت میں مفتی اہل حدیث سے فتویٰ طلب کیا۔ وہاں سے فتویٰ ملا کہ صرف ایک ہی طلاق ہوئی ہے۔ زید نے رجوع کر لیا۔ اس پر دوسرے علماء نے مفتی اہل حدیث پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور مقاطعہ کا حکم دیا اور مسجد میں آنے سے روک دیا۔ کیا یہ فعل جائز ہے؟ اور کیا ائمہ متقدمین میں سے کوئی اس کا قائل تھا یا نہیں؟

جواب ۳۵۸: ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کے علاوہ بعض علماء اس کے قائل ضرور ہیں کہ ایک طلاق رجعی ہوتی ہے اور یہ مذہب اہل حدیث نے بھی اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس اور طاؤس وعکرمہ وابن اسحاق سے منقول ہے۔ پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ وہ قابل مقاطعہ اور نہ مستحق اخراج عن المسجد ہے۔ ہاں، حنفی کا اہل حدیث سے فتویٰ حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا تو یہ باعتبار فتویٰ ناجائز تھا، لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اس کا مرتکب ہوا ہو تو قابل درگزر ہے۔'' (کفایت المفتی، ج ۶، ص ۳۷۹، ۳۸۰)

''ڈاڑھی منڈانا یا منڈی ہوئی کے قریب قریب کتروانا مکروہ تحریمی یا حرام ہے کیونکہ یہ امر اعفوا اللحی کے خلاف ہے......اور ایک مشت رکھنا مسنون ہے، اس مقدار سے زائد کو کتروا دینا جائز ہے...... یک مشت کی مقدار احادیث سے ثابت ہے اور وہ احادیث ظنی ہیں، اس لیے اس مقدار کو فرض یا واجب قرار دینا مشکل ہے کہ اس کے خلاف کو فسق کہہ دیا جائے۔ یک مشت کی مقدار کو میں مسنون کہتا ہوں اور اس کے خلاف کو مکروہ بھی کہتا ہوں، مگر ایک مشت سے اتنی کمی کہ وہ دور سے متمیز نہ ہو سکے، میرے خیال میں مکروہ اور ناجائز ہونے کے باوجود اس قابل نہیں کہ اس کو موجب فسق اور مکروہ تحریمی قرار دیا جائے۔ ہاں، مکروہ تنزیہی اور خلاف سنت کہہ سکتے ہیں۔......کس قدر بڑھانا لازم ہے، اس کی تحدید صرف

ایک قبضے والی روایت سے ہوسکتی ہے، لیکن وہ ظنی ہے یعنی اس مرتبے میں نہیں ہے کہ اس کو تحدید اعفاء کے لیے دلیل بنایا جا سکے کیونکہ فعلی روایتیں ہیں جن کا مفاد یہ ہوسکتا ہے کہ ایک قبضے تک رکھ کر زیادہ کو کٹوانا ثابت ہے، لیکن ایک قبضہ فرض ہے یا مسنون یا مستحب، اس کا فیصلہ ان حدیثوں سے نہیں ہوسکتا۔'' (کفایت المفتی، ج ۹، ص ۱۷۲، ۱۷۳)

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مکاتیب شیخ الاسلام، مکتوب نمبر ۶۳ سے اقتباس:

''پادشاہانِ اسلام نے اولا تو اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ بلکہ وہ تمام باتوں کا قوت سے مقابلہ کرتے رہے۔ مگر شاہانِ مغلیہ کو ضرور اس طرف التفات ہوا۔ خصوصاً اکبر نے...... اگر اس کے جیسے چند بادشاہ اور بھی ہو جاتے یا کم از کم اس کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہو جاتی اور اسلام کے دلدادہ آج ہندوستان میں اکثریت میں ہوتے۔ اکبر نے نہ صرف اشخاص پر قبضہ کیا تھا، بلکہ عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا، مگر ادھر تو اکبر نے نفس دین اسلام میں کچھ غلطیاں کیں جن سے مسلم طبقہ میں اس سے بدظنی ہوئی، اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے، ادھر برہمنوں کے غیظ وغضب میں اپنی ناکامیاں دیکھ کر اشتعال پیدا ہوا، ادھر یورپین قومیں خصوصاً انگلستان کو اپنے مقاصد میں کامیابی کا ذریعہ تلاش کرنا پڑا اور سب سے بڑا ذریعہ اس کے لیے منافرت بین الاقوام تھا اور ہے''۔

شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی یاد میں مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی کی تحریر سے اقتباس:

''میں نے عرض کیا کہ اہل علم کا ایک طبقہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اچھا نہیں سمجھتا اور انھیں برے القاب سے یاد کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت شیخ مدنی کے درس میں ایک طالب علم نے رقعہ لکھا اور اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو برا بھلا کہا۔ آپ نے رقعہ پڑھتے ہی عینک اتار دی اور متوجہ ہو کر فرمایا کہ یہ کس گدھے نے لکھا ہے؟ ہمارے استاد (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) تحریک آزادی میں ان کی خدمات کو سراہتے اور تعریف کیا کرتے تھے۔'' (الشریعہ، خصوصی اشاعت بیاد امام اہل سنت، جولائی تا اکتوبر ۲۰۰۹ء)

مولانا قاری محمد طیبؒ

بریلوی دیوبندی اختلاف کے متعلق نقطہ نظر:

''ملتان میں انقلاب سے پہلے ایک دفعہ میرا جانا ہوا۔ مولانا خیر محمد صاحبؒ نے خیر المدارس کا جلسہ کیا تھا۔ میں نے جا کے پوچھا، یہاں کوئی بزرگ، کوئی عالم اور بھی ہے جس سے ملیں؟ انھوں نے کہا: مولانا محمد بخش صاحب ہیں او ر بریلوی فرقہ کے ہیں۔ میں نے کہا: ہم انھیں فرقہ ہی نہیں سمجھتے۔ نہ ہم فرقہ، نہ وہ فرقے۔ مولانا عبد الخالق صاحب نے بہت روکا کہ ان کے خلاف تو جلسہ کر رہے ہیں اور تم جا کے ملو گے! میں نے کہا: خلاف کا وقت آئے گا، خلاف بھی کریں گے اور وہ مسئلہ کی بات ہوگی، لیکن ملنے میں کیا حرج ہے؟ ان سے چھپ چھپا کر، میرے ساتھ حافظ شریف احمد

تھے، مغرب کے وقت ان کی مسجد میں پہنچ گئے۔...... میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھئی منافرت مت پیدا کرو۔ اپنی رائے ہے۔ اگر آپ دیانۃً صحیح سمجھتے ہو، اس پر عمل کرو، لیکن نفرتیں پیدا کرنا، یہ صحیح نہیں۔'' (خطبات حکیم الاسلام، ج ۵، ص ۲۲۴)

روضہ اطہر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے حوالے سے مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے موقف پر تبصرہ:

''سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں۔ صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں۔ ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود وسلام کے حضور کے سمع مبارک تک پہنچنے اور آپ کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے، بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل نہیں۔ ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے، اس لیے انھیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا، بلکہ موول سمجھا جائے گا۔ گو ان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور...... قابل تسلیم نہیں، لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے جبکہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے، ان پر زبان طعن وملامت کھولنا یا تشنیع کرنا کسی طرح قرین انصاف وصواب نہیں، بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنّت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں۔'' (خطبات حکیم الاسلام، ج ۵، ص ۱۰۱)

ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی

محمود احمد عباسی صاحب کی کتاب ''خلافت معاویہ'' پر پاکستان میں پابندی عائد کیے جانے پر جمعیۃ علمائے ہند کے ترجمان ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی میں شائع ہونے والے اداریے (جلد ۴۴، شمارہ ۲۸۱، ۱۲/ اکتوبر ۱۹۵۹ء) سے اقتباس:

''اگر کوئی شخص ایسی کتاب لکھے جس میں اونچے خیالات کے ساتھ علمی رنگ میں کسی اختلافی مسئلہ پر ریسرچ کی گئی ہو اور اس کے ذریعہ تاریخ کے بعض مخفی گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہو، ساتھ ہی اس میں کسی طبقے کی دل آزاری بھی نہ کی گئی ہو، نہ اس کے بزرگوں کو برا کہا گیا ہو تو ایسی علمی کتاب کی قدر کرنی چاہیے۔ اگر کوئی حکومت تحقیقی لٹریچر پر بھی قدغن لگا دے تو یہ علم اور ریسرچ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ ابھی حال میں پاکستان سے خلافت معاویہ ویزید پر ایک کتاب شائع کی گئی ہے جو ہماری نظر سے بھی گزری ہے اور جو اپنے موضوع پر اس قدر محققانہ اور مورخانہ ہے کہ اس سے بہتر ریسرچ کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ ساتھ ہی اس کی متانت بھی قابل داد ہے، مگر ہمیں یہ سن کر تعجب ہوا کہ حکومت پاکستان نے اسے ضبط کر لیا۔ ہوسکتا ہے کہ کتاب مذکور کے دلائل کمزور ہوں اور ان سے کسی کو اتفاق نہ ہو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تحقیق کے اعلیٰ پیمانے پر ہی اسے زیر تنقید لایا جائے اور علمی رنگ میں اس کا جواب دیا جائے۔ لیکن علمی باتوں میں حکومت پاکستان کا دخل دینا حدود کار سے تجاوز کرنا ہے۔ اس طرح تو تحقیقات کا سلسلہ یکسر منقطع ہو جائے گا اور تاریخی لٹریچر کو دریا برد کرنا پڑے گا۔'' (بحوالہ ''خلافت معاویہ ویزید'' طبع سوم ص ۱۲، ۱۳)

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم کی تصنیف ''مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی: ایک مطالعہ'' (شائع کردہ: حافظی بک ڈپو، دیوبند، ۲۰۰۹ء) سے اقتباس:

''مولانا عثمانی باوجودے کہ قدامت پسند علماء کے طبقہ متشددین سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انھوں نے مولانا مودودی سے جب کبھی گفتگو یا مراسلت کی تو اس میں سنجیدگی ومتانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان سے علمی اختلاف ضرور کیا، لیکن ان کے احترام اور محبت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔......مولانا ظفر احمد صاحب نے مولانا مودودی کی علمی قابلیت کا اعتراف، ان سے اظہار محبت اور کچھ علما کی طرف سے ان کی تحریروں پر تکفیری حملوں سے اظہار براءت کرتے ہوئے مسئلہ مذکورہ میں مولانا مودودی کے خیالات سے اختلاف کیا۔......

یہ ایک مثبت انداز فکر تھا جو مولانا کو علمی حلقوں میں ممتاز کیے ہوئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے یہاں علمی تحریروں کے تئیں جو جذبات مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہم (جو علمائے دیوبند میں امتیاز شان رکھتے تھے) کے متعلق ملتے ہیں، وہی جذبات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (جن کی فکر عام علمائے دیوبند کی روش سے ہٹ کر ہے) کے لیے بھی ملتے ہیں۔ آپ نے جس انداز سے مذکورہ بالا حضرات سے علمی بحث کی ہے، اس میں افہام وتفہیم کے عناصر ہیں نہ کہ نزاع وجدال کے۔'' (ص۱۸۴-۱۸۶)

[مذکورہ کتاب پر دارالعلوم دیوبند وقف کے استاذ مولانا محمد اسلم قاسمی اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے امین عام مولانا سید محمد شاہد کی تقریظات بھی ثبت ہیں۔]

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

مولانا عمر احمد عثمانی (فرزند مولانا ظفر احمد عثمانی) مصنف ''فقہ القرآن'' کے نام مکتوب سے اقتباس:

''اللہ تعالیٰ تمھاری کوشش کو بارآور کرے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں لغزشوں سے محفوظ رکھے۔ لغزش تو پیارے کس سے نہیں ہوتی؟ اللہ تعالیٰ سب کو معاف کرے۔ اپنی طرف سے دیدہ ودانستہ نہیں کرنی چاہیے، اتنا ہی بہت ہے۔ تمھارے لیے واقعی دل سے دعا نام لے کر بھی اور بغیر نام لیے تو بہت کثرت سے کرتا ہوں۔ تم تو میرے قدیم لاڈلے ہو اور استاذی اعلی اللہ مرقدہ کے یادگار رہو۔ اللہ تمھیں ہر لغزش سے محفوظ رکھے۔ تمھاری تصانیف کو قبول فرمائے۔ لوگوں کو ان سے منتفع فرمائے۔'' (''فقہ القرآن''، شہادت ودیت نسواں''، ص۱۶)

مولانا سید سلیمان ندویؒ

جسٹس سید امیر علی کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''سید امیر علی مرحوم تمام تر جدید تعلیم کے پیداوار تھے، مگر انھوں نے بزرگوں کے سنے سنائے معلومات اور ذاتی کد

وکاوش سے یورپ میں اسلام کی بڑی خدمت کی۔ وہ یورپ میں تمام اسلامی کاموں اور تحریکوں کے رکن رکین سمجھے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات سے گو ہم موافقت نہ کر سکیں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے قلم کی ضوفشانی سے اسلام کے متعلق یورپ کے بہت سے خیالات باطلہ کے بادل پھٹ گئے۔ ان کی دو کتابیں اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سارا سینس ہمیشہ یادگار رہیں گی۔'' (یادرفتگاں، ص ۸۶)

خواجہ کمال الدین کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''عیسوی مذہب کے سب سے بڑے نقاد اور عیسوی ممالک میں اسلام کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین نے افسوس ہے کہ وفات پائی۔ وہ کئی برس سے سل کے مرض میں مبتلا تھے اور اس حالت میں بھی وہ تصنیف وتالیف میں ہمیشہ مصروف رہے۔ احمدی جماعت میں ہمارے نزدیک وہ عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب تھے۔...... گو ہم کو خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات اور تاویلات سے اتفاق نہیں، تاہم یہ کہنا اظہار واقعہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اپنی پوری بیس برس کی زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی میں صرف کی اور نیز یہ کہ ان کی تصنیفات کے بڑے حصے کا موضوع ''احمدیت'' نہیں، ''محمدیت'' ہے۔ افسوس کہ ان کی موت سے دنیا کی مذہبی بزم میں ایک اہم جگہ خالی ہوگئی۔'' (یادرفتگان، ص ۱۵۰)

مصطفیٰ کمال اتاترک کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''آخر اس عیسیٰ نفس کو بھی موت آ گئی جس نے بیمار ترکی کو شفا اور اس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی۔ ......۱۹۲۰ء میں کون خیال کر سکتا تھا کہ اتحادیوں کے پنجہ ستم سے بچ کر یہ شکار صحیح وسلامت نکل آئے گا، مگر اس کی تدبیروں نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی۔ ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا:

قاہری با دلبری پیغمبری ست

ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا جو تاج وتخت، خدم وحشم، باڈی گارڈ اور محافظوں کے دستہ کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا۔ اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا جس کے دیکھنے کو خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی آنکھیں بے تاب تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت ورحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے اور ان کی اجتہادی غلطیوں سے درگزر کرے۔'' (یادرفتگان، ص ۱۸۸)

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی تصنیف ''حیات نعمانی'' (الفرقان بک ڈپو، لکھنو، مارچ ۲۰۱۳ء) سے اقتباس:

''اس سفر [سفر پاکستان ۱۹۷۸ء] میں اپنے قدیم مکرم ومحترم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کا بھی بڑا اشتیاق تھا۔......۲۰، ۲۱ سال کی طویل مدت کے بعد مولانا کو دیکھ کے اور مل کر بہت ہی مسرت ہوئی۔ مئی سال پہلے مولانا بہت سخت مریض ہوئے تھے۔ بظاہر اسباب اس امید کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ صحت یاب ہو کر قرآن پاک کی

تفسیر کا وہ کام جاری رکھ سکیں گے جو ''تدبر قرآن'' کے نام سے وہ کر رہے تھے۔......راقم سطور کے نزدیک اردو کی جدید تفسیروں میں ''تدبر قرآن'' بہت ممتاز مقام رکھتی ہے۔'' (حیات نعمانی، ص ۳۰۸)

''اس ملاقات سے متعلق رفیق سفر برادر عزیز سجاد نعمانی کی روایت بھی قابل ذکر ہے۔ بتاتے ہیں: ...... دوسری بات اس ملاقات کی یہ یاد ہے کہ انھوں نے اپنی اہلیہ کا سلام نقل کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ''مجھے بڑی حسرت ہے اور شکایت ہے کہ میری اہلیہ آپ کی کتابیں معارف الحدیث وغیرہ تو بہت اہتمام سے پڑھتی ہیں، مگر میری کتابوں سے ان کو دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔'' ابی [مولانا منظور نعمانی] نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے کہا: ''اس میں شکایت کی کون سی بات ہے۔ ہم جو لکھتے ہیں، وہ اُن کے لیے لکھتے ہیں اور آپ جو لکھتے ہیں، وہ ہمارے لیے لکھتے ہیں۔'' (ص ۳۰۹)

''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف'' کے دیباچہ سے اقتباس:

''یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، دراصل یہ ایک مضمون ہے جو اب سے ۸، ۹ مہینے پہلے گزشتہ شعبان میں ماہنامہ ''الفرقان'' میں اشاعت ہی کی نیت سے لکھا گیا تھا......کا پیاں پریس جانے والی تھیں کہ ۳۰ شوال (۲۳ ستمبر) کو اچانک اطلاع ملی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جو امریکہ میں مقیم اپنے صاحب زادے کے پاس علاج ہی کے سلسلہ میں مقیم تھے، وہیں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس اطلاع کے بعد اس مضمون کی اشاعت اس وقت مناسب نہیں سمجھی گئی اور شوال وذیقعدہ کے اس مشترک شمارے کو روک کر صرف شوال کا شمارہ تیار کر کے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا جو وسط ذیقعدہ میں شائع ہو سکا۔ اس میں راقم سطور نے مولانا مرحوم سے متعلق مفصل تعزیتی نوٹ بھی لکھا جس میں ان کی قابل قدر خدمات، بعض خصوصیات اور ان کے ساتھ اپنے ربط وتعلق اور پھر قطع تعلق کے مختلف ادوار کا تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ ان کے انتقال کر جانے کے بعد اب ہم پر ان کا حق یہی ہے کہ ان کے اور اپنے رب کریم سے ان کے لیے اور اپنے لیے بھی مغفرت ورحمت کی استدعا کریں۔ **ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غللا للذین آمنوا ربنا انک رءوف رحیم۔**'' (ص ۹)

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

مولانا عمر احمد عثمانی کی تالیف ''فقہ القرآن'' پر تبصرہ:

''فقہ القرآن'' اسی مقصد کی جانب ایک قدم ہے جس میں قرآن مجید کو مدار ومحور بنا کر تمام فقہی ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور علمی انداز سے اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے، اجتہادی مسائل میں باہم اختلافات کی گنجائش رہتی ہے، لیکن اس اختلاف کو وجہ مخالفت بنانا اور غیر شائستہ انداز میں ذاتیات پر اتر آنا نہ علمی مزاج کی نشان دہی کرتا ہے، نہ اسلامی اخلاق کے مطابق ہے۔ خصوصاً مذہبی نمائندوں کے لیے تو یہ طرز عمل نہایت نامناسب ہے۔ اسلامی سوسائٹی پر ان کی گرفت کمزور کرنے میں ان کے اس طرز عمل کو بہت حد تک دخل ہے۔......

علمی کام کرنے والوں کو فتووں اور ہنگاموں سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ کیا امام اعظم نے جب علمی کام کیا تھا تو ہنگامے نہیں ہوئے تھے؟ امام بخاری پر ان کی ایک علمی جدت کی وجہ سے امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں جتنی تلخ و ترش تنقید کی ہے، کیا وہ کسی صاحب علم سے پوشیدہ ہے؟ لیکن آج سب دیکھ رہے ہیں کہ امام اعظم کے علمی کام اور امام بخاری کی علمی جدت کو سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے اور ان حضرات کے مخالفین کے فتوے اور مخالفتیں سب دھری کی دھری رہ گئیں۔'' (''فقہ القرآن''، شہادت و دیت نسواں''، ص۱۳، ۱۴)

''عزیزم مولانا عمر احمد عثمانی مستحق تحسین ہیں کہ وہ اس پل صراط سے نہایت سلامت روی سے گزر رہے ہیں۔ ان کی تحریر سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔ بزرگوں سے جہاں کہیں بھی اختلاف کیا ہے، شائستگی اور وقار کے ساتھ کیا ہے بلکہ یہ اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔'' (''فقہ القرآن''، شہادت و دیت نسواں''، ص۳۴)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات پر تعزیتی تحریر سے اقتباس:

''واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی و علمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد و وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین (Intellectual) طبقہ کا تعلق ہے، اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف و مفکر ان کا مقابل و ہمسر ملے گا۔

مولانا مودودی کے بعض خیالات و تحقیقات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو (اور خود یہ ناچیز بھی ان لوگوں میں شامل ہے جنھوں نے اس علمی محاسبہ اور تنقید کا فرض انجام دیا ہے)، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریریں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کے گہرے مطالعہ اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے ایسے مبصرانہ اور جرات مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کے علمی تحلیل و تجزیہ کا فرض انجام دیا ہے جو خود اعتمادی سے بھرپور اور مرعوبیت و سطحیت سے دور ہے۔ ...... انھوں نے اسلام کے حقائق، اس کے قوانین معاشرت اور اس کے اقتصادی، سیاسی نظام کو اس انداز میں پیش کیا جس میں معذرت و تاویل کا وہ رنگ نہیں تھا جو عرصہ سے ان مسائل پر لکھنے والے دانش وروں اور اہل قلم کے یہاں پایا جاتا تھا، بلکہ انھوں نے بارہا مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کے بارے میں اقدامی پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کا وہ احساس کہتری اور شکست خوردگی دور ہو گیا جو خالص مغربی تعلیم نے ان میں پیدا کر دیا تھا۔''

(پرانے چراغ، جلد دوم، ص۲۶۵، ۲۶۶)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی وفات پر مولانا محمد تقی عثمانی کے تعزیتی مضمون سے اقتباس:

''جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی تو وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی ان کا ساتھ دیا، لیکن جب ان کے طرز فکر و عمل سے اختلاف سامنے آیا تو حضرت مولانا ان سے الگ تو ہو گئے، لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مخالفت کو اپنا ہدف نہیں بنایا، بلکہ مغربی افکار کی تردید میں انھوں نے جو قابل قدر کام کیا ہے، اس کی تعریف و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔'' (نقوش رفتگان، ص ۴۴۷)

مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ

''ہم مولانا مودودی صاحب کی وسعت نظر، کثرت مطالعہ اور جدید مسائل کو دل نشین اور مدلل طرز میں لکھنے کے امتیازات کی بڑی قدر کرتے ہیں، مگر جن مسائل میں وہ صرف اپنی دھنتے ہیں اور دوسروں کی نہیں سنتے یا کسی غلط فہمی کے تحت دوسروں کو بھی مغالطہ ڈال دیتے ہیں، اس طرز فکر یا انداز تحریر کی داد دینے سے ہم قاصر ہیں''۔ (ملفوظات محدث کشمیری صفحہ ۱۶۱)

''اس ایک صدی کے اندر جو کتب تفاسیر شائع ہوئیں، وہ بڑی حد تک غیر معیاری ہیں۔ تفسیر المنار مصری ہو یا سرسید کی تفسیر ہندی ہو، عنایت اللہ مشرقی کی تفسیر ہو یا مولانا آزاد کی ترجمان القرآن، مولانا عبیداللہ سندھی کی جدید تفسیر ہو یا مولانا مودودی کی تفہیم القرآن، مولانا فراہی کی تفسیر ہو یا مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن وغیرہ، ان سب میں عمدہ تفسیری مواد کے ساتھ آزادی رائے اور تفردات کے نمونے بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ان سب میں سے تفہیم القرآن قابل ترجیح ہے اور جن جن مقامات میں تفاسیر جمہور کے مطابق انہوں نے تشریحات وتقریرات کی ہیں، وہ قابل قدر ہیں۔ لیکن جن جن مقامات پر وہ جمہور مفسرین اور اکابر امت سے الگ ہو کر اپنے تفردات رقم کر گئے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ قابل قبول نہیں ہو سکتے''۔ (ملفوظات محدث کشمیری صفحہ ۲۱۷)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ

جسٹس (ر) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی تالیف ''مجموعہ قوانین اسلام'' (جلد پنجم) کے پیش لفظ سے اقتباس:

''ملک میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو طوفانی آندھیوں سے نہیں گھبراتے اور مایوس نہیں ہوتے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اسلامی قوانین کی تدوین نو ہو جانی چاہیے تا کہ کسی وقت ملک میں اس کی تنفیذ مقدر ہو تو وقت زیادہ نہ لگے۔ اس کام کے لیے بعض اداروں نے بھی اپنا ارادہ ظاہر کیا، کچھ افراد نے کام بھی شروع کیا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ جم کر کام کرنے والے ہمارے محترم ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ ثابت ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے شخصی قوانین کی تدوین کا بیڑا اٹھایا اور پانچ جلدوں میں شخصی قوانین مرتب کر دیے۔......

میری نظر میں اس کتاب میں ایک چیز ایسی ہے جس نے اس کی افادیت کو مجروح کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ محترم تنزیل الرحمٰن صاحب اس چیز کو اپنی کتاب کا امتیازی وصف قرار دیتے ہوں، مگر میرے نزدیک یہ جدید انداز ریسرچ اور

نام نہاد تحقیقات جدیدہ کا ترکہ ہے جو غیر شعوری طور پر ان کے مزاج میں دخیل ہو گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے بہت سے مواقع میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل کرنے کے بعد از روئے دلائل ان میں محاکمہ کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا بیڑا اٹھایا اور متعدد مسائل میں فقہ حنفی کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے امام کے مسلک کو اختیار فرمایا ہے......

اس ملک کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت حنفی المذہب ہے۔ ان پر فقہ حنفی کا قانون نافذ کرنا تو خود ان کے اپنے مذہب کو نافذ کرنا ہے۔ اس کے خلاف کسی دوسرے مذہب کا کوئی قانون ان پر عائد کرنے کا کسی کو بجز اس خاص صورت کے حق نہیں ہے جس کو فقہا نے وضاحت سے لکھ دیا ہے۔......اس کتاب میں چند مقامات پر اس امر کی خلاف ورزی کی گئی ہے، اس لیے میرے نزدیک وہ ناقابل عمل ہیں اور نہ ان کو پاکستان کے مسلمانوں پر قانون بنا کر تھوپا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا کیا گیا تو مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اس کے خلاف احتجاج کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس تھوڑی سی تجدد پسندی کو اس کتاب سے الگ کر دیا جائے تو بلاشبہ قانون میراث و وصیت وغیرہ میں یہ کتاب ایک بے نظیر جامع کتاب ہے جس کے لیے ہمیں تنزیل الرحمٰن صاحب کا ممنون ہونا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذہن سے اس کانٹے کو بھی نکال دیں تو وہ دور حاضر کے بڑے کارگزار مصنف اور بہترین قانون دان ہو سکتے ہیں جن پر دینی مسائل میں اعتماد کیا جا سکے۔......

آخر میں اس رائے کے اظہار کو ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ قوانین انگریزی زبان میں جلد منتقل ہونا چاہیے تاکہ مستشرقین کی آنکھیں کھل سکیں اور باہر کی دنیا اسلام کے قوانین سے واقف ہو سکے۔''

مولانا محمد اسحاق صدیقی سندیلویؒ

مولانا عمر احمد عثمانی کی تصنیف ''فقہ القرآن'' پر تبصرہ:

''یوں تو ''فقہ القرآن'' کے تمام مباحث علمی اور اعلیٰ پیمانے کے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ ازواجہ واصحابہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق افسانوں کی جس طرح مدلل وضاحت کی گئی ہے، اس کے نتیجے میں آپ اور مولانا طاہر مکی اور ادارہ کے تمام حضرات نے جنت کا سامان مہیا کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان محنتوں کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھائے اور امت کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔'' (فقہ القرآن، ''شہادت و دیت نسواں''، ص ۱۶)

نزول مسیح کے منکر کی تکفیر کے ضمن میں استفسار کا جواب:

''جن احادیث کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہو کہ بعض کے نزدیک وہ متواتر ہوں اور بعض کے نزدیک متواتر نہ ہوں، ایسے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہے پھر وہ حدیث اجماعی نہیں رہتی۔ اس سے واضح ہے کہ جن حضرات کے اختلاف کو امام ابن حزم نے قابل ذکر قرار دے کر نزول مسیح کے مسئلہ کو غیر اجماعی اور اختلافی قرار دیا ہے، ان کے نزدیک یہ مسئلہ متواتر احادیث سے ثابت نہیں۔ اگر ان کی یہ بات کچھ بھی وزن نہ رکھتی تو ان کے اختلاف کو

اہمیت دے کر مسئلہ کو غیر اجماعی قرار دینے کے بجائے امام ابن حزم ان کو متواتر کا منکر قرار دے کر کافر قرار دیتے اور نزول مسیح کے مسئلہ کو اجماعی بتاتے۔...... یہ دعویٰ کرنا کہ یہ آیات نزول مسیح کے متعلق واضح ہیں اور جو نزول مسیح کو نہ مانے، وہ ان آیات قرآنی کا منکر ہے، بالکل غلط بات ہے اور اس بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال یا ان کے ہم خیالوں کو کافر قرار دینا نہایت مجرمانہ بات ہے۔'' (فتویٰ مشمولہ ''انتظار مہدی و مسیح'' از علامہ تمنا عمادی، ص ۱۵، ۱۸)

مولانا عبید اللہ انورؒ

مولانا عبید اللہ انورؒ کی وفات پر رسالہ ''تدبر'' میں مولانا امین احسن اصلاحی کے تعزیتی شذرہ سے اقتباس:

مولانا میاں محمد اجمل قادری نے اپنے ایک خطبہ میں بتایا کہ جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا انتقال ہوا تو مولانا عبید اللہ انور ان کے جنازے میں شرکت کے لیے گھر سے روانہ ہوئے۔ میں جنازے پر نہیں جانا چاہ رہا تھا تو حضرت نے فرمایا کہ دیکھو! مولانا مودودی، حضرت لاہوریؒ کے جنازے میں شریک ہوئے تھے اور پہلی صف میں موجود تھے، اس لیے میرا حق بنتا ہے کہ میں ان کے جنازے میں شرکت کروں۔ تم نہ جانا چاہو تو گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے بعد مولانا عبید اللہ انورؒ نے شیرانوالہ گیٹ لاہور میں اپنی ہفتہ وار مجلس ذکر میں مولانا مودودی کے لیے خصوصی دعائے مغفرت کروائی اور کہا کہ حضرت لاہوری ان سے اختلاف کیا کرتے تھے، لیکن مولانا مودودی نے دین کے لیے جو کام کیا، اپنے فہم کے مطابق نیک نیتی سے کیا۔ (روایت: مولانا ملک عبدالواحد، گوجرانوالہ)

مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

محمد عمار خان ناصر کی تحریر ''ابا جی اور صوفی صاحب: شخصیت اور فکر و مزاج کے چند نمایاں نقوش'' سے اقتباس:

''وہ عمومی طور پر بھی جمہور اہل علم کے موقف کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کسی بھی علمی یا فقہی مسئلے میں جمہور امت جس رائے کی تائید کریں، وہی اقرب الی الحق اور قرین صواب ہوتی ہے۔ ......تاہم اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ اس نکتے کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم اور محققین بسا اوقات کسی مسئلے میں عام رائے پر اطمینان محسوس نہیں کرتے اور ان کا غور و فکر انھیں معروف اور مانوس نقطہ نظر سے مختلف رجحان اختیار کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے، چنانچہ وہ ایسے اہل علم کے لیے جن کی علمی حیثیت مسلم ہو، عام آرا سے اختلاف یا تفرد کا حق بھی پوری طرح تسلیم کرتے تھے، بشرطیکہ اس اختلاف کو علمی حدود میں رکھا جائے اور اس کی وجہ سے جمہور اہل علم پر طعن و تشنیع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ اپنی کتاب ''سماع الموتی'' میں انھوں نے اپنے اس موقف کی تفصیلاً وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:......

''بلا شبہ ہمارے پیر و مرشد قدس اللہ تعالیٰ سرہ اور حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ الہندؒ اور حضرت نانوتویؒ وغیرہ حضرات نے اپنے علم و تحقیق کی بنا پر اپنے تفردات کو بھی لیا ہے، مگر یقین جانیے کہ نہ تو انھوں نے جمہور کو

زنبور کہا ہے اور نہ ان کا مذاق اڑایا ہے اور نہ انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ علماء حق کے ہاں جمہور کی حیثیت کیا ہے؟'' (ص ۶۴)

وفات سے چند ماہ قبل کی بات ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں، میں نے کہا کہ آپ علمی مسائل میں جمہور کی رائے کی پابندی پر بہت اصرار کرتے ہیں، لیکن بہت سے اکابر اہل علم، مثلاً امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ہاں متعدد مسائل میں عام موقف سے ہٹ کر رائے پیش کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ (امام ابن تیمیہ کی ایسی آرا کی تعداد تین درجن کے قریب شمار کی گئی ہے) کیا یہ حضرات جمہور کی رائے کی اہمیت سے واقف نہیں تھے اور کیا ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی منفرد رائے قائم کریں؟ انھوں نے فرمایا، ہاں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ایسا کرنے سے وہ گمراہی کا ارتکاب کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا کرنے کے باوجود وہ اہل سنت کے دائرے میں ہی رہتے ہیں؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ ابا جی نے اپنی تصانیف میں بھی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ذکر ہر جگہ نہایت ادب واحترام سے ''امام'' اور ''شیخ الاسلام'' وغیرہ کے القاب کے ساتھ کیا ہے۔......

جمہور سے ہٹ کر منفرد آرا قائم کرنے والے کم وبیش سبھی اہل علم کے بارے میں ان کے ہاں یہی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور مورخ ابن خلدونؒ نے تاریخی زاویے سے حضرت آدم کا قد ساٹھ ہاتھ ہونے کی روایت اور امام مہدی کے ظہور سے متعلق روایات پر تنقید کی ہے جو محدثین کے ہاں مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ابا جی نے ہر جگہ ان کا ذکر ''علامہ'' اور ''مورخ اسلام'' کے القاب سے کیا ہے۔ تسکین الصدور میں ابن حزمؒ کی جمہور سے بالکل ہٹی ہوئی ایک رائے بیان کرتے ہوئے اور اسے ''غلط نظریہ'' قرار دیتے ہوئے بھی انھوں نے ان کے لیے ''علامہ'' کا لقب استعمال کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خانؒ کے ہاں مشرک کے ذبیحہ کے حلال ہونے، چار سے زائد عورتوں سے نکاح کے جواز اور نکاح متعہ کی حلت جیسے بہت سے تفردات پائے جاتے ہیں، لیکن ابا جی نے اپنی تصانیف میں بے شمار جگہ پر ان کی آرا کا حوالہ دیا ہے اور صرف الزامی بحثوں میں نہیں، بلکہ خالص تحقیقی امور میں بھی ان کی رائے سے استناد کیا ہے۔...... مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی منفرد تفسیری آرا اور رجحانات بھی کسی سے مخفی نہیں، لیکن ابا جی نے ان کا ذکر بھی ''حضرت مولانا امین احسن اصلاحی'' کے الفاظ سے کیا ہے۔......

میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ کیا صوفیا کا تصور وحدت الوجود قرآن وسنت کے مطابق ہے؟ انھوں نے کہا: ''کھینچ تان کر ہی مطابق بنایا جاتا ہے''، لیکن اس تصور کے سب سے بڑے ترجمان امام محی الدین ابن عربیؒ کا ذکر انھوں نے اپنی تصانیف میں بے حد احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اس نوعیت کی بعض تعبیرات کے تناظر میں میرے استفسار کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ ہمارا طریقہ بحمد اللہ اعتدال کا طریقہ ہے۔ ہم نہ اہل بدعت کی طرح اکابر کی غلطیوں کو مذہب اور مسلک بناتے ہیں اور نہ غیر مقلدین کی طرح انھیں طعن وتشنیع کا ہدف بناتے ہیں۔'' (الشریعہ، جولائی تا اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۵۰۵ تا ۵۰۹)

مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ

سید مشتاق علی شاہ کے مضمون ''حضرات شیخین کی چند مجالس کا تذکرہ'' سے اقتباس:

''میں نے حضرت صوفی صاحب سے پوچھا کہ یتیمۃ البیان میں مولانا یوسف بنوریؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ملحد اور زندیق لکھا ہے۔ فرمایا کہ یہ زیادتی ہے۔ اسی طرح مولانا ادریس کاندھلویؒ نے عین اس وقت جب مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی کشمکش چل رہی تھی، مولانا آزاد کی تفسیر پر تنقید شائع کر کے زیادتی کی۔......

حضرت درس قرآن کے لیے جن کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، ان میں مودودی صاحب کی تفہیم القرآن اور پرویز صاحب کی مفہوم القرآن وغیرہ بھی شامل تھیں۔ میں نے حضرت سے ان کتابوں کے مطالعے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ عوام کو تو ہم منع کرتے ہیں، لیکن اہل علم کو، جو صحیح اور غلط بات کا فرق سمجھتے ہیں، ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ان میں بھی بعض اوقات ایسی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔''

(www.sarfarazsafdar.org)

مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی تصنیف ''مجموعہ قوانین اسلام'' پر تبصرے سے اقتباس:

''مولف نے اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے دس رہنما اصول بیان کیے ہیں جن کی پابندی مجموعہ قوانین کی ترتیب وتالیف، بحث وتنقیح اور تجزیہ وترجیح میں مولف نے اپنے بیان اور مبلغ کی ہے اور وہ حسب ذیل ہیں:......

۸۔ اگر زمانہ سابق کا تعامل زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو تو ''مصلحت عامہ'' (جو قرآن وسنت کے احکام کے مغائر نہ ہو) کے اصول پر عمل پیرا ہو کر مختلف مکاتیب فکر میں سے جس کے ساتھ حق نظر آئے، اس کی رائے کو ترجیح دینا اور اسی کو اختیار کرنا۔

۹۔ اگر کسی مسئلہ میں نص موجود نہ ہو اور کسی بھی مکتب فکر کی رائے کا اتباع بوجوہ معقول بالخصوص مصلحت عامہ کے نقطہ نظر سے (جو قرآن وسنت کے احکام کے مطابق ہو) قابل قبول نہ ہو تو ضروری اجتہاد سے کام لینا۔

۱۰۔ اجتہاد میں قرآن وسنت کی متابعت اور ادلہ شرعیہ کی پابندی کرنا۔

واضح ہو کہ مولف نے جو یہ دس رہنما اصول بیان کیے ہیں، ان میں صحت میں تو کبھی دو رائے ہی ہو نہیں ہو سکتیں۔ یہ سب متفقہ طور پر مسلم ہیں۔......

یاد رکھیے کہ ادارۂ بینات کا نظریہ اس کاوش کے بارے میں تخریبی ہرگز نہیں ہے، بلکہ تعمیری ہے۔ اسی لیے وہ رہنما اصول کے بارے میں مذکورہ بالا جزوی اختلاف یا مسائل مندرجہ میں آنے والے چند اختلافات کے باوجود مولف جناب تنزیل الرحمٰن صاحب کی اس تالیف مجموعہ اسلامی قوانین کے نقش اول کو نہایت فراخ دلی سے خوش آمدید کہتا ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر اور ماخذ (کتب حوالہ) کی مراجعت اور کافی غور وخوض

کے بعد چند متفرق مسائل میں کوتاہیوں، غلط فہمیوں یا اغلاط کی مدلل نشان دہی صرف اس توقع پر کرتا ہے کہ

ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

......صغیر سنی کی شادی یعنی باپ کے اپنی نابالغ اولاد کی شادی کر دینے کے خلاف قانون اور مروجہ عائلی قوانین کے تحت قابل سزا جرم ہونے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: یہ امر کہ صغرسنی کی شادیوں کو پاکستان میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، ایک سماجی مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کو خالص مذہبی انداز میں سوچنے کے بجائے سماجی اور معاشرتی پہلو سے بھی سوچنا اور غور کرنا چاہیے۔

ہمیں حیرت ہے کہ مولف مجموعہ قوانین اسلام کے اندر کسی مسئلہ کو سماجی یا معاشرتی پہلو سے سوچنے اور اس کے حل کرنے کی دعوت رہے ہیں اور مسئلہ بھی ایسا کہ خود ان کے اختیار کردہ رہنما اصول کے تحت نہ صرف کتاب وسنت بلکہ اجماع امت بلکہ اجماع صحابہ بھی اس پر موجود ہے۔......

طلاق ثلاث کے مسئلہ میں اس وقت صرف اس قدر عرض ہے کہ وہ حدیث جس سے آپ حضرات استفادہ کرتے ہیں، اس میں **فامضاہ عمر علیہم** کے الفاظ ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تین مرتبہ طلاق دینے کی صورت میں تین طلاقوں کا واقع ہونا عہد رسالت میں بھی تھا، البتہ بعض احوال میں ...... کہنے والے کے یقین دلانے پر کہ اس کی مراد بار بار کہنے سے تاکید ہے،......اس کے حلفیہ بیان کو صحیح اور اس طلاق کو ایک سمجھ لیا جاتا تھا۔ بعد میں حضرت عمر نے جب دیکھا کہ لوگوں نے اس کو حیلہ بنا لیا ہے کہ تین طلاقیں دیتے ہیں، پھر بعد میں کہہ دیتے ہیں کہ ہماری مراد تو ایک طلاق تھی تو انھوں نے عہد رسالت کے اصل حکم کو ہی نافذ کر دیا۔......

مولف نے تعدد ازواج پر بحث کی ہے۔ بحث میں مولف کوئی خاص چیز پیش نہ کر سکے۔ وہی پرانے دلائل جو عائلی قوانین کے حامیوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں، مولف کا بھی سرمایہ ہیں۔ سید رشید رضا اور مفتی محمد عبدہ کے اقوال وآرا ان کی بحث وتنقیح کا خلاصہ ہیں۔ بھلا قرآن کریم، حدیث نبوی اور اجماع امت کے ہوتے ہوئے ان حضرات کے دلائل کیا وزن رکھتے ہیں۔ وہی مصالح کا عذر اور ارباب اقتدار اور قانون ساز اداروں کو اس نوع کے اختیارات دینے کا اعادہ کیا گیا ہے۔......

مولف نے تفصیلی بحث کی ہے اور ائمہ اربعہ کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ آخر میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء کرام کے موقف کی تغلیط کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''لیکن اس تفریق اور تقیید کے لیے از روئے قرآن یا سنت نبوی یا آثار صحابہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔'' (ص ۲۳۷)

امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ باپ کا کیا ہوا نکاح قابل فسخ نہیں ہے اور اس میں لڑکی کو خیار حاصل نہیں ہوگا۔ ائمہ اربعہ کا متفقہ مسلک ہے اور یاد رکھیے، ائمہ اربعہ کا جب کسی مسئلہ پر اتفاق ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جمہور صحابہ اور جمہور تابعین میں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور امت کا تعامل وتوارث اس پر برابر چلا آ رہا ہے۔ ائمہ اربعہ کے اتفاق واجماع کی پوری اہمیت غالباً مولف کے ذہن میں نہیں ہے۔......

ان چند اختلافات اور شکوہ وشکایت کے باوجود ہم مولف اور تالیف کے بارے میں مجموعی طور پر اپنی رائے کا اظہار

حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

(۱) اللہ جل شانہ کے فضل وکرم سے مولف کا ذہن بالکل پاک وصاف اور تجدد پسندی یا تجدد پرستی کے ''زہریلے جراثیم'' سے بالکل محفوظ ہے۔ انداز نگارش نہ صرف قرآن وحدیث اور اجماع کے بارے میں بلکہ ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت کے حق میں بھی انتہائی عقیدت مندانہ اور مخلصانہ ہے، معاندانہ یا جارحانہ مطلق نہیں ہے۔

(۲) مولف تصنیف وتالیف خصوصاً ترتیب وتدوین قانون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

(۳) جو اہم کام قدیم وجدید علوم کے محققین اور قانون کے ماہرین کے باہمی اشتراک عمل سے کرنے کا تھا، وہ کام تنہا مولف نے ایک حد تک نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔'' (مقالات ص ۱۷۵ تا ۲۰۴)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

دیوبندی بریلوی اختلاف سے متعلق استفسار پر جواب:

''میرے لیے ''دیوبندی بریلوی اختلاف'' کا لفظ ہی موجب حیرت ہے۔ آپ سن چکے ہیں کہ شیعہ سنی اختلاف تو صحابہ کرام کو ماننے یا نہ ماننے کے مسئلہ پر پیدا ہوا اور حنفی وہابی اختلاف ائمہ ہدیٰ کی پیروی کرنے نہ کرنے پر پیدا ہوا، لیکن ''دیوبندی بریلوی اختلاف'' کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے، اس لیے کہ یہ دونوں فریق امام ابوحنیفہ کے ٹھیٹھ مقلد ہیں۔ عقائد میں دونوں فریق امام ابوالحسن اشعری اور امام ابومنصور ماتریدی کو امام ومقتدا مانتے ہیں۔ تصوف وسلوک میں دونوں فریق اولیاء اللہ کے چاروں سلسلوں قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی میں بیعت کرتے کراتے ہیں۔

الغرض یہ دونوں فریق اہل سنت والجماعت کے تمام اصول وفروع میں متفق ہیں۔ صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کی عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے مقلد اور مجدد الف ثانی اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی تک سب اکابر کے عقیدت مند ہیں اور اکابر اولیاء اللہ کی کفش برداری کو سعادت دارین جانتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں کے درمیان مجھے اختلاف کی کوئی صحیح بنیاد نظر نہیں آتی۔ تاہم میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ان کے درمیان چند امور میں اختلاف ہے، اس لیے میں کسی فریق کا نام لیے بغیر قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی تصریحات کی روشنی میں ان کے مختلف فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔'' (''اختلاف امت اور صراط مستقیم''، ص ۳۷، ۳۸)

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان کی وفات پر تعزیتی تحریر:

''حضرت شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے فارغ التحصیل، حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے شاگرد تھے۔ قرآنی علوم کا استفادہ شیخ وقت حضرت اقدس مولانا حسین علی صاحب واں بھچراں (تلمیذ رشید حضرت گنگوہیؒ) سے کیا۔......ان کا لقب ''شیخ القرآن'' تھا۔ پاکستان میں وہ واحد شخصیت تھے جو اس لقب سے معروف تھے اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو ان کے کسی دوسرے معاصر کو نصیب نہیں ہوا۔ مولانا کے مآثر میں ان کی تفسیر ''جواہر القرآن'' تین جلدوں

میں یادگار ہے جسے انھوں نے اپنے شیخ حضرت مولانا حسین علیؒ کے افادات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ان کے بعض نکات سے علماء کو اختلاف ہوسکتا ہے اور ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑی خدمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لی۔'' (''شخصیات و تاثرات''، شائع کردہ مکتبہ لدھیانوی، کراچی، طبع ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۵، ۱۷۶)

مولانا محمد اسحاق سندیلوی صدیقیؒ کی وفات پر ماہنامہ ''بینات'' (ربیع الاول ۱۴۰۴ھ، جنوری ۱۹۸۴ء) میں تعزیتی مضمون سے اقتباس:

''۱۹۸۳ء (۱۴۰۳ھ) میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسین (چکوال) نے ۶۱۲ صفحے کی ایک ضخیم کتاب ''مولانا محمد اسحاق سندیلوی (کراچی) کا مسلک اور خارجی فتنہ (حصہ اول)'' کے نام سے تحریر فرمائی جس میں پوری صراحت ووضاحت کے ساتھ دلائل واقتباسات کی روشنی میں مولانا مرحوم کو اس ناصبی تحریک کا قائد ثابت کیا گیا۔......

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب زید مجدہم کے بعض تفردات سے ہمیں بھی اختلاف ہے اور ان کی جن عبارتوں کی حضرت قاضی صاحب نے نشان دہی کی ہے، انھیں لائق اصلاح سمجھتے ہیں، لیکن ان کے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور شرف وعظمت کے بارے میں ہمارے دل میں کبھی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا۔......خلاصہ یہ کہ حضرت قاضی صاحب کے پیش کردہ اہل حق کے موقف ومسلک سے ہمیں نہ صرف اتفاق ہے، بلکہ یہی ہمارا عقیدہ وایمان ہے، لیکن موصوف نے حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب کے خلاف جس درشتی وتندی کا اظہار کیا ہے، ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔

اب اگر مولانا محترم اس شدت سے قطع نظر کر کے اصلاح طلب امور کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائیں تو یہ ان کی للٰہیت وبے نفسی کا کمال ہوگا اور اگر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیں تو قلم ان کے ہاتھ میں بھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سبائیت وخارجیت کے طفیل میں اہل سنت کے دو بڑے بزرگوں کے درمیان ایک اور ''جنگ صفین'' برپا ہوگی۔''

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

دیوبندی بریلوی اختلافات کی نوعیت اور باہمی مصالحت کے ضمن میں نقطہ نظر:

''دیوبندی اور بریلوی مکاتب فکر کے درمیان جو خلیج بڑھتی جا رہی ہے، اسے کم بلکہ ختم کرنے کی راہ تلاش کی جائے۔...... میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عقائد کے باب میں دونوں مکاتب فکر کا اختلاف بڑی حد تک صرف تعبیر اور الفاظ کا اختلاف ہے۔ حقیقت میں ایسا کوئی اختلاف عقائد کے باب میں نہیں ہے جس کی بنا پر ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق قرار دیا جائے۔ ہاں، بہت سے اعمال میں یہ اختلاف ضرور ہے کہ ہم انھیں بدعت کہتے ہیں اور ان کے نزدیک وہ بدعت میں داخل نہیں۔......

ہمارے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی زندگی کے آخری کئی سال اس کوشش میں صرف فرمائے ہیں اور میں بھی کئی سال سے اس کاوش میں لگا ہوا ہوں۔ چنانچہ میرے اور مولانا [محمد شفیع] اوکاڑوی صاحب کے درمیان طے ہوا کہ وہ اور ہم اپنے اپنے رفقاء اور اہل علم سے رابطہ کر کے اس میں پیش رفت کریں

گے۔ پھر دونوں طرف کے خاص خاص علماء کرام کا مشترک اجلاس ہوگا۔ پھر نسبتاً بڑے پیمانے پر دونوں طرف کے حضرات کا دوسرا اجلاس ہوگا۔ ان اجلاسوں میں اتفاق ہو جانے کے بعد ملک گیر پیمانے پر دونوں طرف کے علماء ومشائخ کا کنونشن بلا کر ان میں اعلان کر دیا جائے گا کہ عقائد میں ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔'' (مجلّہ ''المصطفیٰ''، بہاولپور، امام اہل السنۃ نمبر، رجب تا شعبان ۱۴۳۰ھ، ص ۳۷۴، ۳۷۵)

مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی کے نام خط سے اقتباس:

''احقر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب عذاب قبر کے علی الاطلاق منکر نہیں بلکہ برزخ میں روح کے عذاب وثواب کے قائل ہیں۔ جسد عنصری کے ساتھ روح کے عذاب وثواب کے قائل نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ عالم برزخ کا عذاب اجسام مثالیہ کی وساطت سے روح پر وارد ہوتا ہے۔ یہ بات اگرچہ جمہور اہل سنت کے مسلک کے خلاف ہے، لیکن کسی نص صریح کے بھی خلاف ہے؟......خلاصہ کلام یہ کہ اس مضمون کے پڑھنے سے یہ بات سامنے آئی کہ ان کا مسلک اتنا غلط اور بے بنیاد نہیں جتنا کہ یہ سننے سے سمجھا تھا کہ ''وہ عذاب قبر کے منکر ہیں۔'' بہرحال ان کا مسلک علماء دیوبند اور جمہور سے مختلف ضرور ہے۔ اگر قرآن کریم یا سنت کی کوئی نص صریح صحیح ان کے مسلک کے ابطال پر آنجناب کے علم میں آئی ہو تو ضرور مطلع فرمائیں۔'' (مجلّہ ''الحقانیہ''، ساہیوال، ستمبر ۲۰۱۰ء)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''پچھلے چند سال سے اور بالخصوص گزشتہ چند مہینوں سے ایسی ایسی شخصیتیں اٹھ رہی ہیں جن کا صدمہ کسی ایک فرد، انجمن یا ادارے کا نہیں بلکہ پوری ملت کا صدمہ ہوتا ہے۔......ان کا شمار حضرت تھانوی کے خلفاء میں تو نہیں، لیکن ممتاز متوسلین میں ضرور تھا۔ وہ حضرت تھانویؒ کے عاشق تھے اور اپنی تحریروں میں جگہ جگہ حضرت کو مرشد تھانوی کے لقب سے یاد کرتے ہیں، لیکن بہت سے معاملات میں ان کی رائے حضرت تھانوی سے مختلف رہی ہے۔ حضرت سے متعدد مسائل پر سوال وجواب ہوئے اور مولانا دریابادیؒ حضرت کی فہمائش کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم رہے۔ اس کے باوجود تعلق اور عقیدت میں فرق نہیں آیا۔......ان کا قلم صحیح معنی میں بے باک اور نڈر تھا۔ انھوں نے جس بات کو درست سمجھا، اس کے اظہار میں ان کو نہ کبھی حکومت کا خوف دامن گیر ہوا اور نہ عوام یا رائے عامہ کا۔ وہ آخر تک اپنی رائے کا اظہار بے خوف وخطر کرتے رہے، خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔ قادیانیت کے مسئلے میں ان کا نرم گوشہ پوری امت کے خلاف تھا اور بلاشبہ یہ ان کی سنگین ترین غلطی تھی جس پر اللہ ان کی مغفرت فرمائے، لیکن وہ پوری امت کی مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔ عفا اللہ تعالیٰ عنہ وغفر لہ۔'' (نقوش رفتگان، ص ۷۹، ۸۰)

جناب ماہر القادری کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''ماہر صاحب اگرچہ کسی بھی جماعت سے باضابطہ وابستہ نہ تھے، لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے وہ

اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے عقیدت مند ہی نہیں، بلکہ اس معاملے میں مغلوب الحال ہو گئے تھے۔.....ایک روز میں نے ان کے ایک خط کے جواب میں مولانا مودودی کے تفردات کے بارے میں کوئی جملہ لکھ دیا تھا۔ آٹھ دس روز کے بعد ان کی طرف سے ایک پارسل ڈاک میں موصول ہوا۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی مقالہ ہوگا، لیکن کھولا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ وہ میرے اس مختصر خط کا جواب تھا جو اڑتیس صفحات پر مشتمل تھا۔ مجھے اس کے مندرجات سے تو اتفاق نہ ہو سکا، لیکن اس بات کی بڑی قدر ہوئی کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، صرف ایک آدمی کو اس کی تبلیغ کرنے کے لیے انھوں نے اتنی محنت اور اتنا وقت خرچ کیا۔'' (نقوش رفتگان، ص ۱۲۸)

مولانا غلام اللہ خان کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''آپ نے تفسیر ''جواہر القرآن'' جیسی ضخیم کتاب بھی تصنیف فرمائی جو حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری افادات ونظریات کی بہترین تشریح ہے۔ بعض مسائل میں اکابر علمائے دیوبند سے قدرے مختلف موقف رکھنے کے باوجود اکابر کی عظمت ومحبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔.......بحمد اللہ برادر محترم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم اور اس ناکارہ کو ہمیشہ ان کی شفقت ومحبت حاصل رہی۔ بارہا دار العلوم میں ان کی تشریف آوری ہوئی۔ یہاں درس وخطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ علمی وعملی کمالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی ذات ہم سب کے لیے بہت بڑا اسہارا تھی۔'' (نقوش رفتگان، ص ۱۳۹)

مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلؒ کی وفات پر تعزیتی شذرہ:

''مولانا ہمارے ملک کے ان ممتاز اور جید علماء میں سے تھے جن کی طرف ملک وملت کے ہر اجتماعی مسئلے میں نگاہیں اٹھتی تھیں۔ وہ دار العلوم دیوبند کے نہ صرف فارغ التحصیل تھے، بلکہ انھوں نے کچھ عرصہ وہاں تدریس کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ تمام دینی علوم پر ان کی بڑی وسیع نگاہ تھی اور بالخصوص فقہ وفتویٰ کے ساتھ خصوصی شغف تھا۔......

قدرت نے مولانا کے ساتھ ایک طویل رفاقت کی سعادت عطا فرمائی۔ صدر ضیاء الحق صاحب کے ابتدائی عہد حکومت میں جب اسلامی نظریاتی کونسل دوبارہ تشکیل دی گئی تو اس میں مولانا بھی رکن بنے اور یہ ناکارہ بھی۔ اس طرح تقریباً تین سال مولانا کے ساتھ دن رات کام کرنے کا موقع ملا۔......

مفتی صاحب سیاسی اور دعوتی معاملات میں مولانا مودودی صاحب مرحوم اور جماعت اسلامی سے نہ صرف متفق بلکہ ان سے آخر تک پوری طرح وابستہ رہے اور اس لحاظ سے ان کا طرز فکر وعمل عام علماء دیوبند سے مختلف تھا۔ اس سلسلے میں وہ جماعت اسلامی کا بڑے زور وشور کے ساتھ دفاع بھی کرتے تھے، لیکن فقہ وعقائد کے معاملے میں بسا اوقات ان کی رائے عام علمائے دیوبند ہی کے ساتھ رہتی اور وہ ان معاملات میں مولانا مودودیؒ سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے تھے۔......مولانا مودودی کی جن آراء شاذہ سے مفتی صاحب کو اختلاف تھا، ان کے باوجود وہ ان کے لٹریچر کو بحیثیت مجموعی نہایت مفید سمجھتے اور لوگوں کو اسے پڑھنے کی تبلیغ بھی فرماتے تھے۔'' (نقوش رفتگان، ص ۲۵۴ تا ۲۵۷)

جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر خورشید احمد صاحب کے قائم کردہ ادارے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز،

اسلام آباد میں گفتگو:

''میں جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی شفقت کی بنا پر مجھے اس ادارے میں قوانین حدود سے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ جناب پروفیسر خورشید صاحب میرے استاد ہیں۔ میں نے ایک مختصر عرصہ سہی، ان سے معاشیات کا درس لیا ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس لیے ان کی فرمائش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور اسی کی تعمیل میں اس وقت میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔'' (''حدود قوانین: موجودہ بحث اور آئندہ لائحہ عمل''، ص ۷)

مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

''یہ ٹھیک ہے کہ یونانی منطق اور فلسفہ سے اشتغال رکھنے والے بہت سے لوگوں نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جو اسلام کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ آپ فارابی کی کوئی کتاب پڑھیں۔ مثلاً اس کی کتاب ہے 'آراء اہل المدینہ الفاضلہ' جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم سیاسی فکر کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلامی تعلیم وعقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ایک اعتبار سے وہ بڑی غیر معمولی کتاب ہے کہ اس نے یونانی علوم وفنون پڑھے اور ارسطو کی Politica یعنی 'سیاسیات' کا ترجمہ اس نے پڑھا۔ شاید افلاطون کی Republic کا بھی ترجمہ دیکھا ہو، لیکن بظاہر اس کے شواہد کم ہیں۔ سیاسیات پر وہ ارسطو کے نقطہ نظر سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی اور کوشش کی کہ ان خیالات کو اسلام سے ہم آہنگ کر کے بیان کرے۔ میرے خیال میں یہ Islamization of Knowledge کی پہلی کوشش تھی۔ یہ داعیہ اس کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ وہ یونانیوں کے خیالات کو اسلام کے مطابق بنائے؟ اس کے دل میں کوئی اسلامی حمیت تھی اور کوئی اسلامی جذبہ تھا تو پیدا ہوا۔ اس اسلامی جذبے نے اس کو ارسطو کے خیالات کو جوں کا توں مسلمانوں میں پیش کرنے سے باز رکھا اور اس حد تک اس کا اسلامی فہم قابل ستائش ہے۔ اس کے مطابق اس نے ایک ایسی چیز کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر لوگوں کی رہنما بنی۔ اس نے اسلام کی سیاسی فکر اور اس کے دستوری تصورات کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ نقل کے معیار کے ساتھ ساتھ عقل کے معیار پر بھی پورا اترے۔ اسی وجہ سے میں ابن سینا اور فارابی کا بڑا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، اس کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے متعارض ہیں۔'' (ماہنامہ ''الشریعہ''، مارچ ۲۰۰۵ء)

مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ کے انتقال پر

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا تعزیتی شذرہ

اس ملک کے دینی حلقوں کے لیے ایک بڑا سانحہ حال میں مولانا عبید اللہ انور مرحوم کے انتقال کی صورت میں پیش آیا۔ مولانا درس وتعلیم قرآن کے اس قدیم سلسلے کے اس وقت سربراہ تھے جو مولانا احمد علی رحمۃ اللہ عیہ کے زمانے سے لاہور میں جاری تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑا ہی مبارک اور وسیع سلسلہ تھا۔ اس کی شہرت میں یو پی میں بھی سنا کرتا تھا۔ بلا مبالغہ ہزاروں انسانوں نے اس حلقہ درس سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی خاص خوبی یہ رہی کہ مولانا احمد علی اور مولانا عبید اللہ انور دونوں نے قرآن کے درس کا کام للہ اور فی اللہ کیا اور بڑے وسیع حلقے میں قرآن مجید کا فیض پہنچایا، لیکن اس زمانے میں قرآن کے نام پر جو دکانیں کھلتی اور پلازے قائم ہوتے ہیں، اس طرح کی کوئی چیز انھوں نے قائم نہیں کی۔

اس حلقہ درس سے متعلق میرے لیے خاص دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ہر چند یہ سلسلہ درس تھا تو اسی معروف طریقے پر جو اس ملک کے پرانے علماء کا طریقہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا احمد علی اور مولانا عبید اللہ انور مرحوم دونوں کے قلب میں بڑی وسعت تھی، اعتدال اور میانہ روی تھی۔ وہ نئے افکار، نئے طرز تحقیق اور فکر وتدبر سے متوحش یا الرجک نہیں تھے، بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ رسالہ ''خدام الدین'' میں ہمارے رسالہ ''تدبر'' پر جب تبصرہ ہوا تو اس کے تحقیقی اور علمی رنگ کو پسند کرتے ہوئے اسے بہر طور لائق مطالعہ قرار دیا گیا اور اہل علم کو اس سلسلہ کی سرپرستی کرنے کی سفارش کی گئی۔ قلب کی یہ وسعت وگنجائش خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ چیز اس توسع اور فراخ دلی کے لیے راستہ کھولے گی جو اس دنیا میں ہم کو بنیان مرصوص بنا سکتی ہے۔

میرے خیال میں اس مکتب فکر کو یہ روشنی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے ورثے میں ملی ہے۔ شاید آپ لوگوں کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ مولانا سندھیؒ میرے استاد مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔ استاد مرحوم ان کا ذکر بڑی محبت سے ''ہمارے مولانا عبید اللہ'' کے الفاظ سے کرتے۔ جب

مولانا سندھی عرب میں تھے تو مولانا فراہی ہندوستان سے جانے والے حجاج کے ذریعے ان سے تعلق رکھتے اور جب وہ خود حج کے لیے گئے تو مولانا سندھی سے وہاں ان کی ملاقاتیں رہیں اور واپسی پر انھوں نے مولانا کے بعض

نہایت موثر واقعات ہمیں بھی سنائے۔ مولانا سندھی جب کبھی اعظم گڑھ تشریف لاتے تو وہ مولانا فراہیؒ کے مہمان ہوتے۔ اسی طرح مجھے ذاتی طور پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ میں ہمیشہ اس مسئلے پر غور کرتا کہ مولانا فراہیؒ اور مولانا سندھی کے سوچنے کے انداز میں بڑا فرق ہے۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے دونوں کو اتنا جگری دوست بنا رکھا ہے۔ واقعات نے مجھے پر یہ واضح کر دیا کہ مولانا فراہی قدر دان تھے مولانا سندھی کے مضبوط کردار، ان کی عزیمت، ان کی استقامت، ان کے استغنا، ان کی شجاعت، فتوت اور خلق سے ان کی بے نیازی کے۔ مولانا سندھی مداح تھے مولانا فراہی کے تفکر وتدبر اور قرآن مجید کے گہرے علم کے۔ اس چیز نے دونوں کی سوچ کا انداز الگ الگ ہونے کے باوجود ان میں گہری محبت پیدا کر دی تھی۔

مولانا فراہی کے انتقال کے بعد بھی مولانا عبید اللہ سندھی ایک مرتبہ مدرسۃ الاصلاح میں تشریف لائے اور مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا۔ رسالہ الاصلاح کے نکالنے کی تاریخ قریب تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا سندھی مدرسے میں تشریف فرما ہوں اور رسالے میں ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس زمانے میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی طاقت ان میں ذرا کم ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے آپ پر مضمون لکھنا ہے، لیکن چھپنے سے پہلے وہ آپ کو دکھاؤں گا نہیں۔ بڑی محبت کے ساتھ ہنس کر کہنے لگے، اچھا بھائی، آپ ایڈیٹر ہیں۔ آپ کو اختیار ہے، نہ دکھایئے۔ میں نے وہ مضمون لکھا اور اس میں مولانا کے افکار سے اپنا اختلاف بھی ظاہر کیا۔ اس کا پروف میں نے مولانا کو دکھایا۔ انھوں نے اسے بڑے انہماک سے پڑھا اور واپس کرتے ہوئے کہا، ''اچھا بھائی، ٹھیک ہے۔'' میرے نزدیک ان کے اندر فکر کی آزادی تھی اور وہ اس کے قدر دان تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے افکار کے علمبردار تھے اور یہ بات معلوم ہے کہ شاہ صاحب کے ہاں بھی فکری آزادی موجود ہے۔ فکر وتدبر کی قدر انھی بزرگوں سے مولانا احمد علیؒ کے خاندان میں بھی ایک اعتدال کے ساتھ منتقل ہوئی ہے اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔

مولانا عبید اللہ انور کے انتقال کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں آخرت میں سرخرو اور فائز المرام کرے۔ میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے صاحب زادوں، رفقاء اور تلامذہ کو توفیق دے کہ وہ ان کے کام کو مزید سرگرمی کے ساتھ جاری رکھیں اور مولانا احمد علی کے شروع کیے ہوئے مبارک سلسلہ درس کا فیض عام جاری رہے۔

(رسالہ ''تدبر''، مئی ۱۹۸۵ء)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی*

مسلک علماء دیوبند کے نادان ترجمان

دارالعلوم دیوبند......ایک ایسی درس گاہ ہے جو ایک صدی سے زیادہ مدت سے اسلامی علوم کی تعلیم کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس دوران اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی تعداد عجب نہیں کہ لاکھوں میں ہو۔ اس کے علاوہ بعد میں برصغیر کے اندر ہزارہا ایسے دینی مدارس قائم ہوئے جو سب اپنا سرچشمہ فیض دارالعلوم دیوبند کو قرار دے کر اس سے اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اور ان کے فضلاء کو بھی عرف عام میں ''علمائے دیوبند'' ہی کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ان درس گاہوں سے لاکھوں کی تعداد میں فارغ التحصیل ہونے والوں میں سے ہر فرد کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ''مسلک علماء دیوبند'' کا صحیح ترجمان ہے۔ کوئی بھی باقاعدہ درس گاہ جو کسی خاص نصاب و نظام یا نظم وضبط کی پابند ہو، وہ اپنے زیر تعلیم افراد کی خدمت اسی حد تک انجام دے سکتی ہے اور ان کی نگرانی اسی حد تک کر سکتی ہے جس حد تک اس کے لگے بندھے قواعد وضوابط اجازت دیں، لیکن وہ ایک ایک طالب علم کے بارے میں اس بات کی مکمل نگرانی نہیں کر سکتی کہ تنہائی میں اس کے دل ودماغ میں کیا خیالات پرورش پا رہے ہیں اور وہ کن خطوط پر آگے بڑھنے کو سوچ رہا ہے۔ بالخصوص درس گاہ سے ضابطے کا تعلق ختم ہونے کے بعد تو اس قسم کی نگرانی کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔

چنانچہ ان درس گاہوں سے کچھ ایسے حضرات بھی نکل کر میدان عمل میں آئے ہیں جو تعلیمی حیثیت سے بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب ہیں، لیکن انھیں اکابر علمائے دیوبند کا مسلک ومشرب یا ان کا وہ متوارث مزاج ومذاق جو صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا، ٹھیک ٹھیک حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لحاظ سے وہ مسلک علمائے دیوبند کے ترجمان نہیں تھے، لیکن تعلیمی طور پر دارالعلوم دیوبند یا اس کی فیض یافتہ کسی اور درس گاہ سے منسوب ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے انھیں مسلک علماء دیوبند کا ترجمان سمجھ لیا اور ان کی ہر بات کو بھی علمائے دیوبند کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔

ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی تھے جو علمائے دیوبند کے بعض عقائد وافکار کی نہ صرف تردید ومخالفت کرتے رہے، بلکہ ان کو گمراہی تک قرار دیا اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلک علماء دیوبند کا ترجمان بھی کہتے رہے۔ بعض حضرات نے اپنے ذاتی افکار کو علمائے دیوبند کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔ بعض نے مسلک علماء دیوبند کے جامع

---

*نائب صدر دارالعلوم کراچی۔

اور معتدل ڈھانچے سے صرف کسی ایک جزو کو لے کر بس اسی جزو کو ''دیوبندیت'' کے نام سے متعارف کرایا اور اس کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔

مثلاً بعض حضرات نے یہ دیکھ کر کہ حضرات اکابر علمائے دیوبند نے ضرورت کے وقت ہر باطل نظریے کی مدلل تردید کر کے اپنا فریضہ ادا فرمایا ہے، بس اسی تردید کو علمائے دیوبند کا مسلک قرار دے لیا اور اپنے عمل سے تاثر یہ دیا کہ مسلک علمائے دیوبند صرف ایک منفی تحریک کا نام ہے جس کے نصب العین میں دین کے مثبت پہلو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ پھر باطل نظریات کی تردید میں بھی مختلف نظریات نے مختلف میدان عمل طے کر لیے جو تقسیم کار کی حد تک تو درست ہو سکتے تھے، لیکن بعض حضرات نے ان میں مبالغہ کر کے مسلک علمائے دیوبند کے صرف اپنے میدان عمل کی حد تک محدود ہونے کا تاثر دیا۔ بعض حضرات نے باطل کی تردید کے اصول کو تو اختیار کر لیا، لیکن تردید کے طریقے میں اکابر علماء دیوبند نے جن اصولوں کی پیروی فرمائی تھی، ان کی طرف کماحقہ التفات نہیں کیا اور بعض حضرات کے طرز عمل سے کچھ ایسا تاثر قائم ہوا کہ مسلک علمائے دیوبند بھی (خدانخواستہ) ان ہی دھڑے بندیوں کا ایک حصہ ہے جو دنیا میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں اور جن کا مسلک یہ ہے کہ اپنے دھڑے کے ہر آدمی کی ہر خطا بھی معاف اور قابل دفاع ہے اور باہر کے آدمی کی ہر نیکی بھی دریابرد کرنے کے لائق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''مسلک علمائے دیوبند'' ان تمام بے اعتدالیوں سے بری ہے اور یہ ایسے حضرات کی طرف سے منظر عام پر آئی ہیں جو ضابطے کی تعلیم کے لحاظ سے خواہ دارالعلوم دیوبند یا اس کے منتسب اداروں میں سے کسی ادارے سے وابستہ رہے ہوں، لیکن مسلک ومشرب اور مزاج ومذاق میں اکابر علمائے دیوبند کے ترجمان نہیں تھے اور نہ انھوں نے یہ مزاج ومذاق اس متوارث طریقے پر حاصل کیا تھا جو اس کے حصول کا صحیح طریقہ ہے۔

(ماخوذ از پیش لفظ ''علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' از مولانا قاری محمد طیبؒ)

''دار العلوم کا مزاج ابتدا ہی سے بین الاقوامی ہے۔ اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات و اجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا۔...... آج دار العلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم کو آشکارا کیا جائے۔ نیز اسلام پر وارد کیے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔ ...... ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کے لیے آپ حضرات کے مشورہ وتعاون سے ان تبلیغی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مقاصد کی تعلیم کا کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی پشت پر سارے اسلامی منطقوں کی اجتماعی قوت کارفرما ہو جس سے یہ دینی مقاصد اجتماعی انداز سے دنیا کے سامنے آسکیں اور عام مسلمانوں کی زندگیوں پر کوئی عملی اثر ڈال سکیں اور وہ ایمانی اخوت، باہمی تعاون، علمی اشتراک اور فکری یکسانی ہمت کے ساتھ اجتماعی عزائم وخدمات کو بروئے کار لاسکیں۔...... حالات وقت کے پیش نظر جامعہ دار العلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امت مسلمہ، اسلام کے علمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے، اسے اجتماعی بنائیں تاکہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔''

(دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس (فروری ۱۹۸۰ء) میں مولانا قاری محمد طیبؒ کا خطبہ استقبالیہ)

'الشریعہ' کی پالیسی اور
مولانا زاہد الراشدی کا طرزِ فکر

مولانا مفتی محمد زاہد*

صدرِ اول میں فقہ اسلامی کا ارتقا

باہمی استفادہ اور مباحثہ ومکالمہ کا کردار

دوسری صدی ہجری میں فقہ اسلامی کے ارتقا میں ایک چیز جس نے بڑا اہم کردار ادا کیا، وہ اس دور کے مختلف فقہی مکاتب فکر بالخصوص حجازی مکتب فکر اور عراقی مکتب فکر کا باہمی ملاپ، ربط اور ایک دوسرے سے استفادے کا سلسلہ تھا۔ امام ابوحنیفہ کو ابن مسعود کے مکتب فکر کی اہم شخصیات سے استفادہ کرنے کے بعد بعض سیاسی حالات کے تحت تقریباً چھ سال کا عرصہ مکے میں گزارنا پڑا۔ اس دوران میں آپ کو حجاز کی نمایاں شخصیات سے بھی استفادے کا موقع ملا اور حرمین شریفین کی وجہ سے عالم اسلام کے دوسرے حصوں سے وہاں آنے والے علماء سے بھی۔ خود امام صاحب سے مختلف خطوں کے کئی لوگوں نے باقاعدہ تلمذ یا علمی مذاکرے کی صورت میں استفادہ کیا۔ مثال کے طور پر حجاز کی ایک اہم علمی شخصیت اور معروف تابعی عطاء بن ابی رباح سے استفادہ اور عطاء کا آپ کو خاص اہمیت دینا تو معروف ومشہور ہے۔ (موفق بن احمد مکی، **مناقب الامام الاعظم ابی حنیفة**، ج۱،ص۸۸) حجاز ہی کی ایک اور معروف شخصیت ابن جریج کے ساتھ بھی آپ کے علمی مذاکرے ہوئے۔ (ایضاً، ج۱،ص۸۷) امام مالک سے آپ کی ملاقاتیں اور علمی مذاکرے بھی کسی ثبوت اور تعارف کے محتاج نہیں۔ بعض اوقات دونوں حضرات کی باہمی علمی گفتگو عشاء کے بعد شروع ہوتی اور فجر تک جاری رہتی۔ (ایضا، ج۲،ص۱۶۴) امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے اس باہمی ربط اور استفادے کی بنیاد پر ہی بعض متاخرین نے دونوں کو ایک دوسرے کے مشائخ یا تلامذہ میں بھی شمار کیا ہے۔ (الخیرات الحسان، ص۲۳) یہ درحقیقت ایک دوسرے سے باقاعدہ تلمذ نہیں تھا، بلکہ علمی مذاکروں کے دوران کیا گیا باہمی استفادہ تھا۔ حجاز ہی کی ایک اور معروف علمی شخصیت ربیعۃ الرای جب کوفہ آئی تو انھوں نے امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے ساتھ بعض مسائل پر

---

* شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد۔

گفتگو کی۔ (مناقب الامام الاعظم، ج۱ص۱۰۵)

مصر کے امام اور فقیہ لیث بن سعد کو بعض حضرات نے امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ (احمد رضا بجنوری، مقدمہ انوار الباری، ج ۱ص۲۱۹) اگر باقاعدہ تلمذ نہ بھی ہو، ان کی باہمی ملاقاتیں اور علمی مذاکرے تو بہرحال معروف ہیں۔ ان کی امام صاحب سے سب سے پہلی ملاقات مکہ مکرمہ ہی میں ہوئی اور آپ کی ذہانت اور حاضر جوابی سے متاثر ہوئے۔ (ذہبی، **مناقب الامام ابی حنیفة و اصحابه**، ص۱۲۲) اس کے بعد ان کا یہ معمول رہا کہ جب بھی انھیں علم ہوتا کہ امام ابوحنیفہ حج کے لیے آ رہے ہیں تو یہ بھی اس سال سفر حج کرتے تا کہ آپ سے ملاقات اور علمی استفادہ ہو سکے۔ (مقدمہ انوار الباری، ج۱ص۲۱۹)

امام مالک کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے شہروں سے مدینہ منورہ آنے والی علمی شخصیات سے ملاقات اور علمی مذاکرے اور مباحثے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دوسرے شہر کی علمی شخصیت کا عموماً مطلب ہوتا تھا دوسرے فقہی ذوق سے تعلق رکھنے والی شخصیت۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ آپ کی علمی مجالس کا ذکر تو آ چکا ہے، اسی طرح امام اوزاعی جب مدینہ منورہ آئے تو امام مالک باقاعدہ ان سے ملنے گئے اور ایک طویل علمی مجلس ہوئی جس میں کئی مسائل زیر بحث آئے۔ (ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، ج۱ص۱۸۸)

اس طبقے کے بعد اگلے طبقے میں بھی یہی روح اور مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس طبقے کے مشائخ کے تلامذہ نے اپنے شیوخ سے استفادے یا ان کے انتقال کے بعد دوسرے علمی مراکز اور مناہج فکر سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات سے استفادہ کیا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کا امام ابوحنیفہ کے بعد مشائخ حجاز، بالخصوص امام مالک سے استفادہ مشہور و معروف ہے۔ اسی طرح اسد بن الفرات کا مدینہ منورہ میں امام مالک وغیرہ سے علم حاصل کرنے کے بعد کوفے جانا اور امام محمد وغیرہ سے استفادہ کرنا اور اس کے بعد مصر کا رخ کرنا اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ امام شافعی جو بنیادی طور پر مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی علمی اٹھان بھی اہل حجاز کے علمی وفقہی ذوق کی بنیاد پر ہوئی تھی، ان کا امام محمد اور دیگر مشائخ عراق سے استفادہ کرنا بھی اس دور کے عمومی ماحول اور مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ امام شافعی سے منقول ہے کہ وہ لیث بن سعد سے استفادہ نہ کر سکنے پر اظہار افسوس کیا کرتے تھے۔ (مقدمہ انوار الباری ج۱ص۲۱۹) (امام شافعی مصر میں لیث بن سعد کی وفات کے بعد آئے تھے)۔

سلف میں کسی کے فقہ وافتاء میں کمال کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ اسے دوسرے فقہی مدارس اور شخصیات کے نقطہ ہائے نظر سے بھی واقفیت ہو، چنانچہ قتادہ کہا کرتے تھے کہ جس شخص کو اختلاف علماء کا علم نہیں، اس نے فقہ کی مہک ہی نہیں سونگھی۔ ہشام بن عبداللہ رازی کا مقولہ ہے کہ جو شخص اختلاف قراءت سے واقف نہیں، وہ قاری نہیں ہے اور جو شخص اختلاف فقہاء سے واقف نہیں، وہ فقیہ نہیں۔ عطاء کا کہنا ہے کہ جب تک آدمی کو لوگوں (اہل علم) کے اختلاف کا علم نہ ہو، اس وقت تک اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ ایوب سختیانی اور سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے کہ فتوے کے معاملے میں زیادہ جسارت کرنے والا شخص وہ ہے جسے اختلاف علماء کا علم کم ہوتا ہے۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ

فتویٰ دینا صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جسے یہ معلوم ہو کہ کس کس مسئلے میں علماء کا کیا اختلاف ہوا ہے۔ (شاطبی، الموافقات، ج ۴، ص ۸۶)

امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے درمیان جو فقہی مباحث ہوئے، ان کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ایک دوسرے کو اپنی رائے کا قائل کرنے کی بجائے دوسرے کی رائے اور دلیل واصل شرعی معلوم کرنا ہوتا تھا، چنانچہ طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ ابن الدراوردی سے دونوں بزرگوں کے درمیان مباحثے کا جو انداز نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے:

''جب ان میں سے ایک صاحب دوسرے کے اس قول سے پوری طرح واقف ہو جاتے جس کے وہ قائل ہیں اور جس پر ان کا عمل ہے تو دوسرے کو غلط قرار دیے بغیر اور تکلف میں پڑے بغیر اس موضوع بحث کو بند کر دیتے تھے۔'' (موفق، مناقب الامام الاعظم، ج ۲، ص ۱۶۴)

درحقیقت اپنے یا کسی خاص حلقے کی اجتہادی آراء اور نتائج فکر و بحث تک اپنے علم کو محدود رکھنے کی بجائے دوسرے حلقہ ہائے اجتہاد اور نقطہ ہائے نظر سے واقفیت کے کئی فوائد ہوتے ہیں:

سب سے پہلا اور بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان یا انسانوں کا کوئی خاص گروہ اور طبقہ خواہ کتنی بھی اعلیٰ علمی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے کام میں بہتری کی گنجائش بہر حال ہر وقت موجود رہتی ہے۔ بسا اوقات کسی کی نظر وہاں نہیں پہنچتی جہاں دوسرے کی پہنچ جاتی ہے۔ فقہ اسلامی میں ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ جب ایک فقیہ کو دوسرے فقیہ کے کسی ایسے قول اور اس کی دلیل کا علم ہوا وج اس کی نگاہ میں اس کے اپنے قول کے مقابلے میں زیادہ صائب تھا تو اس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ امام ابوحنیفہ کے ہاں اگرچہ کھلی مشاورت اور بحث وتدقیق کے بعد مسئلہ طے ہوا کرتا تھا، تب بھی وہ اس میں خطا کا امکان اور مزید بہتری کی ضرورت اور گنجائش محسوس کیا کرتے اور کہا کرتے تھے: ''ہمارا یہ علم رائے (اور اجتہاد) ہے اور یہ سب سے بہتر بات ہے جس تک ہم پہنچ سکے ہیں۔ جو ہمارے پاس اس سے بہتر بات لے کر آئے گا، ہم اسے قبول کر لیں گے۔'' (ذہبی، مناقب الامام ابی حنیفة واصحابه، ص ۲۱)

دوسرا فائدہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات خاص موقع ومحل کی رعایت سے کسی دوسرے فقیہ کے قول پر عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ واقفیت ایسے مواقع پر کام آتی ہے۔ فقہاء کے ہاں اس کی کئی مثالیں ملتی ہے۔ مثلاً ایک مقدمے میں جب امیر المومنین کی طرف سے گواہ پیش ہوئے تو امام ابو یوسف نے کہا کہ امیر المومنین سے اس بات پر قسم بھی لی جائے گی کہ ان کے گواہوں نے سچی گواہی دی ہے، حالانکہ امام ابو یوسف کا اپنا یہ مذہب نہیں تھا۔ یہ ابن ابی لیلیٰ کی رائے تھی، لیکن یہاں چونکہ قرائن سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ شاید گواہوں نے خلیفہ کی رعایت کر کے غلط بیانی سے کام لیا ہو، اس لیے امام ابو یوسف نے یہاں ابن ابی لیلیٰ کے قول کو اختیار کر لیا۔ (خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۱۴، ص ۲۴۹)

تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی ربط نہ ہونے اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر اور اس کے دلائل سے عدم واقفیت کی وجہ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں توانائیوں کا ایک حصہ جو ایک دوسرے کی بے جا مخالفت وغیرہ کی

شکل میں بے ثمر سرگرمیوں کی نذر ہو جاتا ہے، اس سے انسان بچ جاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں اور تیسری صدی کے اوائل میں مختلف فقہی مکاتب فکر کے درمیان ربط اور باہمی استفادے کا جو سلسلہ تھا، اس کی کچھ جھلک اوپر کی سطور میں دیکھی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود جہاں جہاں ایک دوسرے کو پورے طور پر سمجھا نہیں گیا، وہاں غلط فہمیاں بلکہ محاذ آرائیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ امام احمد، امام شافعی کے اہل علم پر احسانات شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہم اہل رائے کو برا بھلا کہتے رہے اور وہ ہمیں، یہاں تک کہ شافعی آئے اور انھوں نے ہم دونوں کو جمع کر دیا۔'' (ظفر احمد عثمانی، مقدمہ اعلاء السنن، ج ۱، ص ۲۳۵)

آج بھی فقہ اسلامی کو دوسری صدی ہجری سے ملتے جلتے چیلنجوں کا سامنا ہے اور الحمد للہ عالم اسلام میں کئی فقہاء ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مصروف کار ہیں۔ ان کے اذواق اور مناہج اجتہاد میں فرق بھی ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی طرف بڑھنے کے لیے پچھلے صفحات میں اس ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے قدم کے طور پر اس اختلاف منہج وذوق کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور اسے باعث رحمت بھی سمجھا جائے۔ دوسرا قدم اس منزل کی طرف یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر منہج فکر اور حلقہ فقہ **کل فی فلک یسبحون** کا مصداق بن کر اپنے اپنے خول میں بند رہے، ان کے درمیان ربط وتعلق ہو۔ ایک دوسرے کے فکری وفقہی کام سے واقف ہوں اور اس سے استفادہ کریں۔ جس طرح اس دور کے فقہاء نے فقہ وافتاء میں کمال اور اجتہاد کے لیے دیگر مدارس فقہ کے اقوال سے واقفیت کو ضروری قرار دیا تھا، اسی طرح آج کے علماء وفقہاء کے لیے بھی دیگر مکاتب فکر کی آراء سے واقفیت ضروری ہے۔ عالم اسلام میں ہونے والے فقہی واجتہادی کاموں اور ان کے نتائج فکر سے آگاہی کے بغیر نہ تو کسی کے فقہی واجتہادی کام میں کمال اور جان پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اجتماعی فقہی کاوشوں کی راہ ہی ہموار ہو سکتی ہے۔ آج ذرائع مواصلات کی ترقی نے ایک دوسرے سے استفادے کے اس کام کو آسان بنا دیا ہے۔

مثبت اور ثمر آور مکالمے کا اہتمام

دوسری صدی ہجری میں فقہ اسلامی کے ارتقائی سفر کو تیز کرنے والی دوسری اہم چیز فقہی واجتہادی مسائل میں ایک ہی فقہی ذوق رکھنے والے اور مختلف فقہی سلسلوں سے منسلک فقہاء کے درمیان بامقصد اور صواب طلبی کی نیت پر مبنی مباحثے اور مکالمے کا سلسلہ تھا۔ یہ سلسلہ عصر صحابہ ہی میں شروع ہو گیا تھا، بلکہ اس کی اساس عہد نبوی میں ہی ڈال گئی تھی۔ معروف شارح موطا زرقانی لکھتے ہیں:

> ''مناظرہ اور دلیل وحجت طلب کرنا صحابہ کے قدیم زمانے سے ہی چلا آ رہا ہے۔ اس کا انکار صرف جاہل ہی کر سکتا ہے اور یہ کہ بڑے کو چاہیے کہ اگر چھوٹے کے پاس علم ہو تو اسے بولنے سے منع نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات انسان عمر میں چھوٹا ہوتا ہے، لیکن علم میں بڑا ہوتا ہے۔'' (زرقانی، شرح الموطا، ج ۳، ص ۲۲۲)

حضرت عمر بن عبد العزیز کا ارشاد ہے: رایت ملاحاۃ الرجال تلقیحا لالبابھم (میری رائے ہے کہ آدمیوں

کا باہمی مباحثہ ان کی عقلوں کی بار آوری کا ذریعہ ہوتا ہے)۔(ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفصلہ، ج ۲، ص ۱۰۸) اسی طرح امام مالک نے عمر بن عبدالعزیز کا قول نقل کیا ہے کہ: **ما رایت احدا لاحی الرجال الا اخذ بجوامع الکلم** (میں نے دیکھا ہے کہ جو شخص بھی مباحثہ کرتا ہے، وہ ضرور جامع باتیں حاصل کر لیتا ہے)۔(ایضاً)

اس دور کے بعد بھی فقہی حلقوں میں مباحثے اور مکالمے کا یہ اہتمام جاری رہا، بالخصوص عراق کے فقہی حلقے تو اس حوالے سے خاصے معروف تھے، حتیٰ کہ اہل عراق کو اس دور کے علمی حلقوں میں ارایتیون کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ فقہائے عراق میں سے امام ابوحنیفہ کو مباحثے کی اہمیت وافادیت کا خاص ادراک تھا، اس لیے آپ نے اسے ایک طرف پیش آمدہ مسائل کے مشاورتی واجتماعی حل کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف نوخیز فقہاء کو اجتہاد کی تربیت دینے اور ان کی علمی وفکری صلاحیتوں کو جلا دینے کا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ نے باقاعدہ ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جس میں اس طرح کے مسائل زیر بحث آتے تھے اور مسئلے کے ہر پہلو پر پوری بحث وتمحیص کے بعد کوئی فیصلہ کیا جاتا تھا۔......

اس حلقے کی سب سے اہم بات جسے یہاں ذکر کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں مسئلے پر آزادانہ بحث کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سفیان بن عیینہ نے دیکھا کہ امام صاحب کے اردگرد آپ کے تلامذہ کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہیں اور ان کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے امام صاحب سے کہا کہ آپ انھیں مسجد میں آواز بلند کرنے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب نے کہا ''انھیں کچھ نہ کہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ لوگ فقہ میں کمال حاصل نہیں کر سکتے۔'' (ذہبی، مناقب الامام ابی حنیفۃ واصحابہ، ص ۲۱) یہی نکتہ ہے جس کے پیش نظر امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب العلم میں مستقل باب قائم کیا ہے: **باب رفع الصوت بالعلم**۔

ایک دفعہ ایک نوجوان نے امام ابوحنیفہ سے دوران مجلس کوئی بات پوچھی۔ امام صاحب نے اس کا جواب دیا۔ اس نوجوان نے فوراً کہا: **اخطات** (آپ کی یہ بات درست نہیں ہے)۔ اس پر نو وارد شخص کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ اس نوجوان کو استاذ کے احترام کے بارے میں کچھ کہنے لگا تو امام صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اسے چھوڑ دیجیے۔ میں نے اپنے بارے میں قصداً انھیں اس کا عادی بنایا ہے۔'' (مناظر احسن گیلانی، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۲۲۸) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امام صاحب جہاں آزادی کے ساتھ بحث کو ضروری خیال کرتے تھے، وہاں بحث میں نظم وضبط کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ آپ کو ایک مرتبہ بتایا گیا کہ یہاں ایک حلقہ ہے جس میں لوگ فقہ کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں تو امام صاحب نے پوچھا: ''کیا ان کا کوئی سربراہ بھی ہے؟'' جب جواب نفی میں دیا گیا تو آپ نے فرمایا ''یہ لوگ کبھی فقیہ نہیں بن سکتے۔'' (موفق، مناقب الامام الاعظم، ج ۲، ص ۹۱)

امام ابوحنیفہ اسے تعلیم وتربیت کا ایک لازمی اور ضروری حصہ سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اس طرح کے سوال وجواب اور اجتماعی مباحثے (group discussion) کے بغیر اہل علم میں اجتہاد وتفقہ کا ملکہ اور خود سوچنے اور غور کرنے کی عادت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ امام صاحب نے جس طرح اپنے پیش رو تابعین کے بارے میں کہا تھا: **ھم رجال ونحن رجال**، اسی طرح وہ یہ روح اپنے تلامذہ کے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسائل میں جتنا

اختلاف امام صاحب کے تلامذہ نے ان سے کیا ہے، کسی اور کے تلامذہ نے نہیں کیا ہوگا اور جو مقام بعد میں امام صاحب کے تلامذہ کو حاصل ہوا ہے، وہ بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ امام صاحب کے اسی طریق کار کا یہ اثر تھا کہ امام شافعی نے کہا کہ جس شخص سے بھی میں نے بحث کی، بحث کے دوران میں اس کے چہرے پر ناگواری کا اثر ضرور آیا، سوائے محمد بن الحسن کے۔ (ذہبی، **مناقب الامام ابی حنیفۃ**، ص ۴۸)

بحث ومناظرہ کا یہ سلسلہ اگلے طبقات میں بھی چلتا رہا ہے۔ امام مالک کے تلامذہ میں سے امام شافعی کی شخصیت اس حوالے سے خاصی معروف ہے۔ بقول زاہد الکوثری انھوں نے امام محمد بن الحسن سے اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ (بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی، ص ۲۲)

اس دور میں مباحثوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل جو بظاہر محدثین کے مزاج کے زیادہ قریب ہیں اور فضول بحث ومباحثے سے ظاہر ہے کہ بہت گریزاں ہوں گے، ان کے بارے میں ابو العباس الساجی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ اپنے اور امام احمد کے درمیان ہونے والے مناظروں کے دوران میں ان سے سنا کہ ابوعبداللہ الشافعی نے یوں کہا ہے۔ (ابونعیم اصفہانی، حلیۃ الاولیاء، ج ۹، ص ۱۰۰)

حاصل کلام یہ ہے کہ اس دور کے علمی وفقہی ماحول کا اہم عنصر ایک ہی مکتب فکر یا مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان بامقصد مباحثہ اور مکالمہ تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے قول کے مطابق اس چیز نے ذہنوں کو زیادہ بارآور کر دیا تھا۔ آج بھی اگر فقہ اسلامی کی فعالیت اور حرکیت میں اضافہ کرنا ہے اور اس میں ہر دور کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی جو صلاحیت موجود ہے، اسے زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانا ہے تو باہمی مکالمے اور مباحثے کی اس روح کو زیادہ سے زیادہ فعال کرنا ہوگا، بلکہ اجتماعی فقہی غور وفکر کی روح ہی اس طرح کا مکالمہ ومباحثہ ہے۔ آج ترقی یافتہ میڈیا کے دور میں یہ کام پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

علمی وفکری مباحثہ کی ضرورت اور 'الشریعہ' کی پالیسی

[مولانا زاہد الراشدی کی منتخب تحریریں]

[الشریعہ کی سترہویں جلد (۲۰۰۶ء) کے آغاز کے موقع پر ''کلمہ حق'' سے اقتباس]

بحمد اللہ تعالیٰ زیر نظر شمارے کے ساتھ ہم 'الشریعہ' کی سترہویں جلد کا آغاز کر رہے ہیں۔ آج سے کم وبیش سولہ سال قبل اکتوبر ۱۹۸۹ء میں 'الشریعہ' نے ماہوار جریدے کے طور پر اپنا سفر شروع کیا تھا اور اتار چڑھاؤ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے یہ دینی وفکری ماہنامہ اپنی موجودہ شکل میں قارئین کے سامنے ہے۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے اس ترجمان کی ابتدا اس عزم کے ساتھ ہوئی تھی کہ دور حاضر کے مسائل اور چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات واحکام کو جدید اسلوب اور تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، عالم اسلام کے علمی ودینی حلقوں کے درمیان رابطہ ومفاہمت کے فروغ کی راہ ہموار کی جائے گی، اسلام دشمن لابیوں اور حلقوں کے تعاقب اور نشان دہی کا فریضہ انجام دیا جائے گا اور دینی حلقوں میں فکری بیداری کے ذریعے سے جدید دور کے علمی وفکری چیلنجز کا ادراک واحساس اجاگر کیا جائے گا۔ ان مقاصد کی طرف ہم کس حد تک پیش رفت کر پائے ہیں، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ ہمارے لیے یہ بات بہرحال اطمینان بخش ہے کہ یہ اہداف ومقاصد بدستور ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور ہم اپنی بساط اور استطاعت کی حد تک ان کے لیے مسلسل مصروف عمل ہیں۔

اس دوران میں ہماری بھرپور کوشش رہی ہے کہ پیش آمدہ مسائل پر دینی حلقوں میں بحث ومباحثہ کا ماحول پیدا ہو اور کسی بھی مسئلہ پر اپنا موقف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کا موقف اور دلائل بھی حوصلہ اور اطمینان کے ساتھ سننے اور پڑھنے کا مزاج بنے، کیونکہ اس کے بغیر کسی مسئلہ پر صحیح رائے اور نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں تحقیق، مطالعہ، مباحثہ اور مکالمہ کی روایت ابھی تک جڑ نہیں پکڑ سکی اور چند شخصیات کے استثنا کے ساتھ عمومی ماحول یہی ہے کہ دلائل کی روشنی میں رائے قائم کرنے کے بجائے رائے قائم کر کے اس کے لیے دلائل تلاش کیے جاتے ہیں۔ ہماری کوشش رہی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ رہے گی کہ دینی حلقوں، بالخصوص علماء کرام اور طلبہ کو دنیا کے معروضی حالات اور حقائق سے آگاہی حاصل کرنے اور آج کے معاصر علمی وفکری حلقوں کے موقف، دلائل اور طرز استدلال سے شناسا ہونے کے لیے آمادہ کیا جائے اور انھیں اس ضرورت کا احساس دلایا جائے کہ آج کی دنیا سے

بات کرنے کے لیے آج کی زبان اور اسلوب پر دسترس ناگزیر ہے اور ہم ماضی کے اسلوب اور طرز استدلال کے ذریعے سے آج کی دنیا تک اسلام کا پیغام اور تعلیمات پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

یہ بات بھی ہمارے ایجنڈے کا حصہ چلی آ رہی ہے کہ جدید اسلوب اور طرز استدلال کی طرح ابلاغ کے جدید ذرائع اور تکنیک تک دینی حلقوں اور علماء کرام کی رسائی بھی انتہائی ضروری ہے اور ہم اس ضرورت کی طرف دینی حلقوں کو مسلسل توجہ دلا رہے ہیں۔

ہم وہی بات کہہ رہے ہیں جو تین صدیاں قبل حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمائی تھی کہ آنے والے دور میں دین کو صحیح طور پر پیش کرنے کے لیے عقلی استدلال کے ہتھیار سے کام لینا ہوگا اور فکری جمود کے دائرے سے نکل کر کھلے دل ودماغ کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ بات تین سو سال قبل کے ماحول میں فرمائی تھی اور ہم اسی بات کو تین سو سال کے بعد آج کے حالات اور تناظر میں دینی حلقوں اور ارباب علم ودانش کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے بعض دوستوں کو ہمارا کہنے کا انداز حضرت شاہ صاحب سے مختلف دکھائی دے، مگر مقصد اور ہدف کے اعتبار سے ہم وہی کچھ عرض کر رہے ہیں جو تین صدیاں قبل امام ولی اللہ دہلویؒ پورے شرح وبسط کے ساتھ تحریر فرما چکے ہیں۔

ہمارا طریق کار یہ رہا ہے کہ بعض مسائل کو ہم از خود چھیڑتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہمارا موقف بھی وہی ہو جو کسی مسئلہ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے 'الشریعۃ' کے صفحات میں پیش کیا گیا ہے، مگر ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دینی حلقوں کے ارباب فکر ودانش اس طرف توجہ دیں، مباحثہ میں شریک ہوں، اپنا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کریں، جس موقف سے وہ اختلاف کر رہے ہیں، اس کی کمزوری کو علمی انداز سے واضح کریں اور قوت استدلال کے ساتھ اپنے موقف کی برتری کو واضح کریں، کیونکہ اب وہ دور نہیں رہا کہ کسی مسئلہ پر آپ اپنی رائے پیش کر کے اس کے حق میں چند دلائل کا تذکرہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جائیں کہ رائے عامہ کے سامنے آپ کا موقف واضح ہو گیا ہے اور آپ کی بات کو قبول کر لیا جائے گا۔ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے، تجزیہ واستدلال کا دور ہے اور معروضی حقائق کی تفصیلات وجزئیات تک رسائی کا دور ہے۔ آپ کو یہ سارے پہلو سامنے رکھ کر اپنی بات کہنا ہوگی اور اگر آپ کی بات ان میں سے کسی بھی حوالے سے کمزور ہوگی تو وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے گی۔ ہم جب کسی مسئلے پر بحث چھیڑتے ہیں تو امکانی حد تک اس کے بارے میں تمام ضروری پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہمارا مقصد ہوتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ 'الشریعۃ' میں شائع ہونے والے کسی موقف کے حق میں یا اس کے خلاف موصول ہونے والا کوئی مضمون یا مراسلہ اشاعت سے رہ نہ جائے اور اس بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

اس صورت حال سے بعض دوستوں کو الجھن ہوتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں یہ الجھن عام طور پر دو وجہ سے ہوتی ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ بہت سے دوست ہمارے اس طریق کار اور مقصد کو سمجھ نہیں پاتے جس کا سطور بالا میں تذکرہ ہو چکا ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ ہمارے خاندانی پس منظر کے باعث بہت سے دوست 'الشریعۃ' کو ایک مسلکی جریدہ کے طور پر دیکھنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے مسلک ومشرب کا

تعلق ہے، ہم نے سولہ برس قبل 'الشریعۃ' کے پہلے شمارے میں ہی یہ بات دوٹوک طور پر واضح کر دی تھی کہ ہم اہل السنۃ والجماعۃ میں سے ہیں اور اہل سنت کے مسلمات کی پابندی کو اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم فقہی مذہب کے لحاظ سے حنفی ہیں اور فروع واحکام میں حنفی مذہب کے اصول اور تعبیرات کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ مسلک ومشرب کے حوالے سے دیوبندی ہیں اور اکابر علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی جدوجہد اور افکار سے راہ نمائی حاصل کرنا اپنے لیے باعث سعادت تصور کرتے ہیں، لیکن 'الشریعۃ' کو مسلکی ترجمان کے طور پر ہم نے کبھی پیش نہیں کیا۔ مسلک کی ترجمانی کے لیے ملک میں درجنوں جرائد موجود ہیں اور ہم بھی اس مقصد کے لیے ان سے حتی الوسع تعاون کرتے ہیں، مگر ہمارا عملی میدان اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری تگ وتاز کا دائرہ فقہی اور مسلکی کشمکش نہیں، بلکہ مغرب کے فکر وفلسفہ اور تہذیب وثقافت کی وسیع تر یلغار کے تناظر میں اسلامی تعلیمات واحکام کو جدید زبان اور اسلوب میں پیش کرنا ہے۔ اس کا مطلب فقہی اور مسلکی جدوجہد کی ضرورت سے انکار نہیں بلکہ یہ ایک تقسیم کار ہے کہ دینی جدوجہد کا یہ شعبہ ہم نے اپنی جدوجہد کے لیے مختص کر لیا ہے اور اسی میں اپنی صلاحیتیں صرف کرنا چاہتے ہیں۔

بعض دوستوں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ 'الشریعۃ' میں بسا اوقات ایک ہی مسئلہ پر متضاد مضامین شائع ہوتے ہیں اور بعض مضامین اہل سنت، حنفیت اور دیوبندیت کے حوالوں سے روایتی موقف سے متصادم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے، مگر اس کی وجہ وہی ہے جس کا سطور بالا میں ہم تذکرہ کر چکے ہیں کہ ہم علمی وفکری مسائل میں ارباب علم ودانش کو بحث ومباحثہ کے لیے کھلا ماحول اور فورم مہیا کرنا چاہتے ہیں اور دینی حلقوں میں باہمی مکالمہ کا ذوق بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریق کار ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا، تاہم اب اسے قدرے محدود اور معین ومتشخص کیا جا رہا ہے، اس طور پر کہ 'الشریعۃ' کے ہر شمارے کے ایک تہائی صفحات اس طرح کے کھلے مباحثے کے لیے مخصوص کیے جا رہے ہیں جن میں کسی بھی اہم مسئلہ پر مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے جائیں گے اور کسی بھی نقطہ نظر کی حمایت یا مخالفت میں موصول ہونے والا ہر وہ مضمون شامل اشاعت ہوگا جو طعن وتشنیع اور مناظرانہ موشگافیوں سے گریز کرتے ہوئے افہام وتفہیم کے سنجیدہ اور علمی اسلوب میں تحریر کیا گیا ہو۔ [الشریعہ، جنوری ۲۰۰۶ء]

علمی مسائل میں آزادانہ بحث ومباحثہ کی ضرورت

جہاں تک علمی مسائل میں آزادانہ بحث ومباحثہ کا تعلق ہے، یہ بات درست ہے کہ ''الشریعۃ'' نے گزشتہ بیس سال کے دوران اس کا ماحول پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور اب بھی یہ ہمارے اہداف میں شامل ہے، اس لیے کہ آج کے حالات میں آزادانہ بحث ومباحثہ کے بغیر کسی بھی مسئلے میں منطقی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور عالمی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی مراکز نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف اطراف سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارا روایتی اسلوب کافی نہیں ہے۔ ماضی نے اپنا علمی خزانہ کتابوں اور سی ڈیز کی شکل میں اگل دیا ہے اور آج کوئی بھی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان اپنے چودہ سوسالہ علمی

ماضی کے کسی بھی حصہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے یا کسی بھی طبقے کا موقف اور دلائل معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کے بھرپور مواقع اور وسائل ہر وقت میسر ہیں۔ اس ماحول میں یہ کوشش کرنا کہ نوجوان اہل علم صرف ہمارے مہیا کردہ علم اور معلومات پر قناعت کریں اور علم اور معلومات کے دیگر ذرائع سے آنکھیں اور کان بند کر لیں، نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں ہے بلکہ فطرت کے بھی منافی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہ بات ہمارے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے کہ مطالعہ اور تحقیق کے اس سمندر سے نئی نسل کو روکنے کی بجائے خود بھی اس میں گھسیں اور ان متنوع اور مختلف الجہات ذرائع معلومات میں حق کی تلاش یا حق کے دائرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی راہنمائی کریں۔ چنانچہ علم وفکر کی دنیا میں میرا ذوق روکنے یا باز رکھنے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن مدد کرنے کا ہے۔ کسی دوست کو یہ طریقہ پسند ہو یا نہ ہو، لیکن میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے بحث ومباحثہ ضروری ہے، مسائل کا تجزیہ وتنقیح اور دلائل کی روشنی میں ان کا حل خالص علمی انداز میں تلاش کرنا ضروری ہے، البتہ اس بحث ومباحثہ میں علمی اصول اور مسلمات کا لحاظ اور گفتگو کو ان کے دائرے میں محدود رکھنا بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ......

اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فقہی ذوق کا حوالہ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جو ''فتاویٰ مفتی محمود'' کے دیباچہ میں مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ نے حضرت مولانا محمد عبید اللہ دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ مدظلہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''مفتی صاحبؒ نے اس ملاقات میں مجھ سے ایسی بہت سی باتیں کہیں جن سے میرے دل کو تسلی ہوئی۔ مجھے اس بالمشافہہ گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ مفتی صاحب اپنے دل میں ''اتحاد بین المسلمین'' کے لیے بڑی تڑپ رکھتے ہیں اور فرقہ واریت سے انھیں طبعی نفرت ہے۔ چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھے، اس لیے ایک نوجوان عالم کی زبانی اتنی سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو میرے لیے خوشی کا باعث بنی۔ نوجوان عموماً جذباتی ہوتے ہیں، ان کی سوچ بھی جذباتی ہوتی ہے، ان کے فیصلے بھی جذباتی ہوتے ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ ہمارے ہم عصر علما میں وہ ایک پختہ فکر، صائب الرائے اور زیرک انسان ہیں۔ ان کی یہی صفت میرے دل کو بھائی۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں میں علمی، سیاسی اور ملی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی مسائل بھی زیر بحث آئے اور ان کی فقہی رائے کو میں نے ہمیشہ قوی پایا۔
>
> بعض مسائل میں وہ اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر فقہی مسائل پر عمل کے سلسلہ میں ان کی رائے یہ تھی کہ مخصوص حالات میں ایک حنفی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی خاص مسئلے میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی کرے۔ ایسا آدمی ان کے نزدیک حنفیت سے خارج نہیں ہوتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے متعدد مسائل میں امام صاحبؒ سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی اپنی ترجیحات ہیں، لیکن ان پر

حنفیت سے خروج کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ اپنے اختلافات اور ترجیحات کے باوجود حنفی تھے۔ اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں امام صاحبؒ کا قول موجود نہ ہو یا موجود ہو تو مگر سمجھ نہ آئے یا سمجھ بھی آئے لیکن حالات کی خاص نوعیت کے تحت اس پر عمل ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے امام کی پیروی درست ہوگی۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ایسی شکل وصورت پیش آجائے تو صاحبینؒ کے قول پر عمل کیا جائے۔ اگر صاحبینؒ کے قول میں بھی یہی صورت پیش آئے تو امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے اقرب قول پر عمل کر لیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی خاص مسئلہ میں خروج عن الحنفیت تو جائز ہے لیکن مذاہب اربعہ سے خروج جائز نہیں ہے۔ اس نقطہ نظر میں مولانا مفتی محمودؒ منفرد تھے۔ تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ایسا کرنا ان علما کا کام ہے جن کی مذاہب اربعہ پر وسیع نظر ہے، جو کسی مسئلہ کے ترجیحی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ عام آدمی کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں پر عمل کرے، کیونکہ ایسی اجازت دینے سے اس کے عقیدے میں خلل آ سکتا ہے اور لوگ اپنی مرضی سے ادھر ادھر بھٹکنے کے عادی بن سکتے ہیں، جب کہ ایسی صورت صرف اس وقت پیش آسکتی ہے جب ملکی قوانین کی تدوین کی صورت میں علما کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکیں، کیوں کہ اصل چیز امام کا قول نہیں، اصل چیز وہ نص ہے جس کی روشنی میں یہ قول متشکل ہوا ہے، یعنی منصوص چیزیں جو ائمہ اربعہ کی علمی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوئیں۔ ائمہ اربعہ نے بے پناہ تحقیق وجستجو کے بعد قرآن وحدیث سے مسائل مستنبط کیے ہیں، اس لیے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ کسی مسئلہ پر اگر احناف کے ہاں کوئی دلیل یا سند نہیں ہے تو دوسرے مذاہب سے اسے لینا درست ہوگا، بشرطیکہ وہ وہاں بہتر صورت میں موجود ہو۔''

حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فقہی ذوق اور علمی اسلوب کے بارے میں حضرت مولانا عبید اللہ دامت برکاتہم کا یہ ارشاد گرامی تفصیل کے ساتھ میں نے اس لیے نقل کیا ہے کہ میرا طالب علمانہ ذوق بھی بعینہ اسی طرح کا ہے، البتہ حضرت مولانا عبید اللہ مدظلہ نے اسے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا انفرادی ذوق بتایا ہے، جب کہ میرے خیال میں اور بزرگ بھی اس ذوق میں ان کے ساتھ شریک ہیں، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اپنی کتاب ''اسلامی بینکاری۔ تاریخ وپس منظر اور غلط فہمیوں کا ازالہ'' میں لکھتے ہیں کہ :

''حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت گنگوہیؒ سے معاملات کے اندر اس بات کی صریح اجازت لی ہے کہ معاملات میں لوگوں کی آسانی کے لیے ائمہ اربعہ میں جہاں بھی توسع ہو، اسے لے لیا جائے۔ ''حضرت گنگوہی سے صریح اجازت لی'' میں نے یہ الفاظ حضرت والد صاحب (مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ) سے بعینہ سنے ہیں اور ایک جگہ حضرت والد صاحبؒ نے لکھے بھی ہیں۔''......

o میری طالب علمانہ رائے میں حاجات عامہ، ملکی قوانین کی تدوین اور اجتماعی معاشرتی الجھنوں کا حل تلاش کرنے کا میدان فتویٰ کے میدان سے مختلف ہے، اس لیے ایسے معاملات میں فتویٰ کے اصول اور ترجیحات کو بنیاد بنانے کی

بجائے تحقیق اور استدلال کا قدرے وسیع دائرہ متعین کرنا ہوگا اور اس کے لیے اہل سنت والجماعت کے علمی اصول اور مسلمات کو دائرہ قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔.....ملکی قوانین کی تدوین میں رائے دینا، اجتماعی ملی مسائل ومشکلات پر بحث کر کے ان کے حل کا راستہ نکالنا اور بین الاقوامی قانون وثقافت کے ساتھ اسلامی احکام وقوانین کے ٹکراؤ کا جائزہ لے کر قابل عمل راستہ تلاش کرنا میرا ذوق ہے اور ''الشریعۃ'' کا ہدف اور دائرہ کار بھی یہی ہے۔اس لیے ہماری یہ ہمیشہ درخواست ہوتی ہے کہ ہمارے کام کو فتویٰ کے دائرہ کار کے حوالے سے نہیں بلکہ ملی مسائل میں بحث ومباحثہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔مفتی صاحب کوئی فتویٰ دیتے ہیں تو وہ فیصلہ دے رہے ہوتے ہیں، لیکن جب ہم کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو اس کی حیثیت فیصلہ کی نہیں ہوتی، رائے کی ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مقدمہ پر بحث کے دوران وکیل ہر طرح کی بات کرتے ہیں، مسئلے کے ہر پہلو کو واضح کرتے ہیں، بال کی کھال اتارتے ہیں اور تجزیہ وتنقیح کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کرتے، مگر ان کی کوئی بات فیصلہ کا درجہ نہیں رکھتی۔ فیصلہ جج نے کرنا ہوتا ہے اور ہمارے بحث ومباحثہ میں جج کا درجہ امت کے اجتماعی علمی دائرے کو حاصل ہے۔ جو بات اجتماعی قبول کے دائرے میں آجائے گی، وہ فیصلہ ہوگی اور جس کی وہاں تک رسائی نہیں ہوگی، وہ وکیل کی انفرادی نکتہ رسی قرار پا کر فائلوں میں دبی رہ جائے گی۔

اب میں اس مسئلے کے دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں کہ ایسے مسائل پر عمومی بحث ومباحثہ نہ ہونے کے نقصانات کیا ہوتے ہیں اور ہم اس آزادانہ بحث ومباحثہ کو ضروری کیوں سمجھتے ہیں۔اس کے مختلف پہلوؤں میں سے سر دست ایک پر نظر ڈال لیں کہ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں یہ روایت سی بن گئی ہے کہ ہم کسی اجتماعی مسئلے پر دینی اور شرعی حوالے سے ایک قدم اٹھا لیتے ہیں، فیصلہ کر لیتے ہیں، لیکن اس پر آزادانہ علمی بحث نہ ہونے کی وجہ سے اس فیصلے کی علمی توجیہ سامنے نہیں آتی اور دلائل کا پہلو اوجھل رہتا ہے جس سے کنفیوژن پیدا ہوتی ہے اور فیصلہ ہو جانے اور اس پر عمل درآمد ہو جانے کے باوجود علمی دنیا میں وہ فیصلہ بدستور معلق رہتا ہے۔مثال کے طور پر ہم نے غلامی کا شعبہ بالکل ترک کر رکھا ہے، حالانکہ غلاموں اور لونڈیوں کے احکام قرآن کریم میں اور احادیث نبویہ میں اور فقہ اسلامی میں صراحت کے ساتھ موجود ہیں، لیکن ان میں سے کسی پر آج عمل نہیں ہو رہا، بلکہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران ہم نے دنیا کے کسی بھی حصہ میں ''جہاد'' کے عنوان سے جو جنگ بھی لڑی ہے، اس میں کسی کو نہ غلام بنایا ہے نہ لونڈی بنایا ہے جس کی وجہ سے ان سے متعلق فقہی احکام وقوانین عملاً متروک ہو کر رہ گئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اس تبدیلی کی علمی بنیاد کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آپ گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان کے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علمائے کرام سے استفسار کر لیں۔ ان میں سے شاید ایک فیصد بھی ایسے حضرات نہ نکلیں جو اس کی کوئی علمی توجیہ کر سکیں یا یہ بتا سکیں کہ قرآن وحدیث اور فقہ میں غلامی کے بارے میں واضح احکام موجود ہونے کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہو رہا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ کم از کم دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ اور دین کی دعوت وتعلیم سے تعلق رکھنے والے حضرات کو یہ بات ضروری طور پر معلوم ہونی چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا ہے، ان احکام پر عمل نہ کرنے کا شرعی جواز کیا ہے، اور کیا یہ عارضی صورت حال ہے یا مستقل طور پر اس کو جاری رکھنا ضروری ہے۔

اسی طرح قادیانیوں کے بارے میں ہم نے اجتماعی طور پر فقہی احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں غیر مسلم اقلیت کے طور پر ملک میں رہنے کا حق دیا جائے گا اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ یہ فیصلہ جو تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر کیا ہے اور ملک میں نافذ العمل ہے، ہمارے روایتی فقہی موقف سے ہٹ کر ہے۔ میں اس فیصلے کی مخالفت نہیں کر رہا، بلکہ اس کے حق میں ہوں اور اس کو قانونی اور دستوری درجہ دلوانے کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی علمی توجیہ کیا ہے اور ایسا کرنا شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ہمارے خیال میں اس پر علمی مباحثہ ضروری ہے اور نہ صرف علما وطلبہ بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کے سامنے بھی اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تبدیلی کیوں آئی ہے اور اس کا شرعی جواز کیا ہے؟

اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور فرما لیں کہ پاکستان بننے کے بعد ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے ہم نے روایتی فقہی موقف سے ہٹ کر ووٹ کی بنیاد پر حکومت کی تشکیل کو بنیاد بنایا ہے اور اب تک ہمارا اجتماعی موقف یہی ہے کہ حکومت ووٹ کی بنیاد پر بنے گی، البتہ وہ قرآن وسنت کے احکام کی پابند ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے والوں میں ہمارے اکابر شامل تھے اور تمام مکاتب فکر کے اکابر بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا، مگر اس کی علمی توجیہ ہمارے علمائے کرام اور دینی کارکنوں کے سامنے نہیں ہے جس کی وجہ سے ابھی تک کنفیوژن موجود ہے اور جمہوریت کو مطلقاً کفر قرار دینے والوں میں نہ صرف سوات کے مولانا صوفی محمد پیش پیش ہیں بلکہ دینی کارکنوں کی اکثریت بھی یہی ذہن رکھتی ہے، اور یہ سوال لوگوں کے ذہنوں میں مسلسل پریشانی کا باعث بن رہا ہے کہ اگر جمہوریت مطلقاً کفر ہے تو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا سید یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ سمیت ان اکابر کی کیا حیثیت ہے جنہوں نے ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ووٹ کو بنیاد قرار دیا تھا اور ۱۹۷۴ء کا دستور تشکیل دینے والے تمام مکاتب فکر کے ان سرکردہ علمائے کرام کی کیا پوزیشن ہے جنہوں نے ووٹ کی بنیاد پر حکومت کے قیام کو تسلیم کیا ہے؟

ہمیں اپنے بزرگ مفتیان کرام کے ارشادات سے اتفاق ہے کہ عام مسلمان کو دین کے دائرہ کا پابند رکھنے اور بے راہ روی سے بچانے کے لیے تحفظات کا برقرار رکھنا ضروری ہے اور ہم افتا کے دائرے میں ان کے اس موقف اور اسلوب کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن حاجات عامہ، دستور وقانون کی تدوین اور اجتماعی معاشرتی مسائل کے حل کے لیے جس توسع کی ضرورت ہے اور اس کی شرعاً گنجایش بھی ہے، اس کے بارے میں انہیں اس قدر سختی روا نہیں رکھنی چاہیے بلکہ بحث ومباحثہ کی حد تک کھلے ماحول کو برداشت کرنا چاہیے اور اس کو فتویٰ کی ترجیحات پر پرکھنے کی بجائے اجتماعی ملی ضروریات کے دائرے میں سمجھنا چاہیے۔......

میرا نقد واعتراض کا انداز مناظرین ومجادلین کے طرز استدلال سے مختلف ہے۔ میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی کہ طعن وتشنیع اور تحکم کی بجائے افہام وتفہیم سے کام لیا جائے اور جس سے اختلاف کیا جا رہا ہے، اسے مسترد کرنے کی بجائے واپس لانے کی کوشش کی جائے۔ میں ہر حال میں آپریشن کر دینے کا قائل نہیں ہوں بلکہ

واپسی کے لیے محفوظ راستہ دینے کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہوں۔ یہ صرف غامدی صاحب کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ جو دانشور بھی کسی وجہ سے جمہور کے جادۂ اعتدال سے ہٹ کر بات کر رہے ہیں، ان سب کے بارے میں میری خواہش اور کوشش یہی ہے۔ ایک تاریخی واقعہ اس حوالے سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے اور شاید یہی میرے اس اسلوب اور طرز عمل کا باعث بھی یہی ہے کہ معتزلہ کا بانی واصل بن عطا حضرت حسن بصریؒ کے حلقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ معقولات کی دنیا کا آدمی تھا اور عقلی نوعیت کے سوالات کرتا رہتا تھا۔ حضرت حسن بصری اپنی تمام تر علمی عظمت اور تقویٰ اور بزرگی کے باوجود اس دنیا کے آدمی نہیں تھے، اس لیے اس نے جب حضرت حسن بصریؒ کے حلقہ سے علیحدگی اختیار کی تو انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا کہ 'اعتزل عنا'، وہ ہم سے الگ ہو گیا ہے اور حضرت حسن بصریؒ کے اسی تاریخ جملہ سے واصل بن عطا اور اس کے پیروکاروں کا نام ''معتزلہ'' پڑ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر واصل بن عطا کا واسطہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مجلس سے ہوتا تو اسباب کی دنیا میں شاید نتیجہ یہ نہ نکلتا، اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں سوال و جواب ہوتے تھے، بحث ومباحثہ ہوتا تھا، اختلاف رائے ہوتا تھا، دلائل دیے جاتے تھے اور منطق واستدلال کے ساتھ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، حتیٰ کہ اگر کسی شریک محفل کو مجلس کے اجتماعی فیصلہ پر اطمینان نہ ہوتا تو اسے اختلافی نوٹ لکھوانے کا حق بھی ہوتا تھا۔ آج یہ اسلوب ہمارے ہاں مفقود ہو گیا ہے اور خود ہم احناف اس اسلوب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔......

قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور ان سے استدلال واستنباط کے حوالے سے مجھے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے کہ اس کا دروازہ بالکل بند ہو چکا ہے اور اب علما و محققین کا کام صرف ماضی کی تعبیرات وتشریحات اور استنباطات واجتہادات میں سے ضرورت کے مطابق انتخاب کرنا اور ترجیحات قائم کرنا ہے۔ قرآن وسنت سے استدلال واستنباط ماضی کی طرح حال اور مستقبل کے اہل علم کا بھی حق ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا، لیکن اس کے ساتھ مجھے اس بات سے بھی شدید اختلاف ہے کہ نئے استدلال واستنباط اور تعبیر وتشریح کے لیے ماضی کی تعبیرات سے لاتعلقی بلکہ کسی موقع پر ان سے براءت اور ان کی نفی بھی ضروری ہے۔ علمی ارتقا اس کا نام نہیں ہے کہ چودہ سو سال کے علمی تسلسل کو نظر انداز کر کے اور اسے ''محض روایت'' قرار دے کر قرآن وسنت سے براہ راست استدلال واستنباط کے زیرو پوائنٹ کی طرف الٹی زقند لگا دی جائے، بلکہ کسی بھی علم میں ارتقا ماضی کے تسلسل کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس لیے زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے استدلال واستنباط کا حق تسلیم کرنے کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا کوئی بھی استدلال واستنباط قابل قبول نہیں ہو سکتا جس سے ماضی کے اجتہادات اور جمہور اہل علم کے رجحانات کی کلیتاً نفی ہوتی ہو۔

میں اس سلسلے میں امت کے اساطین علم میں سے دو بزرگوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ایک امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں جنھوں نے واضح طور پر فرما دیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد سر آنکھوں پر، صحابہ کرام کے فیصلے بھی ہمارے لیے واجب العمل ہیں اور اگر کسی مسئلے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف ہے تو ہم ان

کے اقوال میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں گے اور ان کے اقوال کے دائرے سے باہر نہیں نکلیں گے، البتہ ان کے بعد ہمارے زمانے میں بات آئے گی تو 'نحن رجال وھم رجال'، پھر ہم کسی کے پابند نہیں ہیں۔ جس طرح دوسرے حضرات اجتہاد کرتے ہیں، ہم بھی اجتہاد کریں گے۔

''صحابہ کرام کے اقوال کے دائرے میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا'' ایک ایسا اصول ہے جو نہ صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کی ایک اہم اساس ہے، بلکہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' میں ''الجماعۃ'' کا لفظ بھی اسی کی غمازی کرتا ہے، اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر زمانہ میں نئی تعبیر وتشریح اور استدلال واستنباط کی گنجایش ہے اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ماضی کے اجتہادات اور علمی تسلسل بالخصوص حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجماعی فیصلوں اور رجحانات کی نفی نہ ہو، بلکہ نیا استدلال واستنباط ماضی کے علمی تسلسل میں اضافہ اور اس کے ارتقا کا باعث بنے۔

دوسرے بزرگ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں بعض حوالوں سے قرآن وسنت کی نئی تعبیر وتشریح اور استدلال واستنباط کی ضرورت بیان کی ہے اور اس اعتراض کو پوری قوت کے ساتھ رد کر دیا ہے کہ کسی نئی علمی بحث کی ضرورت نہیں ہے، اور چونکہ اسلاف نے یہ باتیں نہیں کہیں ('لان السلف لم یدونوہ') اس لیے اب کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس فکر کو مسترد کرتے ہوئے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے استدلال واستنباط کی اہمیت وضرورت کو واضح کیا ہے اور پوری حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے اول سے آخر تک یہی کام کیا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ اعلان بھی ضروری سمجھا ہے اور میرے نزدیک ایسے علمی مباحث میں حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کا یہ ارشاد ہی قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

وھا انا بریٔ من کل مقالۃ صدرت مخالفۃ لآیۃ من کتاب اللہ او سنۃ قائمۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او اجماع القرون المشھور لھا بالخیر او ما اختارہ جمھور المجتھدین ومعظم سواد المسلمین فان وقع شیٔ من ذلک فانہ خطا رحم اللہ تعالیٰ من ایقظنا من سنتنا او نبھنا من غفلتنا اما ھولاء الباحثون بالتخریج والاستنباط من کلام الاوائل المنتحلون مذھب المناظرۃ والمجادلۃ فلا یجب علینا ان نوافقھم فی کل ما یتفوھون بہ ونحن رجال وھم رجال والامر بیننا وبینھم سجال

''اور ہاں، میں ہر اس بات سے بری ہوں جو مجھ سے قرآن کریم کی کسی آیت یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت قائمہ کے خلاف صادر ہوگئی ہو یا خیر القرون کے اجماع، جمہور مجتہدین کے فیصلوں اور امت مسلمہ کے اجماعی رجحان کے منافی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوگئی ہے تو یہ خطا ہے۔ جو صاحب ہمیں اس اونگھ سے بیدار کریں گے اور غفلت پر خبردار کریں گے، اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو۔ البتہ یہ لوگ جو پہلے بزرگوں کے کلام سے استنباط وتخریج میں بحث کرتے ہیں اور مناظرہ ومجادلہ کے ذوق واسلوب کی طرف منسوب ہیں، ہمارے لیے یہ ضروری

نہیں ہے کہ ہم ان کی ہر اس بات میں ان کی موافقت کریں جو ان کے منہ سے نکل جائے، کیونکہ وہ بھی مرد ہیں اور ہم بھی مرد ہیں اور یہ معاملہ ہمارے اور ان کے درمیان کنویں کے ڈول کی طرح گھومتا ہے۔''

اس لیے میں یہ گزارش ضروری سمجھتا ہوں کہ افراط وتفریط دونوں سے بچنے اور اعتدال وتوازن سے کام لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ نہ ضروریات سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تحفظات کو نظر انداز کر دینا دانش مندی ہے۔ صحیح بات وہی ہوگی جو ان دونوں کو سامنے رکھ کر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح رخ پر چلنے اور اس پر استقامت کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔......

[الشریعہ، مئی رجون ۲۰۰۹ء]

اختلاف رائے کے دائرے، حدود اور آداب

ہمارا عمومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی اختلاف کی اصل سطح اور دائرہ کو پیش نظر رکھے بغیر ہر اختلاف میں ایک ہی طرح کا طرز عمل اختیار کر لیا جاتا ہے جس سے اختلافات اکثر اوقات تنازعات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے میں مذہبی اختلافات کی مختلف سطحوں اور دائروں کے بارے میں اپنے طالب علمانہ مطالعہ کی روشنی میں کچھ امور کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

☆ مذہبی اختلافات کا ایک دائرہ ایمان اور کفر کا ہے اور ادیان و مذاہب کی سطح کا ہے جیسا کہ مسلمان، مسیحی، یہودی، سکھ، ہندو اور بدھ مت وغیرہ مذاہب کے درمیان ہے۔

☆ ایک دائرہ حق و باطل کا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اہل قبلہ کے مختلف گروہوں کا باہمی اختلاف کہتے ہیں۔ یہ اہل سنت، معتزلہ، خوارج، روافض اور منکرین حدیث کے درمیان اختلافات کا دائرہ ہے جو اپنی تمام تر شدت اور سنگینی کے باوجود بہرحال پہلے دائرہ سے مختلف ہے اور میں اسے حق و باطل کے اختلافات سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔

☆ تیسرا دائرہ اہل سنت کے اپنے داخلی ماحول میں فقہاء کرامؒ کے اختلافات کا ہے جس کا تعلق احکام ومسائل سے ہے مثلاً احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ اور ظواہر کے باہمی فقہی اختلافات ہزاروں مسائل میں ہیں لیکن یہ اختلافات ایمان وکفر اور حق و باطل کی سطح کے نہیں ہیں بلکہ خطا وصواب کے دائرے کے ہیں۔ کیونکہ فقہ واجتہاد کے باب میں اہل السنۃ کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں جو موقف ہم میں سے کسی نے اختیار کیا ہے وہ صواب ہے جبکہ دوسری طرف کا موقف خطاء پر مبنی ہے (ولکن یحتمل الصواب) مگر اس میں صواب کا احتمال بھی موجود ہے۔

☆ چوتھا دائرہ اولیٰ وغیر اولیٰ کا ہے جو ایک ہی فقہ کے پیروکاروں کے درمیان اکثر موجود رہا ہے اور یہ اتنا معمولی ہوتا ہے کہ اسے خطا وصواب سے تعبیر کرنے کی گنجائش بھی بسا اوقات نہیں ہوتی۔

☆ پانچواں دائرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تشریحات کے مطابق عقائد کی تعبیرات کا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مسلّمہ عقائد کے باب میں کسی عقیدہ سے اختلاف کی وجہ سے تو اختلاف کرنے والوں کو اہل السنۃ کے دائرہ

سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے لیکن نفس عقیدہ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی تعبیر میں اختلاف کرنے والوں کو اہل السنۃ سے خارج قرار دینے کو وہ درست نہیں سمجھتے۔ مختلف عقائد کی تعبیرات کے بارے میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر کے بیسیوں باہمی اختلافات اسی زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے باوجود یہ تینوں گروہ اہل السنۃ والجماعۃ کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اختلافات کے مختلف دائروں اور سطحوں کو باہم گڈ مڈ کر رکھا ہے۔ بات اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہوتی ہے جبکہ ہم کفر و اسلام کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں، بات خطا و صواب کی ہوتی ہے مگر ہم حق و باطل کے پرچم اٹھائے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اگر ہم اختلافات کے دائروں اور سطحوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر اختلاف کو اس کے اصل دائرہ میں رکھیں تو بہت سے تنازعات خود بخود حل ہو جائیں اور باہمی احترام اور رواداری کا ماحول بھی فروغ پانے لگے۔

ہمارے ایک فاضل دوست نے ایک فکری نشست میں اختلافات اور بحث و مباحثہ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے ہاں تحقیق کا مطلب حق کی تلاش نہیں ہوتا بلکہ حق کو ثابت کرنا ہوتا ہے کہ جو حق ہمارے پاس موجود ہے اس کو ثابت کرنے کے لیے دلائل دیں اور اس کے خلاف پائے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالہ کی علمی محنت کریں۔

مجھے نصوص صریحہ کی حد تک اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ جو بات قرآن کریم اور حدیث و سنت سے اللہ تعالیٰ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی صورت میں یقینی طور پر ثابت ہو جائے، وہ بہرحال حق ہے اور اسے دلائل کے ساتھ ثابت کرنا ہی ہماری دینی و علمی ذمہ داری ہے، لیکن کیا غیر منصوص اور غیر صریح احکام و مسائل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے؟ مجھے اس میں کلام ہے، اس لیے کہ غیر منصوص اور غیر صریح احکام و مسائل میں حکم، مصداق اور تعبیر کا تعین رائے اور اجتہاد سے ہوتا ہے۔ رائے اور اجتہاد کا دائرہ یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے سوا کسی بھی شخصیت کی رائے اور تعبیر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔ سینکڑوں فقہاء کرامؒ نے اس دائرہ میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے اور بڑے بڑے اکابر فقہاء کرامؒ نے بہت سے مسائل میں ایک رائے قائم کرنے کے بعد اس سے رجوع کیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ اس لیے یہ کہنا کہ کسی غیر منصوص اور اجتہادی مسئلہ میں ہمارے ذہن میں جو رائے قائم ہوگئی ہے، حق اسی میں بند ہو گیا ہے، حق کی تلاش کی مزید تحقیق کی گنجائش باقی نہیں رہی اور ہم نے اس کے بعد جو تحقیق کرنی ہے، اسی کو ثابت کرنے کے لیے کرنی ہے، درست بات نہیں ہے۔

[الشریعہ، اگست ۲۰۱۳ء]

آج کے حالات میں آزادانہ بحث و مباحثہ کے بغیر کسی بھی مسئلے میں منطقی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور عالمی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی مراکز نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف اطراف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارا روایتی اسلوب کافی نہیں ہے۔ ماضی نے اپنا

علمی خزانہ کتابوں اور سی ڈیز کی شکل میں اگل دیا ہے اور آج کوئی بھی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان اپنے چودہ سو سالہ علمی ماضی کے کسی بھی حصہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے یا کسی بھی طبقے کا موقف اور دلائل معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کے بھرپور مواقع اور وسائل ہر وقت میسر ہیں۔ اس ماحول میں یہ کوشش کرنا کہ نوجوان اہل علم صرف ہمارے مہیا کردہ علم اور معلومات پر قناعت کریں اور علم اور معلومات کے دیگر ذرائع سے آنکھیں اور کان بند کر لیں، نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں بلکہ فطرت کے بھی منافی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہ بات ہمارے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے کہ مطالعہ اور تحقیق کے اس سمندر سے نئی نسل کو روکنے کی بجائے خود بھی اس میں گھسیں اور ان متنوع اور مختلف الجہات ذرائع معلومات میں حق کی تلاش یا حق کے دائرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی راہ نمائی کریں۔ چنانچہ علم وفکر کی دنیا میں میرا ذوق روکنے یا باز رکھنے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن مدد کرنے کا ہے۔ کسی دوست کو یہ طریقہ پسند ہو یا نہ ہو، لیکن میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے بحث ومباحثہ ضروری ہے، مسائل کا تجزیہ وتنقیح اور دلائل کی روشنی میں ان کا خالص علمی انداز میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ ایک عرصہ تک میرا بھی یہ ذوق اور ذہن رہا ہے کہ تحقیق کا دائرہ صرف یہ ہوتا ہے کہ جو بات ہم اپنے ذہن میں پہلے سے طے کر چکے ہیں، اسے کسی نہ کسی طرح ثابت کر دیا جائے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات ذہن میں راسخ ہوتی گئی کہ خود اپنی بات کو دلائل اور حقائق کے معیار پر پرکھنا بھی تحقیق کا اہم ہدف ہوتا ہے۔ بہت سے مسائل میں اکابر اہل علم کا رجوع الی الحق بالخصوص حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے اس کا باقاعدہ اہتمام میرے ذوق میں اس تبدیلی کا باعث بنا۔

[الشریعہ، دسمبر ۲۰۱۱ء]

رائے کی اہلیت اور بحث ومباحثہ کی آزادی

ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم صرف تحفظات کے دائرے میں محصور رہنے کو درست نہیں سمجھتے، بلکہ ان ضروریات پر بھی ہماری نظر ہے جو آج کے معروضی حالات میں اہل علم سے سنجیدہ توجہ کا تقاضا کر رہی ہیں۔ تحفظات اور ضروریات کے دائرے ہر دور میں الگ الگ رہے ہیں اور دونوں کے تقاضوں کو سامنے رکھنے والوں کا ذوق اور طرز عمل بھی ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے۔ اگر ماضی کی علمی ودینی تاریخ کو اس پہلو سے دیکھا جائے تو کوئی دور بھی اس کشمکش سے خالی نظر نہیں آتا۔

مثال کے طور پر کوئی واقعہ پیش آئے بغیر محض مسئلہ کی کوئی صورت فرض کر کے اس پر حکم لگانا، جسے ''فقہ فرضی'' کہا جاتا ہے، صحابہ کرام اور تابعین کبار کے دور میں پسندیدہ بات نہیں سمجھی جاتی تھی، حتیٰ کہ ایک بار حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حضرت قتادہ سے کوئی مسئلہ پوچھا تو انھوں نے دریافت کیا کہ کیا ایسی کوئی صورت پیش آئی ہے؟ جواب میں امام ابوحنیفہ نے کہا کہ ایسی صورت پیش تو نہیں آئی تو حضرت قتادہ نے فرمایا کہ:

''مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو ابھی واقع ہی نہیں ہوئیں۔''

(بحوالہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۲۳۵، از مولانا مناظر احسن گیلانی)

جبکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس ''فقہ فرضی'' کے لیے باقاعدہ علمی مجلس قائم کر کے محض مفروضہ صورتوں پر ۸۰ ہزار سے زائد احکام ومسائل مرتب کیے جو آج تک فقہ حنفی کی علمی اساس ہیں۔

اسی طرح صحابہ کرام اور کبار تابعین کے دور میں عقائد کے باب میں عقلی بحثوں کو ناپسند کیا جاتا تھا اور اسے عقائد خراب کرنے اور عقائد میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش تصور کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ میں نے کسی جگہ حضرت امام ابو یوسف کا یہ فتویٰ پڑھا ہے جس کا حوالہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے کہ عقائد میں عقلی بحثیں کرنے والے متکلم کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، لیکن بعد میں وقت کی ضروریات نے یہ ماحول پیدا کر دیا کہ عقائد کی بحثیں ہی معقولات کے حوالے سے ہونے لگیں، اس کو باقاعدہ علم کلام کا نام دیا گیا اور اسی عنوان سے یہ ہمارے ہاں مستقل پڑھایا جاتا ہے۔

ہم ''تحفظات'' اور ''ضروریات'' کے دونوں دائروں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ دونوں کا متوازن اظہار ہوتے رہنے سے ہی اعتدال کا راستہ ملے گا، اسی لیے ہم علمی مباحثہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں علمی مباحثہ کا تصور وہی ہے جس کے تحت حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اور مشاورتی اجتہاد کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس کے لیے کھلے علمی مباحثہ کو ضروری خیال کیا تھا۔ اس کا خاکہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

''اجتماعی مساعی اسی وقت بار آور ہوتی ہیں جب ضبط ونظم کے تحت ان کو انجام دیا جائے۔ امامؒ پر جہاں یہ راز واضح ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مجلس کے تمام ارکین کو جب تک کامل آزادی اپنے خیالات کے اظہار میں نہیں دی جائے گی، اجتماع کا جو مقصد ہے وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ آزادی کے اس دائرے کو امامؒ نے کتنی وسعت دے رکھی تھی؟ اس کا اندازہ اسی واقعے سے ہو سکتا ہے جس کو امامؒ کے مختلف سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ الجرجانی کہتے ہیں کہ میں امام کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک نوجوان جو اسی حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا، امام سے اس نے کوئی سوال کیا جس کا امامؒ نے جواب دیا، لیکن جوان کو میں نے دیکھا کہ جواب سننے کے ساتھ ہی بے تحاشہ اور امام کو مخاطب کر کے 'اخطات' (آپ نے غلطی کی ہے) کہہ رہا ہے۔ جرجانی کہتے ہیں کہ جوان کے اس طرز گفتگو کو دیکھ کر میں تو حیران ہو گیا اور حلقہ والوں کی طرف خطاب کر کے میں نے کہا کہ

''بڑے تعجب کی بات ہے کہ استاذ (شیخ) کے احترام کا تم لوگ بالکل لحاظ نہیں کرتے۔''

جرجانی ابھی اپنی نصیحت کو پوری بھی نہیں کر پائے تھے کہ وہ سن رہے تھے کہ خود امام ابوحنیفہؒ فرما رہے ہیں کہ

دعهم فانی قد عودتهم ذلك من نفسی

''تم ان لوگوں کو چھوڑ دو، میں نے خود ہی اس طرز کلام کا ان کو عادی بنایا ہے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اس آزادی کا قصداً وارادتاً امام نے اپنی مجلس کے ارکین کو کہیے یا تلامذہ کو، عادی بنا رکھا تھا اور یہ جان کر بنا رکھا تھا کہ جو مقصد ہے، اس آزادی کے بغیر وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔'' (امام ابوحنیفہ کی سیاسی

زندگی، ص ۲۳۸)

...... یہ بات عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں رائے، اجتہاد اور فتویٰ کے دائروں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے اور ہم ان سب کے بارے میں یکساں لہجے میں بات کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، حالانکہ ان تینوں کے الگ الگ دائرے اور الگ الگ احکام ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر رائے کو اجتہاد تصور کیا جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر اجتہادی قول کو مفتیٰ بہ قرار دے دیا جائے۔ کوئی مجتہد اپنے کسی غور طلب مسئلہ کے کسی ایک پہلو کے بارے میں کسی متعلقہ شخص سے رائے لیتا ہے جو صاحب علم نہیں ہے اور اس کی رائے کو اپنے اجتہاد کی بنیاد بھی بنا لیتا ہے۔ اب اس شخص کی رائے اجتہاد کا درجہ نہیں رکھتی، مگر اجتہادی عمل کا حصہ بن گئی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں فقہاء کرام کے مفتیٰ بہ اقوال اور غیر مفتیٰ بہ اقوال کا واضح فرق موجود ہے، لیکن ان میں سے کسی کے اجتہاد ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ان تینوں میں فرق قائم رکھنا ضروری ہے اور اس بنیاد پر ان تینوں کے معیارات بھی الگ الگ ہی ہوں گے۔

ہم نے ''عمومی مباحثہ'' میں ہر شخص کے لیے رائے کے حق کی بات ضرور کی ہے، لیکن جہاں علمی مباحثہ کی بات ہوئی ہے، وہاں ہم نے ان نوجوان اہل علم کا حوالہ دیا ہے جو اصحاب علم ہیں اور مطالعہ کی وسعت رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے نہ اجتہاد کا حق مانگا ہے اور نہ ہی انھیں فتویٰ کی اتھارٹی دینے کی بات کی ہے۔ صرف اتنی درخواست کی ہے کہ اگر وہ نوجوان اہل علم جو علمی استعداد رکھتے ہیں اور دینی لٹریچر کے ساتھ ساتھ آج کے حالات وضروریات پر بھی نظر رکھتے ہیں، انھیں رائے کے حق سے محروم نہ کیجیے۔ جو وہ محسوس کرتے ہیں، اس کے اظہار کا انھیں حق دیجیے اور پھر انھیں فتووں اور طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے کی بجائے دلیل کے ساتھ اور محبت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کیجیے کہ دین کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور معروضی حالات کا بھی یہی تقاضا ہے۔

[الشریعہ، جنوری ۲۰۱۲ء]

[مولانا مفتی عبد الواحد کے نام مکتوب]

o جہاں تک علمی واجتہادی مسائل پر کھلے مباحثہ کے بارے میں ہمارے طرز عمل پر آپ کے تحفظات ہیں، میں اسے آپ کا حق سمجھتا ہوں، مگر عمومی مباحثہ کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہر شخص کو رائے کا حق حاصل ہو۔ ماضی میں بھی ایسا ہوتا آیا ہے کہ کسی مسئلے پر کسی کو رائے دینے سے روکا نہیں کیا گیا۔ ہاں، دلیل اور استدلال کی بنیاد پر کسی کی بات جمہور اہل علم کے ہاں قبولیت پا گئی ہے تو اسے علمی دنیا میں جگہ مل گئی ہے اور اگر جمہور اہل علم کے ہاں اسے قبولیت نہیں ملی تو وہ تاریخ کی نذر ہو گئی ہے۔ ہمارے علمی اور فقہی ذخیرے میں آپ کو ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ایسی آرا ضرور ملیں گی جن کا اظہار ہوا ہے اور وہ جمہور اہل علم میں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکیں۔ میری طالب علمانہ رائے میں کسی رائے کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا دائرہ الگ ہے اور کسی کو رائے کا حق دینے یا نہ دینے کا دائرہ اس سے مختلف ہے۔ دونوں دائروں میں اگر اہل علم بھی فرق نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟

o کون رائے دینے کا اہل ہے اور کون اس کا اہل نہیں ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہ مجھے اپنے پاس رکھنا

چاہیے اور نہ آپ کو اس پر اصرار کرنا چاہیے۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ ہمارے دارالافتاء یہ منصب بھی سنبھال لیں کہ افراد کے بارے میں ڈگریاں جاری کرنا شروع کر دیں کہ کون رائے کا اہل ہے اور کون نہیں۔

اصول کی بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ ہمارے اسلاف نے رائے دینے کی اہلیت اور رائے کو قبول کرنے کے معیارات واضح کر دیے ہیں۔ ان کی بنیاد پر کسی کی رائے کو قبول کرنے اور کسی کی بات کو رد کر دینے کا اختیار اب تک عمومی علمی ماحول کے پاس رہا ہے۔ جو شخص عمومی علمی و دینی ماحول میں قابل قبول قرار پایا ہے، اسی کی اہلیت تسلیم کی گئی ہے اور جسے جمہور اہل علم نے نظر انداز کر دیا ہے، وہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ ماضی میں آپ کو بیسیوں حضرات ایسے ملیں گے جن پر شدید نقد و جرح کی گئی ہے اور فتوے بھی صادر کیے گئے ہیں، مگر انھیں علمی مباحثہ کے میدان سے نکالا نہیں جا سکا، جبکہ ایسے حضرات بھی کم نہیں ہیں جن کا ذکر صرف تاریخ کے ایک دو صفحات تک محدود ہے۔

اس لیے میری درخواست ہے کہ کسی شخص کے یا کسی رائے کے قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ جمہور اہل علم اور عمومی علمی ماحول کے پاس ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے، اس لیے کہ ان فیصلوں کا اصل فورم وہی ہے۔

[الشریعہ، نومبر ۲۰۱۱ء]

علمی و فکری مباحث اور جذباتی رویہ

کم و بیش پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھنے کے بعد ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ لگا کر ملکی سیاست میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ قومی اخبارات اور دینی جرائد میں اسلام، جمہوریت اور سوشلزم کے حوالے سے گرما گرم بحث جاری تھی اور اسی ضمن میں جاگیرداری نظام، زمینداری سسٹم، مزارعت اور اجارہ پر زمین دینے کے جواز اور عدم جواز پر بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ اسلامی سوشلزم کے نعرے کی بنیاد پر مسٹر بھٹو مرحوم کے خلاف مختلف دینی حلقوں کی طرف سے طعن و فتویٰ کا آغاز ہو چکا تھا جو بالآخر ایک سو تیرہ اکابر علمائے کرام کے اس فتویٰ پر منتج ہوا جس میں اسے کفر قرار دے دیا گیا تھا۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی سیاسی قیادت اس وقت حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی راہ نمائی میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے کفر کے اس فتویٰ سے کھلم کھلا اختلاف کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ اگرچہ ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح درست نہیں ہے اور سوشلزم کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص یا گروہ مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے جائز حقوق کے لیے آواز اٹھاتا ہے، جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے لیے اسلامی تعلیمات کی بالادستی سے منحرف نہیں ہے البتہ وہ اپنی جدوجہد کو ''اسلامی سوشلزم'' سے تعبیر کرتا ہے تو اسے تعبیر کی غلطی کہا جائے گا، اسے اس غلطی پر تنبیہ کی جائے اور سمجھایا جائے گا لیکن اس پر کفر کا فتویٰ عائد کرنا درست نہیں ہے۔ اس پر بعض حلقوں کی طرف سے جمعیۃ علماء اسلام کے راہ نماؤں کو ''سوشلسٹ علما'' کا خطاب بھی دیا گیا اور ۱۹۷۰ء کے الیکشن تک یہ معرکہ خوب گرم رہا۔

اس پس منظر میں راقم الحروف نے مزارعت اور بٹائی کے عنوان پر ایک تحقیقی مضمون لکھا جو ہفت روزہ ''ترجمان اسلام'' لاہور میں قسط وار شائع ہوا۔ حصہ اور بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینے کے جواز پر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبین حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا اختلاف مشہور ہے۔ صاحبین مزارعت اور بٹائی کے جواز کے قائل ہیں جبکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میں نے دونوں طرف کے دلائل کا مطالعہ کیا اور خاصی محنت کی جس میں بعض نادر کتابوں کے لیے خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف میں بھی ایک دو روز کے لیے حاضری دی اور وہاں کے معروف کتب خانہ سے استفادہ کیا۔ اس مطالعہ کے دوران مجھے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دلائل زیادہ وزنی معلوم ہوئے اور بعض اکابر احناف کی ایسی تصریحات بھی نظر سے گزریں کہ اس مسئلہ میں دلائل امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں اور صاحبین کے موقف پر فتویٰ ''مصلحت عامہ'' کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی بنیاد پر میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ دلائل بھی امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں اور آج کے دور کی ''مصلحت عامہ'' کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جاگیردارانہ سسٹم کا زور توڑ کر غریب کسانوں کو تحفظات فراہم کیے جائیں، اس لیے آج کے دور کے لیے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا موقف زیادہ قرین مصلحت اور قابل عمل ہے اور علمائے کرام کو بٹائی اور مزارعت کے جواز کا فتویٰ دینے کے بجائے امام صاحبؒ کے موقف کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ میرا موقف آج بھی یہی ہے اور اگرچہ اجتہاد یا افتا کی اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے عمل اسی پر کرتا ہوں اور مسئلہ بھی لوگوں کو وہی بتاتا ہوں جو صاحبین کے موقف کے مطابق جمہور فقہائے احناف کا مفتی بہ قول ہے لیکن علمی اور تحقیقی طور پر امام صاحبؒ کے موقف کو ہی راجح اور آج کے دور کی ضروریات سے ہم آہنگ سمجھتا ہوں۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے آرگن ہفت روزہ ''ترجمان اسلام'' لاہور میں اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف شور مچ گیا۔ ''سوشلسٹ علما'' کا خطاب تو ہمیں مل ہی چکا تھا، یہ کہا جانے لگا کہ یہ مضمون سوشلزم کی حمایت کے لیے اور سوشلسٹوں کو تقویت پہنچانے کے لیے لکھا گیا ہے بلکہ بعض انتہائی ذمہ دار بزرگوں نے میری طالب علمانہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ تبصرہ بھی فرمادیا کہ یہ مضمون اس کا لکھا ہوا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے یہ مضمون لکھا ہے اور اسے بیٹے کے نام سے شائع کرادیا ہے حالانکہ نہ حضرت والد صاحب مدظلہ کا یہ موقف تھا اور نہ ہی مضمون کی اشاعت سے قبل انھیں اس کا کوئی علم تھا لیکن زبانوں کو کون بند کرسکتا ہے؟ اس لیے چہ میگوئیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

میری یہ خواہش تھی کہ کوئی صاحب طعن وتشنیع کی زبان اور نفسیات سے ہٹ کر اس مضمون کا علمی طور پر جواب لکھیں اور دلائل کا رد کریں تاکہ اگر میری کوئی استدلال کی غلطی ہے تو مجھ پر واضح ہو لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور طعن وتشنیع کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہ کر بات ٹھنڈی پڑ گئی۔

یہ قصہ مجھے مسجد اقصیٰ کی تولیت کے حوالہ سے عزیزم حافظ محمد عمار خان سلمہ کا مضمون اور اس پر مختلف اطراف سے ہونے والی تنقید کو دیکھ کر یاد آیا اور میں نے مناسب سمجھا کہ اسے ریکارڈ پر لے آؤں کہ اس قسم کا معاملہ اس سے قبل عمار خان سلمہ کے والد یعنی میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ عزیزم سلمہ نے ایک علمی وتحقیقی عنوان پر اپنے مطالعہ وتحقیق کا

حاصل اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ میں خود اس پر اپنے موقف اور بعض تحفظات کا اظہار اپنے تبصرہ میں کر چکا ہوں جو ''الشریعۃ'' کے ایک گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے، لیکن میں اسے اس عزیز کا بلکہ مطالعہ وتحقیق سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کا حق سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے مطالعہ وتحقیق کے نتائج کو سامنے لائے اور اپنا موقف دلائل کے ساتھ پیش کرے اور اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ طعن وتشنیع کا سہارا لینے کے بجائے دلائل کی بنیاد پر اختلاف کرے اور اس کا اختلاف بھی اسی طرح ''الشریعۃ'' کے صفحات کی زینت بنے مگر مجھے افسوس ہے کہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ناظم اور ہمارے رفیق کار مولانا حافظ محمد یوسف کے سوا کسی اور اختلاف کرنے والے دوست نے اسے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا موضوع نہیں بنایا جبکہ ہماری خواہش ہے کہ اہل علم آج کی دنیا کے ایک اہم بین الاقوامی تنازع کے اس علمی پہلو کو سنجیدگی سے لیں اور دلائل کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کریں کیونکہ علمی مباحثہ کے ساتھ ہی اس قسم کے مسائل میں اصل صورت حال تک رسائی ہوتی ہے۔

[ماہنامہ الشریعہ، اپریل/مئی ۲۰۰۴]

الشریعہ اور ہائیڈ پارک

ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام کی تعبیر وتشریح اور نفاذِ اسلام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں عالمی اور قومی سطح پر جو امور زیر بحث آتے ہیں ان پر بات ضرور ہونی چاہیے اور مختلف علمی مکاتب فکر کے نقطۂ نظر کو قارئین کے سامنے آنا چاہیے۔

ہماری ایک معاشرتی اور نفسیاتی مجبوری یہ بھی ہے کہ وقت کی ضروریات کا تعین اپنے اپنے دائروں میں ہم خود ہی کر لیتے ہیں، حالانکہ وقت نہ اپنی رفتار میں ہمارا انتظار کر رہا ہوتا ہے اور نہ اپنی ضروریات کا تعین ہم سے پوچھ کر کرتا ہے، اس کی رفتار بھی اپنی ہوتی ہے اور ضروریات کا دائرہ بھی اپنا ہوتا ہے، مگر ہماری الجھن یہ ہے کہ جو بات ہماری ترجیحات میں شامل ہو جاتی ہے وہ وقت کی ضرورت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، اور جو عنوان یا موضوع ہماری ذاتی یا گروہی ترجیحات کا حصہ نہیں بن پاتا، اسے ہم سرے سے وقت کی ضروریات کے دائرے سے خارج قرار دینے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں بسا اوقات عجیب وغریب لطیفے رونما ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے ہاں یہ بحث چلی کہ گستاخ رسولؐ کے لیے توبہ کی گنجائش ہے یا نہیں؟ ملک کے علماء کرام نے عمومی طور پر یہ موقف اختیار کیا کہ موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ ہم نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا، لیکن جب اس بات کو علمی موقف کے طور پر بیان کیا جانے لگا تو یہ کہا گیا کہ احناف کا موقف بھی یہ ہے۔ ہم نے اس سے اختلاف کیا اور عرض کیا کہ احناف کا متفقہ موقف یہ نہیں ہے اس لیے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام ابو جعفر طحاویؒ نے گستاخ رسولؐ کے لیے صراحتاً توبہ کی گنجائش لکھی ہے جبکہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس پر مستقل رسالہ تحریر کیا ہے کہ گستاخ رسولؐ کے لیے توبہ کی گنجائش کا نہ ہونا احناف کا متفقہ موقف نہیں ہے۔ اس لیے اگر حالات کے تقاضے کے تحت اس موقف کو اختیار کرنا ضروری ہو تو اس میں مضائقہ نہیں، لیکن اسے احناف کا متفقہ موقف نہ کہا جائے۔ اس پر ہمارے بہت سے دوست چیں بہ جبیں ہوئے اور

بعض احباب نے تو چائے کی پیالی میں طوفان کھڑا کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ ایک انتہائی مہربان اور صاحب علم دوست نے ذاتی ملاقات میں ہم سے فرمایا کہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے، مگر اسے اس وقت بیان کرنے اور لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، ہم نے عرض کیا کہ اگر اس وقت ضرورت نہیں تھی تو احناف کے موقف کی صحیح پوزیشن بیان کرنے کی ضرورت کیا قیامت کے دن پیش آئے گی؟

اسی طرح یہ مسئلہ کہ کیا پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے ہتھیار اٹھانا درست ہے یا نہیں؟ ہم ایک عرصہ سے گزارش کر رہے ہیں کہ نفاذِ اسلام کی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس کے لیے پرامن جدوجہد کا ہر حربہ اختیار کرنا ہمارے لیے دینی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ہتھیار بدست ہو کر اس مقصد کے لیے عسکری جنگ لڑنا درست نہیں ہے۔ اس پر ہمارے ایک انتہائی مہربان دوست جن کی دینی و جہادی خدمات کے ہم ہمیشہ معترف رہے ہیں، دور دراز سفر کر کے گوجرانوالہ تشریف لائے اور بڑے خلوص و خیر خواہی کے ساتھ فرمایا کہ آپ کا موقف درست ہو سکتا ہے، لیکن اس کے اظہار کا وقت یہ نہیں ہے، اس لیے ابھی اس بارے میں خاموشی اختیار کر لیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے بھائی! اس وقت نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں اس موضوع پر بحث جاری ہے کہ نفاذِ اسلام کے لیے عسکری جدوجہد جائز ہے یا نہیں؟ اس لیے میرے خیال میں یہی وقت ہے کہ ہم اپنے موقف کا وضاحت کے ساتھ اظہار کریں۔ آپ ہمارے موقف سے اختلاف کریں، لیکن ہمیں اپنے موقف کے اظہار کے حق سے تو محروم نہ کریں۔

اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی کی وفات پر منعقد ہونے والی مجالس میں حاضری میرا معمول نہیں ہے، اکثر اوقات معذرت کر دیتا ہوں، لیکن اگر کہیں عمومی دینی مصلحت کے پیش نظر شریک ہونا ضروری ہو جاتا ہے تو وہاں اپنی گفتگو میں یہ وضاحت کر دیتا ہوں کہ اس قسم کی مجالس محض رسمی ہوتی ہیں، ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ اگر انہیں شرعی حیثیت دی جائے تو یہ بدعت کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں یہ بات میں نے قدرے وضاحت سے بیان کی تو ایک دوست نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ لوگ غم کے لیے جمع تھے، یہاں یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے عرض کیا کہ کیا یہ بات مجھے شادی کی کسی محفل میں بیان کرنی چاہیے تھی؟ میرے بھائی! بات وہیں کہی جائے گی جو اس کا موقع ہوگا اور جہاں اس کی ضرورت ہوگی۔

اس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ اسلام کے حوالے سے عالمی اور ملکی سطح پر یا معاشرتی ماحول میں جس مسئلہ پر گفتگو چل رہی ہو یا جو سوال سامنے آ جائے، اس پر اظہار خیال اہل دین کی ذمہ داری بن جاتا ہے اور کسی موضوع سے یہ کہہ کر گریز کرنا درست نہ ہوگا کہ وہ ہماری گروہی یا مسلکی ترجیحات میں شامل نہیں ہے، البتہ ایک دوسرے کے موقف اور دلائل سے ضرور واقف ہونا چاہیے اور موقف کے اظہار کے لیے زبان اور اسلوب و لہجہ کو متوازن رکھنا چاہیے۔

[الشریعہ، نومبر ۲۰۱۳ء]

محمد عمار خان ناصر

آزادانہ بحث ومباحثہ کی پالیسی اور حضرت شیخ الحدیثؒ

آزادانہ علمی بحث ومباحثہ کے حوالے سے ''الشریعہ'' کا منہج اور طرز فکر ان دنوں ایک بار پھر زیر بحث ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر ''الشریعہ'' میں وقتاً فوقتاً بات ہوتی رہتی ہے، تاہم حالیہ تنقید میں نسبتاً ایک نیا نکتہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ مولانا زاہد الراشدی نے: ۱۔ دیوبندی مسلک کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر کے اہل علم اور ان کی آرا کے حوالے وسعت نظری کا رویہ اپنانے، ۲۔ 'الشریعہ' میں دیوبندی اکابر کی آرا اور تحقیقات کے خلاف تحریریں شائع کرنے اور اسے آزادانہ مباحثہ ومکالمہ کا فورم بنانے، اور ۳۔ راقم الحروف کی سرپرستی کرنے اور میری انفرادی آرا کو ''علمی اختلاف'' قرار دے کر حوصلہ افزائی کرنے کی روش حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی وفات کے بعد اختیار کی ہے اور مذکورہ طرز فکر اپنانے کی وجہ سے وہ گویا اپنے والد محترم کے فکر ومنہج سے منحرف ہو چکے ہیں۔

اس تاثر کی تردید کے لیے اول تو 'الشریعہ' سے متعلق اس تنقیدی تبصرے کا حوالہ دینا کافی ہے جو حضرت شیخ الحدیث کی عین حیات میں ان کی وفات سے ایک ماہ قبل ماہنامہ ''وفاق المدارس'' ملتان کے ربیع الاول ۱۴۳۰ھ کے شمارے میں شائع ہوا۔ تبصرہ نگار نے اس مضمون میں 'الشریعہ' کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''آج جب کہ ہم یہ تبصرہ لکھ رہے ہیں، الشریعہ کی اشاعت کو تقریباً بیس سال مکمل ہونے کو ہیں۔ الشریعہ کی فائلیں دیکھ کر ہمیں انتہائی دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب اس پلیٹ فارم پر اپنے اکابر کی راہِ مستقیم سے الگ ہو رہے ہیں...... الشریعہ کے مدیر حافظ عمار خان ناصر، جاوید احمد غامدی کے شاگرد وخوشہ چین ہیں اور وہ آزاد خیالی میں انھی کے طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی تالیفی کاوشیں اور الشریعہ کی فائلیں ہماری اس بات کی شاہد ہیں اور ماہنامہ 'الشریعہ' کا اجرا بھی اسی طرز فکر کو پروان چڑھانے کے لیے کیا گیا۔''

تبصرے سے واضح ہے کہ ''الشریعہ'' کی جس روش پر اعتراض کیا گیا ہے، وہ حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد کی کوئی ''بدعت'' نہیں، بلکہ الشریعہ کی پچھلی ساری فائلیں اس کی شاہد ہیں۔ اگرچہ اس کے بعد اس تاثر کے بے بنیاد ہونے کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کی زندگی میں مذکورہ تینوں نکات کے حوالے سے ''الشریعہ'' میں شائع ہونے والی اہم اور نمائندہ تحریروں پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ بات پوری طرح مبرہن ہو جائے کہ علمی وفکری مسائل میں والد گرامی کا طرز فکر اور آزادانہ بحث ومباحثہ کے ضمن میں

''الشریعہ'' کا منہج حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد کا واقعہ ہرگز نہیں۔ ان تمام امور سے متعلق والد گرامی کا موقف اور نقطہ نظر بڑے واضح انداز میں اور ''الشریعہ'' کے صفحات پر مسلسل شائع ہوتا رہا اور خاص طور پر حضرت کی زندگی کے آخری نو سال میں آزادانہ بحث ومباحثہ کو فروغ دینے اور حساس اور نازک موضوعات کو زیر بحث لانے کے حوالے سے ''الشریعہ'' نے علمی حلقوں میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔

الشریعہ کے صفحات پر مختلف موضوعات پر تسلسل کے ساتھ بحث ومباحثہ کی روایت کا آغاز ۲۰۰۱ء میں والد گرامی اور جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر کے مابین چند اہم امور پر تبادلہ مضامین سے ہوا۔ والد گرامی نے جناب جاوید احمد غامدی کی بعض آرا پر تنقید لکھی جو روزنامہ اوصاف میں شائع ہوئی۔ اس کے جواب میں غامدی صاحب کے حلقہ فکر کی طرف سے برادرم معز امجد، برادرم خورشید احمد ندیم اور ڈاکٹر محمد فاروق خان مرحوم نے بحث میں حصہ لیا۔ یہ سلسلہ بحث پہلے روزنامہ اوصاف اور روزنامہ پاکستان میں شائع ہوتا رہا اور پھر اس کے زیادہ تر اجزا 'الشریعہ' کے مئی ۲۰۰۱ء کے شمارے میں یکجا شائع کر دیے گئے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے یہ ساری بحث توجہ سے دیکھی تھی، چنانچہ اس کے بعد ایک موقع پر راقم نے ان سے یہ دریافت کیا کہ اس علمی مکالمے میں ریاست کے بغیر جہاد کا جو نکتہ زیر بحث آیا ہے، اس سے متعلق آپ کا موقف کیا ہے۔ میرا گمان یہ تھا کہ اس مسئلے میں وہ شاید غامدی صاحب کے موقف کی تصویب کریں گے، لیکن انھوں نے فرمایا کہ ''جو زاہد نے لکھا ہے، وہ ٹھیک ہے۔''

''الشریعہ'' کے مذکورہ شمارے میں والد گرامی کی تنقید یک طرفہ طور پر شائع نہیں کی گئی تھی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ معز امجد، خورشید احمد ندیم اور ڈاکٹر محمد فاروق خان کے تفصیلی مضامین بھی شامل کیے گئے تھے۔ یہ مباحثہ جس متانت کے ساتھ اور جس علمی انداز میں کیا گیا، اس کی تحسین نہ صرف سنجیدہ قارئین کے ایک وسیع حلقے نے کی بلکہ غامدی صاحب کے حلقہ فکر کے اہل قلم نے بھی اس اسلوب کو سراہا اور اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اسی بحث کے دوران میں والد گرامی نے اہل علم کے تفردات کے حوالے سے اپنا وہ اصولی موقف بیان کیا تھا جسے آج حضرت شیخ الحدیث کے منہج فکر سے انحراف قرار دیا جا رہا ہے۔ والد گرامی نے لکھا تھا کہ:

> ''تفردات'' کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم کا حق ہے جس کا احترام کیا جانا چاہیے بشرطیکہ وہ ان کی ذات یا حلقے تک محدود رہے۔ البتہ اگر کسی ''تفرد'' کو جمہور اہلِ علم کی رائے کے علی الرغم سوسائٹی پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ فکری انتشار اور ایک نئے مکتب فکر کے قیام کا سبب بنتا ہے۔''
> (الشریعہ، مئی ۲۰۰۱ء، ص ۸)

والد گرامی کی یہ تحریر ''الشریعہ'' کے مذکورہ شمارے میں شائع ہوئی تھی اور حضرت شیخ الحدیث نے اسے ملاحظہ فرمانے کے باوجود اس حوالے سے والد گرامی پر کوئی گرفت نہیں فرمائی تھی۔

بعض معاصر ناقدین والد گرامی پر تنقید کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی پیش کر رہے ہیں کہ انھوں نے مولانا معین الدین

خٹکؒ کے درسی افادات کے مجموعہ ''معین القاری'' کے دیباچے میں مولانا مودودی کے نظریات کو ''تفردات'' کا عنوان دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ والد گرامی نے بعینہ یہی بات غامدی صاحب کے ساتھ مذکورہ مکالمے کے دوران میں ایک مضمون میں ۲۰۰۱ء میں بھی تحریر کی تھی جسے حضرت شیخ الحدیثؒ نے براہ راست پڑھا، لیکن اس میں ''گمراہی'' کی کوئی بو محسوس نہیں کی۔ والد گرامی نے لکھا:

''کچھ عرصہ ہوا، ایک صاحب علم دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ علمی تفردات میں مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے پیچھے نہیں ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے کہ ان کے تفردات علما کے حلقہ میں اس شدت کے ساتھ موضوع بحث نہیں بنے جس شدت کے ساتھ مولانا مودودیؒ کے افکار کو نشانہ بنایا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا سندھیؒ اور ابوالکلام آزادؒ کے علمی تفرادت پر ان کے شاگردوں اور معتقدین نے دفاع اور ہر حال میں انہیں صحیح ثابت کرنے کی وہ روش اختیار نہیں کی جو خود مولانا مودودیؒ اور ان کے رفقا نے ان کے تحریروں پر علما کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات پر اپنا لی تھی۔ چنانچہ اس روش کے نتیجے میں وہ جمہور علما کے مدمقابل ایک فریق کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے اور بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہو گیا۔'' (ص ۵۹)

غامدی صاحب کے حلقہ فکر کے ساتھ مذکورہ مکالمے کے ضمن میں ہی والد گرامی نے اپنا یہ اصولی موقف بھی بیان کیا ہے کہ روایتی طور پر مستند اور مسلم چلے آنے والے نقطہ ہائے نظر سے بعد کے آنے والوں کو علمی ونظری طور پر اختلاف کا پورا حق حاصل ہے اور اگر کسی نئی رائے کو جمہور اہل علم کا اعتماد حاصل ہو جائے تو اسے عملی طور پر اختیار بھی کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''کسی بھی شخصیت یا حلقہ کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنے وضع کردہ اصولوں کو پوری امت کے لیے حتمی قرار دے کر امت کے تمام طبقات کو ان پر پرکھنا شروع کر دے، البتہ ان میں سے جس اصول کو امت میں اجماع کا درجہ حاصل ہو جائے یا کم از کم جمہور علما اس سے اتفاق کا اظہار کر دیں، اس کی بات مستثنیٰ ہے۔'' (ص ۶۰)

''ہمیں ان کے مطالعہ وتحقیق اور استنباط واستدلال کے حق سے کوئی انکار اور اختلاف نہیں ہے، مگر اس بات سے ضرور اختلاف ہے کہ وہ اپنے استدلال واستنباط کو صرف اس لیے حرف آخر قرار دے رہے ہیں کہ ان کی سوئی اس نکتہ سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ ان کی جو بات جمہور اہل علم کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر لے گی، ہمیں بھی اسے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا اور اگر کوئی بات جمہور اہل علم کے ہاں قابل قبول نہیں ہوگی تو بھی اسے قبول نہ کرنے کے باوجود دیگر اصحاب علم کے تفردات کی طرف ہم ان کا احترام کریں گے۔'' (ص ۹۱، ۹۲)

والد گرامی نے یہی موقف اس سے کچھ عرصہ قبل روزنامہ ''اوصاف'' کے صفحات میں، جس کے وہ مستقل کالم نگار تھے، خلیفہ کے قریشی ہونے کی شرط کے حوالے سے جاری ایک بحث میں بھی پیش کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ خلیفہ کے قریشی ہونے پر امت کا اجماع ہو گیا تھا۔ یہ بات درست ہے، لیکن خلافت بنو عباس کے خاتمہ کے بعد ترکوں کے آل عثمان کو ان کے قریشی نہ ہونے کے باوجود بطور خلیفہ

المسلمین قبول کر کے پوری امت نے خلیفہ کے لیے قریشی کی شرط ضرور نہ ہونے پر بھی اجماع کر لیا تھا جو صدیوں قائم رہا......اس لیے اگر ایک دور میں خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط پر اجماع تھا بھی تو امت کے دوسرے اجماع کے بعد اس شرط کی وہ حیثیت قائم نہیں رہی۔'' (روزنامہ اوصاف، ۶/اپریل ۲۰۰۰)

اس سے بھی کئی سال قبل ۱۹۹۲ء میں عورت کی حکمرانی کے جواز وعدم جواز کی بحث کے ضمن میں والد گرامی نے فقہی امور میں ماضی کے اجماعی موقف پر علمی بنیادوں پر نظر ثانی کے امکان اور گنجائش کو الشریعہ میں شائع ہونے والی اپنی ایک تحریر میں ان الفاظ میں بیان کیا:

''اس مسئلے پر اجتہاد کے نام پر جانے والا کوئی بھی عمل اس چودہ سوسالہ اجتماعی تعبیر وتشریح اور متفقہ اجتہاد پر نظر ثانی اور اسے ری اوپن کرنے کا عمل کہلائے گا۔ اجتہاد پر نظر ثانی اور اسے ری اوپن کرنے کی بھی کچھ شرائط ہیں اور اس کے کچھ عملی تقاضے ہیں۔ اگر ہمارے دوستوں کے پاس امت مسلمہ کے چودہ سوسالہ اجتماعی تعامل کو ''ری اوپن'' کرنے کی کوئی بنیاد موجود ہو تو اسے سامنے لائیں اور اس سے علمی بحث کا آغاز کریں تاکہ اس بحث کا کوئی علمی فائدہ مرتب ہو اور بحث منطقی طور پر آگے بڑھ سکے، ورنہ جزوی واقعات، دور از کار تاویلات اور مرجوح اقوال کے سہارے ایک بات پر ضد کیے چلے جانا عام آدمی کے ذہن تو میں شاید تشویش پیدا کر سکے، علمی دنیا میں اس کا قطعاً کوئی وزن نہیں ہوگا۔'' (ماہنامہ الشریعہ، جون/جولائی ۱۹۹۲ء)

اپنے اس اصولی موقف کے تناظر میں دور جدید کے مختلف حلقہ ہائے فکر کی مخصوص آرا کو علمی بحث وتمحیص کا موضوع بنانے اور عصر حاضر کے اجتماعی اجتہادی عمل میں ان کی آرا سے استفادے کی ضرورت کو والد گرامی نے 'الشریعہ میں' شائع ہونے والی اپنی تحریروں میں متعدد بار اجاگر کیا اور یہ سب کچھ حضرت شیخ الحدیث کی حیات میں شائع ہوا۔ مثال کے طور پر الشریعہ کے جون ۲۰۰۴ء کے شمارے میں جناب خورشید احمد ندیم کی تنظیم ''ادارہ برائے تعلیم وتحقیق'' کی چند مطبوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے والد گرامی نے لکھا:

''مذکورہ بالا ادارہ محترم جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر سے تعلق رکھنے والے دانش وروں کا ادارہ ہے جس کے منتظم خورشید احمد ندیم ہیں۔ مختلف دینی اور علمی موضوعات پر ان کا ایک مستقل نقطہ نظر اور اسلوب فکر ہے جس کا اظہار ان کے مضامین کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کے ہر نتیجہ فکر سے اتفاق کیا جائے اور ہم بھی جہاں ضرورت محسوس کرتے ہیں، ان کے فکر واسلوب سے بلا تامل اختلاف کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مختلف پیش آمدہ دینی وملی مسائل پر دیگر مکاتب فکر کی طرح ان کے نقطہ نظر سے بھی آگاہی حاصل کی جائے اور علمی بحث ومباحثہ اور مکالمہ کی صورت میں بحث وتمحیص کے سلسلے کو آگے بڑھایا جائے۔''

اسی طرح ۲۰۰۶ء میں جب جناب جاوید احمد غامدی نے اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت سے احتجاجاً استعفا دیا تو اس پر والد گرامی نے اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ:

''میرے لیے یہ خبر افسوس اور رنج کا باعث بنی ہے کہ محترم جاوید احمد غامدی نے اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت سے احتجاجاً استعفا دے دیا ہے۔ غامدی صاحب علوم عربیہ کے ممتاز ماہرین میں شمار ہوتے ہیں اور دینی لٹریچر پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر ہے۔ اسلامی نظریہ کونسل میں ایسے فاضلین کی موجودگی بہت سے معاملات میں راہنمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کی فقہی مجلس میں جہاں بحث ومباحثہ اور مشترکہ فکری کاوش کے ساتھ مسائل کا فقہی حل تلاش کیا جاتا تھا، مختلف اور متنوع علوم وفنون کے ماہرین شریک ہوتے تھے اور ان کی موجودگی اس بات کی ضمانت سمجھی جاتی تھی کہ مسئلے کے تمام علمی اور فنی پہلوؤں پر غور وخوض کے بعد اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔'' (روزنامہ پاکستان، ۲۴ ستمبر ۲۰۰۶ء)

روایتی مذہبی طبقات کے ہاں غیر روایتی علمی حلقوں کے ساتھ رابطے اور اخذ واستفادہ کے حوالے سے جو ایک عمومی منفی ذہنیت پائی جاتی ہے، والد گرامی نے اس پر بھی اپنی تحریروں میں تبصرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر اپریل ۲۰۰۳ء کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''بدقسمتی سے ہم نے ایک بات کم وبیش حتمی سمجھ رکھی ہے کہ ہمارے روایتی حلقوں سے ہٹ کر کوئی بھی شخص یا ادارہ کوئی علمی یا دینی بات کرتا ہے تو وہ یقیناً گمراہی پھیلاتا ہے اور ہم نے اسے بہر حال مخالف کیمپ میں ہی دھکیلنا ہے۔ اگر تو ہم نئے پیش آمدہ مسائل پر غور وخوض اور ان کے حل کے لیے کوئی مربوط نظام رکھتے ہیں اور کوئی بھی مسئلہ پیش آنے پر خود کار نظام کی طرح ہمارا کوئی نہ کوئی حلقہ یا مرکز اس پر غور وفکر اور بحث وتمحیص کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے تو پھر کسی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سسٹم سے ہٹ کر بات کرنے والے کی حوصلہ شکنی کی جائے، لیکن کسی بھی مسئلہ پر ہمارے ہاں اس وقت تحریک ہوتی ہے جب دو چار حلقوں سے بات آ چکتی ہے اور ہم کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو دفاعی ضروریات کے تحت متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا سارا عمل دفاع اور تحفظات کے گرد گھومنے لگتا ہے اور اصل کرنے کا کام اسی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ انتہائی پریشان کن صورت حال ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے، غیر روایتی علمی حلقوں کے حوالے سے ترجیحات قائم کرنی چاہییں اور جہاں افہام وتفہیم سے کام لینا ممکن ہو، اسے موہوم گمراہی کی نذر کر دینے کے بجائے قابل قبول غیر روایتی حلقوں سے استفادہ کی صورتیں نکالنی چاہییں۔''

اگست ۲۰۰۴ء کے شمارے میں ''دینی مدارس میں تحقیق وتصنیف کی صورت حال'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اپنے مقالے میں والد گرامی نے اسی رویے پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے کہ:

''○ تحقیق ومطالعہ کا جدید اسلوب، طریق کار، ذرائع اور بین الاقوامی سطح کے علمی وتحقیقی اداروں کے کام اور طرز سے استفادہ دینی مدارس کے نزدیک ابھی تک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ صرف بین الاقوامی زبانوں سے ناواقفیت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بھی اس کا باعث ہے کہ ہمیں دنیا کے دیگر تمام حلقوں پر علمی اور فکری برتری حاصل ہے اور ہمیں کسی دوسرے حلقہ کے علمی کام

سے واقف ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

o دینی مدارس میں عالم اسلام کے علمی حلقوں کی تحقیقات، دوسرے مسالک کے علمی کام اور غیر روایتی علمی مراکز کی تحقیقی مساعی سے استفادہ کو اپنی نفسیاتی برتری کے منافی تصور کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بعد اور فاصلہ قائم رکھنے کو بھی تحفظاتی حکمت عملی کا ایک ناگزیر حصہ بنالیا گیا ہے۔''

اب آیئے، مباحثہ ومکالمہ کے حوالے سے ''الشریعہ'' کی پالیسی اور اس ضمن میں دیوبندی مسلک سے وابستگی کے حوالے سے پیدا ہونے والی الجھن کی طرف۔ اس ضمن میں یوں تو والد گرامی کی وضاحتی تحریریں بار بار ''الشریعہ'' میں شائع ہوتی رہی ہیں، تاہم ''الشریعہ'' کی سترہویں جلد کے آغاز کے موقع پر جنوری ۲۰۰۶ء کے شمارے میں انھوں نے اس پالیسی کے اہم اور اساسی نکات کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہمارا طریق کار یہ رہا ہے کہ بعض مسائل کو ہم از خود چھیڑتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہمارا موقف بھی وہی ہو جو کسی مسئلہ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے 'الشریعہ' کے صفحات میں پیش کیا گیا ہے، مگر ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دینی حلقوں کے ارباب فکر ودانش اس طرف توجہ دیں، مباحثہ میں شریک ہوں، اپنا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کریں، جس موقف سے وہ اختلاف کر رہے ہیں، اس کی کمزوری کو علمی انداز سے واضح کریں اور قوت استدلال کے ساتھ اپنے موقف کی برتری کو واضح کریں، کیونکہ اب وہ دور نہیں رہا کہ کسی مسئلہ پر آپ اپنی رائے پیش کر کے اس کے حق میں چند دلائل کا تذکرہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جائیں کہ رائے عامہ کے سامنے آپ کا موقف واضح ہو گیا ہے اور آپ کی بات کو قبول کر لیا جائے گا۔ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے، تجزیہ واستدلال کا دور ہے اور معروضی حقائق کی تفصیلات وجزئیات تک رسائی کا دور ہے۔ آپ کو یہ سارے پہلو سامنے رکھ کر اپنی بات کہنا ہوگی اور اگر آپ کی بات ان میں سے کسی بھی حوالے سے کمزور ہوگی تو وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے گی۔ ہم جب کسی مسئلے پر بحث چھیڑتے ہیں تو امکانی حد تک اس کے بارے میں تمام ضروری پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہمارا مقصد ہوتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ 'الشریعہ' میں شائع ہونے والے کسی موقف کے حق میں یا اس کے خلاف موصول ہونے والا کوئی مضمون یا مراسلہ اشاعت سے رہ نہ جائے اور اس بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

اس صورت حال سے بعض دوستوں کو الجھن ہوتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں یہ الجھن عام طور پر دو وجہ سے ہوتی ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ بہت سے دوست ہمارے اس طریق کار اور مقصد کو سمجھ نہیں پاتے جس کا سطور بالا میں تذکرہ ہو چکا ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ ہمارے خاندانی پس منظر کے باعث بہت سے دوست 'الشریعہ' کو ایک مسلکی جریدہ کے طور پر دیکھنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے مسلک ومشرب کا تعلق ہے، ہم نے سولہ برس قبل 'الشریعہ' کے پہلے شمارے میں ہی یہ بات

دوٹوک طور پر واضح کر دی تھی کہ ہم اہل السنۃ والجماعۃ میں سے ہیں اور اہل سنت کے مسلمات کی پابندی کو اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم فقہی مذہب کے لحاظ سے حنفی ہیں اور فروع واحکام میں حنفی مذہب کے اصول اور تعبیرات کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ مسلک ومشرب کے حوالے سے دیوبندی ہیں اور اکابر علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی جدوجہد اور افکار سے راہ نمائی حاصل کرنا اپنے لیے باعث سعادت تصور کرتے ہیں، لیکن 'الشریعہ' کو مسلکی ترجمان کے طور پر ہم نے کبھی پیش نہیں کیا۔ مسلک کی ترجمانی کے لیے ملک میں درجنوں جرائد موجود ہیں اور ہم بھی اس مقصد کے لیے ان سے حتی الوسع تعاون کرتے ہیں، مگر ہمارا عملی میدان اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری تگ وتاز کا دائرہ فقہی اور مسلکی کشمکش نہیں، بلکہ مغرب کے فکر وفلسفہ اور تہذیب وثقافت کی وسیع تر یلغار کے تناظر میں اسلامی تعلیمات واحکام کو جدید زبان اور اسلوب میں پیش کرنا ہے۔ اس کا مطلب فقہی اور مسلکی جدوجہد کی ضرورت سے انکار نہیں بلکہ یہ ایک تقسیم کار ہے کہ دینی جدوجہد کا یہ شعبہ ہم نے اپنی جدوجہد کے لیے مختص کر لیا ہے اور اسی میں اپنی صلاحیتیں صرف کرنا چاہتے ہیں۔

بعض دوستوں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ 'الشریعہ' میں بسا اوقات ایک ہی مسئلہ پر متضاد مضامین شائع ہوتے ہیں اور بعض مضامین اہل سنت، حنفیت اور دیوبندیت کے حوالوں سے روایتی موقف سے متصادم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے، مگر اس کی وجہ وہی ہے جس کا سطور بالا میں ہم تذکرہ کر چکے ہیں کہ ہم علمی وفکری مسائل میں ارباب علم ودانش کو بحث ومباحثہ کے لیے کھلا ماحول اور فورم مہیا کرنا چاہتے ہیں اور دینی حلقوں میں باہمی مکالمہ کا ذوق بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریق کار ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا۔''

اس پالیسی کے تحت حضرت شیخ الحدیث کی حیات میں جن اہم علمی بحثوں کو ''الشریعہ'' میں جگہ دی گئی، ان پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا:

۲۰۰۱ء میں ہونے والے علمی مکالمے کے بعد ۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۹ء تک غامدی صاحب کے افکار اور ان پر نقد وجرح ''الشریعہ'' کا غالباً نمایاں ترین موضوع بنا رہا اور غامدی صاحب کے نظریات سے متعلق مختلف اہل قلم کی تنقیدی تحریریں اور ان کے جوابات ''الشریعہ'' میں ایک تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ تنقیدی تحریروں میں اہم یہ تھیں:

اسلام اور تجدد پسندی از ڈاکٹر محمد امین (جنوری ۲۰۰۶ء)

غامدی صاحب کے تصور فطرت کا تنقیدی جائزہ از حافظ محمد زبیر (فروری ۲۰۰۷ء)

قراءات متواترہ کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کا تنقیدی جائزہ از حافظ محمد زبیر (جون ۲۰۰۷ء)

کیا قرآن قطعی الدلالۃ ہے؟ (چار اقساط) از حافظ محمد زبیر (نومبر ۲۰۰۷ء تا فروری ۲۰۰۸ء)

غامدی صاحب کے نظریہ اخلاق کا تنقیدی جائزہ از محمد زاہد صدیق مغل (فروری ۲۰۰۸ء)

کیا فطرت اصلاً یا تبعاً مصدر شریعت ہے؟ از حافظ محمد زبیر (مئی ۲۰۰۸ء)

غامدی صاحب کا ''تصور سنت'' از ابو عمار زاہد الراشدی (جون ۲۰۰۸ء)

حلال وحرام اور غامدی صاحب کا تصور فطرت از حافظ محمد زبیر (جون ۲۰۰۸ء)
جمعے کی امامت اور غامدی صاحب کا نقطہ نظر از الیاس نعمانی ندوی (اگست ۲۰۰۸ء)
ان تنقیدات کے جواب میں غامدی صاحب کے حلقہ فکر کی طرف سے درج ذیل تحریریں 'الشریعۃ' میں شائع ہوئیں:
ناقدین کی خدمت میں از طالب محسن/محمد عثمان (جنوری ۲۰۰۶ء)
اصولوں پر تنقید از طالب محسن (جولائی ۲۰۰۶ء)
محمد ابراہیم شیخ کا مکتوب (مارچ ۲۰۰۷ء)
غامدی صاحب کے تصور فطرت پر اعتراضات کا جائزہ از سید منظور الحسن (جولائی ۲۰۰۷ء)
غامدی صاحب کا تصور فطرت۔ چند توضیحات از سید منظور الحسن (ستمبر ۲۰۰۷ء)
غامدی صاحب کے تصور 'کتاب' پر اعتراضات از سید منظور الحسن (نومبر ۲۰۰۷ء)
محمد رفیع مفتی کا مکتوب (اگست ۲۰۰۸ء)
غامدی صاحب کے تصور سنت پر اعتراضات کا جائزہ (چار اقساط) از سید منظور الحسن (جنوری تا اپریل ۲۰۰۹ء)

نائن الیون کے واقعہ کے بعد اس خطے میں جہادی تحریکات کی حکمت عملی اور اس کے نتائج واثرات کا، ایک زندہ اور بے لاگ بحث ومباحثہ کا موضوع بننا ناگزیر تھا۔ الشریعہ نے اس اہم ضرورت کو بالکل بروقت محسوس کیا اور اس بحث کو اپنے دائرۂ موضوعات میں نمایاں طور پر شامل کیا۔ نومبر/دسمبر ۲۰۰۲ء میں الشریعہ کے رئیس التحریر کا ایک اہم مکتوب، جو سہ ماہی مصباح الاسلام کے مدیر کے نام لکھا گیا تھا، الشریعہ کے ٹائٹل کے اندرونی صفحے پر شائع ہوا جس میں انھوں نے لکھا کہ:

''طالبان حکومت کے بارے میں بحث کے حوالے سے مجھے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے کہ ان کی پالیسیوں پر بحث نہیں ہونی چاہیے اور ان کی کوتاہیوں کو سامنے نہیں آنا چاہیے۔ ان کے اخلاص، ایثار، قربانی، للّٰہیت اور صدق وصفا میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس کا مطلب معصوم ہونا نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خود احد اور حنین کے حوالے سے صحابہ کرام جیسی پاک باز ہستیوں کی بشری غلطیوں کو قرآن کریم میں اجاگر کر سکتے ہیں تو ہمیں اس میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ پوری سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ اس امر کا جائزہ لیں کہ کہاں کہاں غلطی ہوئی ہے اور ماضی کی غلطیوں کے ازالہ کے لیے مستقبل میں کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس صورت حال پر مباحثہ کی ضرورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے لیے ابھی شاید وقت موزوں نہ ہو، لیکن جلد یا بدیر ہمیں اس مرحلہ سے گزرنا ہوگا، ورنہ مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی میں ہم کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔''

اس تناظر میں جہادی تحریکات کی حکمت عملی کے حوالے سے جو اہم تنقیدی تحریریں حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی حیات میں 'الشریعۃ' کے صفحات پر شائع ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں:

جہادی تحریکات اور ان کا مستقبل۔ ابوعمار زاہد الراشدی (جنوری ۲۰۰۲ء)
خواب جو بکھر گیا! طالبان کی شکست کے اسباب وعوامل کا ایک جائزہ۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (جنوری ۲۰۰۳ء)

ان کی پرکاری اور ہماری سادگی۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (جنوری فروری ۲۰۰۴ء)

جہادی حکمت عملی: مثبت اور منفی پہلو (مارچ ۲۰۰۴ء)

پاکستان کی جہادی تحریکیں: ایک تاریخی وتحقیقی جائزہ۔ حافظ محمد زبیر (نومبر/دسمبر ۲۰۰۸ء)

جہادی تنظیموں کے تنقیدی جائزہ پر ایک نظر۔ عبدالمالک طاہر (مارچ ۲۰۰۹ء)

مسجد اقصیٰ کی تولیت کے مسئلے پر راقم الحروف کی تحریر ''مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ'' کے عنوان سے ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس میں جو نقطہ نظر اختیار کیا گیا، اس پر علمی حلقوں میں اضطراب پیدا ہونا فطری تھا، چنانچہ ''الشریعہ'' کے علاوہ متعدد دیگر جرائد ورسائل میں بھی اس پر زور دار بحث چلی جو ''الشریعہ'' کے صفحات پر وقفے وقفے سے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۷ء تک جاری رہی۔ اس ضمن کی اہم تحریریں حسب ذیل ہیں:

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ از محمد عمار خان ناصر (ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۳ء)

ارض فلسطین پر یہود کا حق از محمد عمار خان ناصر (ستمبر اکتوبر ۲۰۰۳ء)

مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حق دار کون؟ از مولانا محمد یوسف (دسمبر ۲۰۰۳ء)

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ (مختلف ناقدین کی آرا) (دسمبر ۲۰۰۳ء)

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ: تنقیدی آرا کا جائزہ از محمد عمار خان ناصر (اپریل/مئی ۲۰۰۴ء)

مسجد اقصیٰ کی تولیت: ایک تاریخی وتحقیقی جائزہ از حافظ محمد زبیر (مارچ ۲۰۰۷ء)

مسجد اقصیٰ کی بحث اور حافظ محمد زبیر کے اعتراضات از محمد عمار خان ناصر (مارچ ۲۰۰۷ء)

مدیر ''محدث'' کے ساتھ عمار خان ناصر کی مراسلت (اپریل ۲۰۰۷ء)

شیعہ سنی اختلافات اور ان کی بنیاد پر شدت پسندی اور قتل وغارت گری کا موضوع بھی الشریعہ میں خاص اہمیت کے ساتھ زیر بحث لایا جاتا رہا ہے۔ اہل تشیع کی تکفیر کے حوالے سے حضرت شیخ الحدیث کا موقف واضح تھا، تاہم ان کی زندگی میں اس رائے سے اختلاف کرنے والے متعدد مضامین الشریعہ میں شائع ہوئے، مثلاً:

شیعہ سنی تعلقات اور متوازن رویہ۔ ایک شیعہ عالم کے خیالات۔ ڈاکٹر یوگندر سکند (اگست ۲۰۰۴ء)

شیعہ سنی مسئلہ مولانا دریابادی کی نظر میں۔ محمد موسیٰ بھٹو (دسمبر ۲۰۰۴ء)

شیعو اور سنیو! تاریخ سے سبق سیکھو۔ سید فخر الحسن کراروی (جنوری ۲۰۰۵ء)

شیعہ سنی مکالمہ: الشیخ قرضاوی کے خیالات۔ ڈاکٹر یوگندر سکند (اپریل ۲۰۰۵ء)

شیعہ سنی تنازع اور اس کا پائیدار حل۔ ڈاکٹر محمد امین (مئی ۲۰۰۵ء)

اس کے جواب میں تکفیر شیعہ کے موقف کی تائید میں درج ذیل تحریریں شائع کی گئیں:

تکفیر شیعہ سے متعلق چند ضروری وضاحتیں۔ حافظ عبدالرشید (جولائی ۲۰۰۵ء)

اہل تشیع کی تکفیر کا مسئلہ۔ آفتاب عروج/حافظ محمد عثمان (اکتوبر ۲۰۰۵ء)

دور جدید میں اجتہاد کا تصور، اس کے حدود و قیود اور اجتہاد کی اہلیت، علمی سطح پر بحث و مباحثہ کا ایک اہم عنوان ہے اور اس حوالے سے روایتی و غیر روایتی نقطہ ہائے نظر کی باہمی کشمکش ایک معلوم حقیقت ہے۔ اس تناظر میں 'الشریعۃ' میں بھی اس بحث کے اہم اصولی پہلوؤں پر مختلف حلقہ ہائے فکر کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع دیا گیا ہے اور قارئین بہت سی نرم گرم بحثیں الشریعہ کے صفحات پر ملاحظہ کرتے رہے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی حیات میں اس ضمن میں جو مضامین شائع ہوئے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

تجدد پسندوں کا تصور اجتہاد۔ ابوعمار زاہد الراشدی (جنوری ۲۰۰۷ء)

علامہ اقبال کا تصور اجتہاد اور علمائے کرام۔ یوسف خان جذاب (جنوری ۲۰۰۷ء)

سید حسین احمد مدنی اور تجدد پسندی۔ میاں انعام الرحمٰن (فروری ۲۰۰۷ء)

حضرت مدنی اور تجدد پسندی۔ مفتی رشید احمد علوی (مارچ ۲۰۰۷ء)

در جواب آں غزل۔ امجد علی شاکر (مارچ ۲۰۰۷ء)

سید مدنی، تجدد پسندی اور قدامت پسند حلقے۔ میاں انعام الرحمٰن (اپریل ۲۰۰۷ء)

اسلام کی تشکیل نو کی تحریکات اور مارٹن لوتھر۔ ابوعمار زاہد الراشدی (مارچ ۲۰۰۷ء)

الشریعہ کی ادارتی ٹیم میں برادرم میاں انعام الرحمٰن صاحب کی شمولیت ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سے روایتی مذہبی حلقوں کے طرز فکر اور طرز عمل سے متعلق ان کے ''باغیانہ'' خیالات ایک جارحانہ اسلوب نگارش میں تسلسل کے ساتھ الشریعہ کے صفحات پر شائع ہوتے رہے ہیں اور متعدد بار ناقدین کی طرف سے اسی جوابی اسلوب میں ''داد'' بھی وصول کر چکے ہیں۔ تصور اجتہاد کے حوالے سے ان کے چند مضامین کا گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ مثال کے طور پر یہ چند مضامین دیکھیے:

سماجی تبدیلی کے نئے افق اور امت مسلمہ۔ میاں انعام الرحمٰن (اگست ۲۰۰۳ء)

برصغیر کی مذہبی فکر کا ایک تنقیدی جائزہ۔ میاں انعام الرحمٰن (مارچ ۲۰۰۴ء)

دین اسلام کی معاشرتی ترویج میں آرٹ کی اہمیت۔ میاں انعام الرحمٰن (جون ۲۰۰۴ء)

قرآنی علمیات اور معاصر مسلم رویہ۔ میاں انعام الرحمٰن (جنوری ۲۰۰۶ء)

دور جدید کی اجتہادی ضروریات کے تناظر میں روایتی فقہی حد بندیوں سے اٹھ کر وسیع تر دائرے میں امت کی مجموعی علمی میراث سے فائدہ اٹھانے کا تصور بھی ''الشریعۃ'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن کی ایک اہم تحریر، جو مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے ہے، نومبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی جس میں مولانا فرماتے ہیں:

''الف ثانی کے مجدد ہند رحمۃ اللہ علیہ نے ارقام فرمایا ہے:.. ''اس خطہ ہندوستان میں جہاں ابتلا کی یہ صورت زیادہ پیش آئی ہے تو عموم بلویٰ (عام مصیبت) کی حیثیت اس مسئلہ نے اختیار کر لی ہے۔ یعنی بہتر اور زیادہ

پسندیدہ بات ہے کہ فتویٰ اس پہلو کے مطابق دیا جائے جو آسان اور زیادہ سہل ہو، خواہ فتویٰ دینے والے مفتی کے مسلک کے مطابق یہ فتویٰ نہ ہو۔ کسی دوسرے مجتہد کے قول کے مطابق فتویٰ کا ہونا ایسی صورت میں کافی ہے۔''

عام مولویوں کے لیے ظاہر ہے کہ فتوے میں اتنی مطلق العنانی ذرا مشکل ہی سے قابل برداشت خصوصاً اس زمانہ میں ہو سکتی تھی جس زمانے میں مجدد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے تھے کہ ندوہ اس وقت تک ہندوستان میں قائم نہیں ہوا تھا، اس لیے بجائے فقہ یا آثار و اخبار کے اس موقع پر حضرت مجدد نے قرآنی آیات ہی کو استدلال میں پیش کیا ہے۔...... معمولی عام کتابوں میں تلفیق کے نام سے مسلمانوں میں خوف و دہشت کی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے، یعنی مجتہدین ائمہ ہدیٰ میں سے کسی ایک امام کے اجتہادی نتائج کے ساتھ ہم آہنگی کا فیصلہ تاریخ کے مختلف وجوہ و اسباب کے تحت مختلف ممالک کے مسلمانوں کو کرنا پڑا تو سمجھا یا جاتا ہے کہ آئندہ اپنے اپنے مانے ہوئے امام کے خلاف عمل کی اجازت ان کی آئندہ نسلوں کو نہیں دی جائے گی۔ ایسے آدمی کو فعل مذموم اور ''عمل تلفیق'' کا مرتکب ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ واقع کے لحاظ سے مسئلہ کی صحیح صورت حال...... یہ نہیں ہے۔''

اسی ضمن میں اگست ۲۰۰۷ء کے شمارے میں اسلامی قانون کے ممتاز ماہر جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کا ایک مضمون ''دور جدید کی اجتہادی ضروریات اور تقاضے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے عصر حاضر میں مختلف اسلامی ممالک میں کیے جانے والے اہم قانونی اجتہادات کی مثالیں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر ہم گزشتہ صدی کے اسلامی ادب میں قانون سازی کے حالیہ مضمرات کا مطالعہ کریں جس کا آغاز اکثر اسلامی ممالک میں اس صدی کے ربع اول میں ہوا تو ہمیں بہت سی ایسی قانونی دفعات ملیں گی، خصوصاً عائلی قوانین جن میں اضافی اجتہاد سے کام لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ترکی، پاکستان اور ایران کے قوانین ہیں جن کی رو سے ہر ملک کے اپنے اپنے قوانین نکاح میں بعض جزئی اختلافات کے ساتھ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ طلاق کا اندارج یا توثیق ریاست کی مقرر کردہ کسی ہیئت (اتھارٹی) سے کروائی جائے۔ تعدد ازواج کے معاملے میں بھی عراق، شام، مراکش، اردن، پاکستان اور کچھ دیگر اسلامی ممالک میں مردوں کے اس بلا قید اختیار پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ وہ بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہیں، تاہم تیونس کے قانون میں تعدد ازواج پر مکمل پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس معاملے میں تیونس کا قانون دیگر مسلم ممالک کے مقابلہ میں منفرد ہے۔

مصر میں تمام طلاقیں، سوائے اس طلاق کے جو دخول سے پہلے دی گئی ہو یا وہ جس کا معاوضہ لے لیا گیا ہو یا وہ تین طلاقیں جو تین طہر میں دی گئی ہوں، ۱۹۲۹ء کے قانون کی رو سے رجعی قرار دے دی گئی ہیں۔ سوڈان میں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق ایک وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک رجعی طلاق قرار دے دیا گیا ہے۔ شام میں بھی ایکٹ ۱۹۵۳ء کی رو سے ایسا ہی قانون اپنا لیا گیا ہے جیسا مصر میں رائج ہے۔ عراق، مراکش اور اردن میں بھی انہی خطوط پر قانون بنائے گئے ہیں، تاہم لبنان اور انڈونیشیا میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں کو غیر رجعی

سمجھا جاتا ہے اور مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ حلالہ کے بغیر اس عورت سے دوبارہ نکاح کر لے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہی صورت رائج ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین کے آرڈی نینس مجریہ ۱۹۶۱ء کے تحت طلاق سوائے اس صورت کے جبکہ اس سے رجوع کر لیا گیا ہو، یونین کمیٹی کے چیئرمین کو خاوند کی جانب سے جس نے طلاق دی ہے، قطع نظر اس امر کے کہ ایک طلاق دی ہے یا دو یا تین یا زیادہ طلاقیں اور یہ کہ ایک وقت میں دی ہیں یا مختلف اوقات میں، طلاق کا نوٹس ملنے کی تاریخ سے نوے دن گزر جانے کے بعد موثر ہوتی ہے۔

قانون وراثت میں روایتی قانون کے مطابق یتیم پوتے پوتیاں اپنے دادا کی وراثت سے محروم رہتے ہیں، لیکن مصر کے قانون انتظام وصیت مجریہ ۱۹۴۶ء کے تحت لازمی میراث کا طریقہ رائج کیا گیا ہے جس کے مطابق یتیم پوتوں اور پوتیوں کو اپنے دادا کی میراث میں اتنے حصے کا مستحق قرار دیا گیا ہے جتنا حصہ ان کے والدین کو زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔ تاہم یہ حصہ کل میراث کے ایک تہائی حصے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔''

اسی ضمن میں زیر بحث آنے والے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ اس حوالے سے مختلف اوقات میں درج ذیل تحریروں نے الشریعہ میں جگہ پائی جن میں سے یہ رجحان پیش کیا گیا تھا کہ بحالات موجودہ عملی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جائے:

مسئلہ طلاق ثلاثہ۔ علماء کرام توجہ فرمائیں۔ ڈاکٹر محمد اکرم ورک (جون ۲۰۰۵ء)

مسئلہ طلاق ثلاثہ اور فقہائے امت۔ محمد افتخار تبسم نعمانی (جون ۲۰۰۶ء)

ان کے تقابل میں حضرت شیخ الحدیث کی درج ذیل تحریر بھی بحث میں شامل کی گئی:

تین طلاقوں کے بارے میں جمہور کا موقف۔ مولانا سرفراز خان صفدر (جولائی ۲۰۰۶ء)

الشریعہ میں شائع ہونے والے درج ذیل مضامین میں بہت سے ایسے فکری سوالات اٹھائے گئے ہیں جو اپنے نظری اور عملی حل کے لیے اہل علم کی توجہ کے منتظر اور غیر روایتی زاویہ نظر کے متقاضی ہیں:

مسلمان معاشرے اور تعلیمات اسلام، فکری کنفیوژن کیوں؟ ارشاد احمد حقانی (جولائی ۲۰۰۲)

عصر حاضر میں اسلامی فکر۔ چند توجہ طلب مسائل۔ نجات اللہ صدیقی (جولائی ۲۰۰۲)

فکری مسائل کے حوالے سے چند اہم گزارشات۔ ابو عمار زاہد الراشدی (جولائی ۲۰۰۲)

عالم اسلام کے فکری مسائل۔ خورشید احمد ندیم / منظور الحسن (اگست ۲۰۰۲)

مسلم امہ کو درپیش فکری مسائل۔ ڈاکٹر محمد امین (فروری ۲۰۰۳ء)

فکر اسلامی کو درپیش عصری چیلنج۔ تجمد اور تجدد کے درمیان راہ توسط کی تلاش۔ ڈاکٹر محمد امین (ستمبر ۲۰۰۷ء)

علمی وفکری مسائل سے متعلق راقم الحروف کی بہت سی غیر روایتی آرا بھی گزشتہ کافی عرصے سے بحث ومباحثہ اور نقد وجرح کا موضوع ہیں اور روایتی مذہبی فکر سے وابستہ اہل علم اپنے زاویہ نظر سے بجا طور پر ان سے شدید اختلاف

رکھتے ہیں۔ والد گرامی نے اس ضمن میں بھی اپنا نقطہ نظر حضرت شیخ الحدیثؒ کی حیات میں ایک سے زائد مرتبہ واضح کیا اور اس نوع کی وضاحتیں متعدد بار الشریعہ کے صفحات پر شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر اپریل رمئی ۲۰۰۴ء کے شمارے میں والد گرامی نے مسجد اقصیٰ کی تولیت کے ضمن میں میرے نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

''عزیزم سلمہ نے ایک علمی و تحقیقی عنوان پر اپنے مطالعہ و تحقیق کا حاصل اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ میں خود اس پر اپنے موقف اور بعض تحفظات کا اظہار اپنے تبصرہ میں کر چکا ہوں جو ''الشریعہ'' کے ایک گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے، لیکن میں اسے اس عزیز کا بلکہ مطالعہ و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کا حق سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج کو سامنے لائے اور اپنا موقف دلائل کے ساتھ پیش کرے اور اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ طعن و تشنیع کا سہارا لینے کے بجائے دلائل کی بنیاد پر اختلاف کرے اور اس کا اختلاف بھی اسی طرح ''الشریعہ'' کے صفحات کی زینت بنے مگر مجھے افسوس ہے کہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ناظم اور ہمارے رفیق کار مولانا حافظ محمد یوسف کے سوا کسی اور اختلاف کرنے والے دوست نے اسے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا موضوع نہیں بنایا جبکہ ہماری خواہش ہے کہ اہل علم آج کی دنیا کے ایک اہم بین الاقوامی تنازع کے اس علمی پہلو کو سنجیدگی سے لیں اور دلائل کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کریں کیونکہ علمی مباحثہ کے ساتھ ہی اس قسم کے مسائل میں اصل صورت حال تک رسائی ہوتی ہے۔''

دسمبر ۲۰۰۷ء میں میرا ایک مفصل مقالہ ''شریعت، مقاصد شریعت اور اجتہاد'' کے زیر عنوان ''الشریعہ'' میں شائع ہوا جس میں، میں نے مقاصد شریعت کی بنیاد پر منصوص احکام میں تبدیلی کے تصور کا تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے امور پر از سر نو غور و فکر کی ضرورت واضح کی تھی جو روایتی طور پر طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ والد گرامی نے اس مضمون کی تمہید کے طور پر ایک تفصیلی شذرہ لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

''عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے زیر نظر مقالہ میں مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور انتہائی عرق ریزی اور نکتہ رسی کے ساتھ اس کے مختلف زاویوں کو اہل علم کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے مقالہ کے دونوں پہلوؤں سے اصولی طور پر اتفاق ہے کہ : ۱۔ مقاصد و مصالح کے معیارات تبدیل ہو جانے کی بنیاد پر قرآن وسنت کے صریح احکام میں تغیر و تبدل کا کوئی جواز نہیں ہے، اور ۲۔ جو امور اجتہاد کے دائرے میں آتے ہیں اور جن مسائل و معاملات میں احوال و زمانہ کے تغیرات کا مجتہدین کے ہاں ہمیشہ لحاظ رکھا جاتا رہا ہے، ان میں قطعی جمود کی موجودہ صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے بلکہ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت آج بھی موجود ہے جو زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ البتہ اس مقالہ کی تمام جزئیات اور ترجیحات سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور ہر علمی بحث و مباحثہ کی طرح اس کے مختلف پہلوؤں پر بھی مزید بحث، اختلاف اور نقد کی گنجائش موجود ہے۔''

۲۰۰۸ء میں ''حدود وتعزیرات: چند اہم مباحث'' کے نام سے میری ایک تصنیف المورد کے زیر اہتمام شائع ہوئی جس میں حدود وتعزیرات سے متعلق شرعی احکام کی تعبیر وتشریح کے ضمن میں عصر حاضر کی اہم علمی بحثوں کا ایک طالب علمانہ مطالعہ پیش کیا گیا تھا۔ والد گرامی نے اس پر تفصیلی پیش لفظ لکھا جو الشریعہ کے اکتوبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں ''اسلامی شریعت کی تعبیر وتشریح۔ علمی وفکری سوالات'' کے عنوان سے کلمہ حق کے طور پر شائع ہوا۔ والد گرامی نے اس میں لکھا کہ:

''کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے علمی بحث ومباحثہ کا میدان محدود نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی ماضی میں اہل علم کے ہاں اس کا دائرہ کبھی تنگ رہا ہے۔ ہماری علمی روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر بحث ومباحثہ ہمیشہ کھلے دل ودماغ سے کیا گیا ہے، مسئلہ کے ہر پہلو پر بات ہوئی ہے، تجزیہ وتنقیح کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا اور استدلال واستنباط کی کوئی گنجایش ادھوری نہیں رہنے دی گئی، کیونکہ جس طرح کسی مقدمے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے تفتیش کے کسی امکانی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کسی علمی مسئلے میں صحیح نتیجے تک رسائی کے لیے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو کھنگالنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اسی وجہ سے میں اہل علم میں بحث ومباحثہ کے لیے کھلے ماحول کو پسند کرتا ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں۔...........

آج کے نوجوان اہل علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں، وہ نہ ماضی سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم وجدید میں تطبیق کی کوئی قابل قبول صورت نکل آئے، مگر انھیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت 'قدامت پرستی' اور 'تجدد پسندی' کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہل علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے اسی علمی کاوش کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے اور زیادہ وسیع تناظر میں حدود وتعزیرات اور ان سے متعلقہ امور ومسائل پر بحث کی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو سے اتفاق کیا جائے، البتہ اس علمی کاوش کا یہ حق ضرور بنتا ہے کہ اہل علم اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، بحث ومباحثہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر اظہار خیال کریں اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں، اسے انسانی فطرت کا تقاضا تصور کرتے ہوئے علمی مواخذہ کا حق استعمال کریں تاکہ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ان کی معاونت بھی شامل ہو جائے۔''

(حضرت شیخ الحدیث کی بیماری کے آخری ایام میں میری اس تصنیف کی شکایت حضرت کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس کے کچھ ''ایمان سوز'' اقتباسات بھی حضرت کو پڑھ کر سنائے گئے تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس موقع پر صرف میرے

اقتباسات سنانے پر اکتفا کی گئی ہو اور ''اصل بات'' حضرت کے سامنے پیش نہ کی گئی ہو، یعنی یہ کہ آپ کے منتخب کردہ جانشین نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے اور صاحب کتاب کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کا اپنا فریضہ قرار دیا ہے۔)

اس تحریر میں ''الشریعۃ'' میں جگہ پانے والے جملہ مباحث کا استقصا ظاہر ہے کہ مقصود نہیں، تاہم مذکورہ جائزے سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ مختلف اور متنوع علمی سوالات اور فقہی واجتہادی موضوعات کو زیر بحث لانے اور اس پر کوئی بھی نقطہ خیال رکھنے والے اہل علم کو آزادی سے اپنا موقف پیش کرنے کی روایت کم از کم ان آٹھ نو سالوں میں ایک مستقل پالیسی اور معمول کے طور پر جاری تھی۔ چنانچہ یہ اعتراض بالکل بے سروپا ہے کہ یہ منہج حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد اختیار کیا گیا ہے۔ یہ کہنا بھی ایک دور از کار توجیہ کے مترادف ہوگا کہ یہ چیز حضرت شیخ کے سامنے اور ان کے علم میں نہیں تھی۔ اول تو جب تک ان کی صحت نے اجازت دی، وہ خود باقاعدہ الشریعہ کے قاری تھے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس عرصے میں شائع ہونے والے بہت سے مباحث براہ راست ان کی نظر میں تھے۔ شدید علالت کے زمانے میں وہ خود مطالعہ نہیں کر سکتے تھے، لیکن وہ اپنے پاس موجود خادمین سے اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ بالفرض وہ خود نہ بھی پڑھتے یا پڑھوا کر سنتے ہوں، پھر بھی اپنے خاندان میں، اپنی سرپرستی میں اور اپنے بیٹے اور جانشین کی زیر ادارت شائع ہونے والے مجلّے کے رجحانات اور مسائل ومباحث سے وہ کسی طرح بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ الشریعہ ان کے خاندان میں اور ارد گرد کے ماحول میں ہر جگہ پڑھا جاتا تھا اور اس میں شائع ہونے والے بعض مباحث، مثلاً طلاق ثلاثہ سے متعلق مضامین پر تو کئی لوگ باقاعدہ شکایت لے کر ان کے پاس گئے تھے۔

یہ توجیہ بھی بدیہی طور پر بے کار ہوگی کہ وہ علالت کی وجہ سے اس معاملے میں کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے، کیونکہ ان کا والد گرامی اور خاندان کے تمام قریبی افراد سے مسلسل رابطہ تھا اور وہ جملہ معاملات سے باخبر بھی رہتے تھے اور اپنی رائے بھی دیا کرتے تھے۔ اپنے آخری دنوں کی شدید علالت میں انھوں نے عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر سے مولانا طارق جمیل کے بعض نظریات پر اپنی راہ نمائی میں تنقید لکھوائی تھی اور باقاعدہ سن کر اس کی تصویب کی تھی۔ غرض کوئی وجہ یا کوئی عذر ایسا نہیں تھا جو والد گرامی کے طرز فکر یا الشریعہ کی پالیسی کے معاملے میں انھیں رائے دینے یا والد گرامی کو طلب کر کے ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنے میں مانع ہو۔ اس کے باوجود انھوں نے والد گرامی کے اس رجحان پر کبھی ان کا مواخذہ نہیں کیا کہ وہ دور جدید کے علمی وفکری سوالات کے تناظر میں توسع سے کام لیتے ہوئے مختلف علمی حلقوں سے استفادہ کی ضرورت کے کیوں قائل ہیں یا ''الشریعۃ'' کو آزادانہ علمی بحث ومباحثہ کا فورم کیوں بنا رکھا ہے یا آزاد فکری کی روش اختیار کرنے پر عمار کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کیوں کر رہے ہیں۔ الشریعہ کی پالیسی، والد گرامی کا انداز نظر اور الشریعہ میں زیر بحث آنے والے موضوعات، یہ سب چیزیں ان کے سامنے تھیں اور ان حقائق کے معلوم ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی علمی جانشینی کے لیے والد گرامی کا انتخاب کیا، انھیں مدرسہ نصرۃ العلوم میں اپنی

جگہ تدریس کے منصب پر بٹھایا اور اپنی نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت فرمائی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رحمہ اللہ شاید 'الشریعہ' میں زیر بحث آنے والے مسائل میں روایتی مذہبی حلقے کی نمائندگی کو کمزور محسوس کرتے تھے اور بات ان کے علمی وتحقیقی مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے، کیونکہ خود انھوں نے جن اختلافی مباحث پر اپنی تصانیف میں دادِ تحقیق دی ہے، ان میں کہیں بھی کسی سوال یا موقف سے نظریں چرانے یا قاری کو یک طرفہ معلومات ودلائل فراہم کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ ان کی تصانیف کے قاری جانتے ہیں کہ وہ مخالف کا موقف خود اس کے اپنے الفاظ میں اور بسا اوقات طویل اقتباسات کی صورت میں نقل کرتے ہیں اور پھر جواب میں ایک ایک شق پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہیں۔ خاص طور پر ماحول میں موجود کسی بحث یا سوال کے حوالے سے، جو علمی ودینی طور پر جواب طلب ہو، انھوں نے کبھی وہ رویہ نہیں اپنایا جو ان کے منتسبین کے ہاں غالب دکھائی دیتا ہے، یعنی یہ کہ فلاں مسئلہ تو طے شدہ ہے اور سرے سے قابل بحث ہی نہیں، اس لیے اس پر گفتگو کرنے یا مخالف موقف کے دلائل کو علمی طور پر موضوع بحث بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ 'الشریعہ' میں اٹھائے جانے والے مباحث کے حوالے سے روایتی مذہبی حلقے کا ردعمل بنیادی طور پر یہی رہا ہے اور بحث میں مثبت طور پر شریک ہو کر علمی طور پر اپنے موقف کا وزن ثابت کرنے کے بجائے بالعموم یہی مطالبہ کیا گیا ہے کہ جب یہ مسائل ''ہمارے'' اکابر کے ہاں طے شدہ ہیں تو ان پر بحث ومباحثہ کی دعوت ہی کیوں دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رویے کے ساتھ علمی مباحث میں اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی اس علمی سطح کی نہیں ہو سکتی جس کی خواہش حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ رکھتے تھے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی اس فکرمندی کا تعلق 'الشریعہ' کی پالیسی سے نہیں، بلکہ روایتی مکتب فکر کی ترجمانی کرنے والوں کے طرز تحریر کی کمزوری سے تھا۔ 'الشریعہ' نے اگر قصداً اور جانب داری سے کام لیتے ہوئے بحث کے کسی فریق کے موقف کو کمزور دکھانے کی کوشش کی ہو تو اسے اس پر موردِ الزام ٹھہرانا بجا ہوگا، لیکن اگر کمزوری بحث میں شریک ہونے والوں کے ہاں پائی جاتی ہو تو اس کی ذمہ داری، ظاہر ہے کہ 'الشریعہ' پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کی طرف سے کسی بھی موقع پر 'الشریعہ' کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے یا مباحثہ ومکالمہ کے حوالے سے اپنی پالیسی تبدیل کرنے کا مشورہ یا ہدایت نہیں کی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد اپنا طرز عمل ''الشریعہ'' نے نہیں، بلکہ ان حضرات نے بدلا ہے جن کی آنکھیں، کھلنے کے لیے حضرت شیخ الحدیث کی آنکھ بند ہونے کی منتظر تھیں۔ والد گرامی کے طرز فکر سے اختلاف رکھنے والے حضرات کے لیے درست اخلاقی رویہ یہ ہے کہ وہ ان پر حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد ان کے منہج سے انحراف کا بے بنیاد اور حقائق کا منہ چڑانے والا الزام عائد کرنے کے بجائے حوصلے سے کام لیتے ہوئے یہ کہیں کہ حضرت شیخ الحدیث سے اپنے جانشین کا انتخاب کرنے میں سنگین غلطی بلکہ گناہ سرزد ہوا ہے جس کی اب ہم تلافی چاہتے ہیں۔ اگر وہ یہ بات کہیں تو اس کے لیے فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینھم فلا اثم علیہ کی شرعی بنیاد بھی انھیں مل جائے گی، لیکن اس کے لیے جو اخلاقی جرات اور علمی دیانت درکار ہے، کیا ناقدین اس کی کوئی معمولی سی جھلک بھی دکھائیں گے؟

حافظ محمد اسامہ مدنی*

مولانا راشدی کے نظریات اور ''الشریعہ'' کی پالیسی

چند اعتراضات کا جائزہ

ہمارے مخدوم اور محترم بزرگ جانشین امام اہل السنۃ شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب زید مجدہم ایک جامع الصفات شخصیت ہیں جو متعدد وجوہ سے اپنے اقران میں ممتاز ہیں۔ خاص کر اسلام پر مغربی اعتراضات والزامات کا رد کرنے، جدید ذہن کے اشکالات کو حل کرنے، ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر جاندار تبصرہ کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر اسلام کے عطا کردہ انسانی حقوق کی برتری واضح کرنا آپ کا خاصہ ہے اور بہت سے دوستوں کے نزدیک اس سلسلے میں آپ کو اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔

یہ دنیا کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ کوئی بھی شخصیت کتنی ہی معروف اور مقبول کیوں نہ ہو، اس کے ناقدین بہرحال کچھ نہ کچھ تعداد میں ضرور موجود رہتے ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی کی شخصیت بھی گزشتہ کچھ عرصے سے مختلف قسم کے اعتراضات کی زد میں ہے۔ ان میں سے بعض اہم اعتراضات کا ہم درج ذیل سطور میں جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ذات رسالت پر تنقید اور توہین میں فرق

مولانا راشدی کے خلاف اٹھائے جانے والے تنقیدی طوفان میں ان کے اس جملے کو خوب زیر بحث لایا جا رہا ہے کہ ''مسلمان محبوب خداؐ کی ذات اقدس پر تنقید برداشت کر سکتے ہیں، مگر توہین نہیں''۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب رقمطراز ہیں:

> ''اب سے ڈیڑھ صدی قبل ایک ہندو دانشور پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں، جو لاہور سے شائع ہوئی تھی، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ؐ کے بارے میں ایک سو سے زیادہ اعتراض کیے تھے، لیکن بات چونکہ اختلاف کے لہجے میں کسی حد تک دلیل کے ساتھ کی تھی، اس لیے علمائے کرام نے ان اعتراضات کے جوابات دلیل کے ساتھ دیے جن میں مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ سب سے پیش پیش تھے، لیکن اسی لاہور میں راجپال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے توہین آمیز کتاب لکھی تو

*رفیق تحریر ماہنامہ ''نصرۃ العلوم'' گوجرانوالہ

اس کا جواب غازی علم الدین شہید نے دیا تھا اور یہ جواب غازی شہید کو ہی دینا چاہیے تھا۔ اسی طرح انگریز دانشور سر ولیم میور نے جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں اپنی کتاب میں کچھ اعتراضات کیے تو ان کا جواب سر سید احمد خان مرحوم نے کتاب کی صورت میں دیا، لیکن لندن سے سلمان رشدی کی کتاب شائع ہوئی جس میں جناب نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کا مذاق اڑایا گیا ہے تو اس پر دنیا بھر کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے''۔

مولانا راشدی مزید فرماتے ہیں کہ:

''جہاں تک اختلاف اور تنقید کا تعلق ہے، اس کو مسلمانوں سے زیادہ کس نے برداشت کیا ہے؟..... مغرب کے مستشرقین صدیوں سے اسلام، قرآن کریم، جناب نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی تہذیب و کلچر کے خلاف مسلسل لکھتے آ رہے ہیں اور مغرب کی یونیورسٹیوں کی لائبریریاں اس قسم کی کتابوں اور مقالات سے بھری پڑی ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ان کا جواب مقالات اور کتابوں کی صورت میں دلائل کے ساتھ دیا ہے اور اب بھی دلیل اور متانت کے ساتھ کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دلیل اور متانت کے ساتھ ہی دیا جا رہا ہے، لیکن تمسخر و استہزاء اور توہین و تحقیر کو کسی دور میں بھی برداشت نہیں کیا گیا، وہ آج بھی برداشت نہیں ہے اور آئندہ بھی کبھی برداشت نہیں ہوگا۔ جن دنوں سلمان رشدی کی توہین آمیز کتاب کے خلاف دنیا بھر میں احتجاج جاری تھا برمنگھم (برطانیہ) میں اس سلسلہ میں ہونے والے ایک جلسہ میں میری تقریر کے دوران ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ علمائے کرام اس کتاب کا جواب کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے عرض کیا بیٹا جواب دلیل کا ہوتا ہے، گالی کا نہیں، اگر کوئی شخص مجھے گالی دیتا ہے یا سر عام میری تحقیر اور توہین کرتا ہے تو میں اس کا جواب دینے کے لیے کسی لائبریری کا رخ نہیں کروں گا، بلکہ جو چیز میرے ہاتھ میں ہوگی، اس کے منہ پر دے ماروں گا۔ مغرب کا میڈیا، بلکہ دانش بھی اختلاف اور توہین میں فرق نہیں کر رہی اور تنقید اور تمسخر کو ایک ہی دائرے میں شمار کر رہی ہے۔ اس رویے کو میں خود اپنی ذات کے بارے میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں تو اپنے آقا و مولا حضرت رسول اکرمؐ کے بارے میں کیسے برداشت کر لوں گا؟'' (نوائے قلم، روزنامہ پاکستان لاہور ۲۸ ستمبر ۲۰۱۲ء)

ان اقتباسات میں کوئی ایسی بات نہیں کی گئی جو اسلامی مسلمات کے منافی یا اکابر علمائے اسلام کے موقف کے خلاف ہو۔ بانی دارالعلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مصنف اظہار الحق حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ان جیسے دیگر کئی مسلم مناظرین غیر مسلم، ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے مناظروں میں اسلام، قرآن اور صاحب قرآنؐ پر اعتراضات اور تنقیدات کو برداشت کرتے رہے ہیں۔ اگر تنقید اور توہین میں کوئی فرق نہیں تو غیر مسلموں سے مناظروں کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ پھر تو غیر مسلم مناظرین اور مستشرقین قتل کے مستحق گردانے جانے چاہییں، لیکن ہماری نظر سے ایسا کوئی فتویٰ نہیں گزرا جس میں غیر مسلم مناظرین اور مستشرقین سے متعلق قتل کی بات کی گئی ہو۔ کیا ہمارے اکابر اپنے فرائض منصبی سے اتنے بے خبر اور اتنے بے حس تھے کہ غیر مسلم مناظرین اور مستشرقین، رسول خدا

کی توہین کرتے رہے اور یہ حضرات برداشت کر کے صرف جواب دینے پر اکتفا کرتے رہے؟

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی تصنیف لطیف ''اسلام کا اخلاقی نظام'' جو ایک عیسائی پادری ڈاکٹر اودے مسیح (Udai Masih) کے خط کے جواب میں لکھی گئی ہے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر تنقید کا جواب حضرت قاری صاحبؒ نے بڑے مدلل اور اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں دیا ہے اور یہ بھی کہ عیسائی پادری کو توہین رسالت کا ملزم گردان کر قتل کا فتویٰ نہیں صادر فرمایا بلکہ کتاب کے ابتدائیہ میں اس کا پورے کا پورا خط من وعن درج کر دیا ہے۔ جوابی خط کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ''مکرم بندہ جناب ڈاکٹر صاحب زید لطفکم''۔ توہین رسالت کے مرتکب کے لیے قاری صاحبؒ اتنی تکریم کیسے گوارا کر گئے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے نزدیک بھی توہین اور تنقید میں فرق موجود ہے۔

اس سلسلہ میں تقریباً سال ڈیڑھ سال قبل ہم نے براہ راست مولانا زاہد الراشدی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

''ہم تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تنقید کو جائز نہیں سمجھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن اس سے غیر مسلم معترضین اور ناقدین کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ تو تنقید کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کے اعتراضات یا تنقیدات کو توہین کا نام دے کر ان سے منہ ہی موڑ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو سوالات یا اعتراضات کرتے ہیں، ان کا جواب تو دینا چاہیے نہ کہ ''توہین ہے، توہین ہے'' کہہ کر چپ سادھ لینی چاہیے۔ ہم تو مانتے ہیں کہ حضور ﷺ تنقید سے بالا ہیں، لیکن اتنا کہہ دینے سے ناقدین کے منہ بند نہیں ہونے والے۔ ہم نے تو دنیا کے سامنے رسول اللہ ﷺ کو بے عیب جیسا کہ وہ ہیں، اسی انداز میں پیش کرنا ہے۔ ہاں! اس کے بعد اگر کوئی توہین کا راستہ اختیار کرے تو معاملہ بدل جاتا ہے''۔

ممکن ہے کہ راقم مولانا راشدی کی بات کو حرف بہ حرف نقل نہ کر سکا ہو، بہر حال مولانا راشدی کی بات کا مفہوم بالکل یہی تھا۔ ایک اور مجلس میں مولانا راشدی سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''میں عام طور پر اس حوالہ سے اختلاف کا لفظ استعمال کیا کرتا ہوں۔ ممکن ہے کسی موقع پر تنقید کا لفظ کہہ دیا ہو، مگر اس سے میری مراد اختلاف ہی ہوتا ہے۔ تنقید کو اختلاف کے معنی میں لیا جائے تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے، البتہ اگر کچھ لوگ تنقید اور توہین کو مترادف سمجھتے ہیں تو بات اور ہے، لیکن ہمارے ہاں اکابر اہل علم کی آراء پر جو ''علمی نقد'' کیا جاتا ہے، وہ تنقید ہی ہوتی ہے اور اہل علم کے ہاں اسے کبھی توہین پر محمول نہیں کیا گیا''۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر جب بعض دوستوں نے مختلف مدارس سے مولانا راشدی کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کی مہم چلائی تو بیشتر مفتیان کرام نے مولانا راشدی سے براہ راست تعارف رکھتے ہوئے کبھی خود ان سے ان کا موقف دریافت کرنے کی زحمت نہیں فرمائی، البتہ جامعہ دار العلوم کراچی اور جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور کے مفتیان کرام نے اس اخلاقی بلکہ شرعی ذمہ داری کو محسوس کیا اور خود مولانا راشدی سے بات کر کے ان سے ان

کے موقف کی وضاحت طلب کی اور انہوں نے وہی وضاحت کی جو سطور بالا میں مذکور ہے۔

''قادیانیت نوازی'' کا بہتان

علامہ راشدی صاحب پر ایک اعتراض یہ گزشتہ کافی عرصے سے اٹھایا جا رہا ہے کہ انھوں نے پسرور کے ایک قادیانی مصنف قاضی عطاء کے اردو منظوم ترجمہ قرآن ''مفہوم القرآن'' پر تقریظ لکھ کر ''قادیانیت نوازی'' کا ثبوت دیا ہے۔ جن صاحب کو قادیانی بتایا گیا ہے، ان سے متعلق ذیل میں مفکر اسلام علامہ راشدی کا ایک خط من وعن شائع کیا جا رہا ہے، جو بعض اصحاب علم کے استفسار پر انہوں نے اس اعتراض کے جواب میں اور حقائق کو کھولنے کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط ماہنامہ نصرت العلوم دسمبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے اور ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے جو سنی سنائی بات کے سہارے کفر کا فتوی لگانے دریغ نہیں کرتے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

''باسمہ تعالیٰ

محترمی حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب وحضرت مولانا سید عبد المالک شاہ صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ دونوں بزرگوں نے قاضی عطاء اللہ صاحب پسروری کے بارے میں ایک استفسار میرے سپرد کیا تھا کہ میں اس کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ چونکہ قاضی صاحب کے منظوم ترجمہ قرآن ''مفہوم القرآن'' پر اعتراضات کے حوالہ سے اس پر میری تقریظ بھی موضوع بحث ہے، اس لیے میں اس کے بارے میں اب تک کی صورت حال اور اپنا موقف آپ کی خدمت میں تحریری طور پر پیش کر رہا ہوں۔

قاضی عطاء اللہ صاحب سے میرا کوئی پیشگی تعارف نہیں تھا، انہوں نے جب اس منظوم ترجمہ کی پہلی جلد شائع کی تو میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اس کے بارے میں کچھ تحریر کر دوں۔ میں نے وہ کتاب لے کر رکھ لی اور لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ اس قسم کے معاملات میں میرا ہمیشہ سے معمول یہ رہا ہے کہ اگر خود میرا تعارف نہ ہو تو مقامی علماء کرام سے رابطہ کرتا ہوں اور ان کے مشورہ کی روشنی میں قدم اٹھاتا ہوں۔ اس وقت حضرت مولانا رشید احمد پسروریؒ زندہ تھے۔ ایک موقع پر میں نے ان سے ملاقات کے موقع پر دریافت کیا تو انہیں نے اطمینان کا اظہار کیا کہ قاضی عطاء اللہ صاحب صحیح العقیدہ مسلمان ہیں، چنانچہ اس تصدیق کے بعد میں نے دو چار مقامات سے اس منظوم ترجمہ کو دیکھ کر وہ تقریظ لکھ دی جو اس میں شائع ہو چکی ہے۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد مجھے توجہ دلائی گئی کہ یہ قاضی صاحب موصوف مبینہ طور پر قادیانی ہیں اور اپنے ترجمہ میں بھی انہوں نے قادیانی تحریفات کا راستہ اختیار کیا ہے، اس لیے مجھے اپنی تقریظ سے دست برداری اختیار کر لینی چاہیے۔ اس پر میں نے یہ عرض کیا کہ جو اعتراضات ہیں، وہ تحریری صورت میں دیے جائیں۔ اگر درست ہوئے تو مجھے اپنی تحریر واپس لینے میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پسرور کے

علماء کرام سے دوبارہ رابطہ قائم کیا بلکہ خود پسرور گیا اور مختلف علماء کرام سے اس بارے میں دریافت کیا اور ان کی طرف سے یہی جواب ملا کہ قاضی عطاء اللہ صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ قادیانی ہیں، درست نہیں ہے جبکہ ان کے بارے میں تحریری اعتراضات میں نے برادرم مولانا مشتاق احمد چنیوٹی کے سپرد کیے کہ وہ ان پر تبصرہ تحریر فرمائیں، مگر انہوں نے جو تبصرہ تحریر فرمایا مجھے اس سے اطمینان حاصل نہ ہوا اور میں نے خود مولانا مشتاق احمد صاحب سے عرض کیا کہ میں ان کی تحریر سے مطمئن نہیں ہوں، اس لیے کہ ان کے تبصرہ کی بنیاد محتملات پر ہے اور کسی شخص کو قادیانی قرار دینے یا اس پر کفر کا فتویٰ عائد کرنے کے لیے محتملات کافی نہیں ہوتے، اس کے لیے تصریحات کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس دوران جماعت ''الدعوۃ'' پاکستان کے ترجمان ہفت روزہ ''غزوہ'' لاہور میں یکم تا ۷ دسمبر ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ قاضی عطاء اللہ نامی ایک قادیانی شخص پسرور میں قرآن کریم کا تحریف شدہ ترجمہ تقسیم کر رہا ہے جس کے بعد اسی ہفت روزہ ''غزوہ'' کے ۷ تا ۱۳ دسمبر ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

> ''مفہوم القرآن (منظوم) اردو کے مصنف عطا قاضی اپنے تینوں بیٹوں کے ہمراہ غزوہ کے دفتر میں آئے اور قادیانیت سے علی الاعلان برأت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کرتا ہوں۔ مرزا قادیانی کو کذاب مانتا ہوں، ختم نبوت پر مکمل یقین رکھتا ہوں، مرزا غلام احمد کو نہ نبی مانتا ہوں اور نہ مجدد تسلیم کرتا ہوں''۔

اس کے بعد قاضی عطاء اللہ مذکور نے اپنے لیٹر پیڈ پر ایک تحریر لکھ کر پسرور کے علماء کرام کے سامنے پیش کی جس میں یہ درج ہے کہ:

> ''خدا تعالیٰ کی وحدانیت، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ان کی ختم نبوت پر دل و جان سے کامل ایمان رکھتا ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ظلی اور بروزی نبی کو مفتری اور کذاب جانتا ہوں اور مانتا ہوں اور میرا مرزا غلام احمد قادیانی سے اور اس کی قادیانی جماعت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔''

اس تحریر پر ان کے مسلمان ہونے کی پسرور کے جن علماء کرام نے تحریری تصدیق کی ہے ان میں حضرت مولانا رشید احمد پسروریؒ کے دونوں صاحبزادے مولانا بلال احمد اور مولانا مفتی محمد نعمان کے علاوہ مولانا حافظ محمد سرور، جمعیۃ علماء اسلام ضلع سیالکوٹ کے امیر مولانا قاری غلام فرید اعوان، جامعہ اسلامیہ پسرور کے مہتمم مولانا محمد شفیق، جامعہ نعیمیہ رضویہ پسرور کے شعبہ افتاء کے انچارج مولانا جمیل احمد ہدایتی پسروری اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ضلع سیالکوٹ کے ناظم حافظ کفایت اللہ شاکر شامل ہیں، یہ سب تحریریں میں نے خود دیکھی ہیں اور میرے پاس ان کی فوٹو کاپی موجود ہے۔

اس کے ساتھ ہی قاضی عطاء اللہ مذکور نے حیات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے عقیدہ کی وضاحت

اپنے لیٹر پیڈ پر تحریر کی ہے جو تفسیر مظہری کے حوالہ سے ہے اور اس میں ''آیت کریمہ'' ''**انی متوفیک**'' کے حوالہ سے مفسرین کرامؒ کے مختلف اقوال کا تذکرہ کر کے ان کا محاکمہ کیا گیا ہے اور اس کا اختتام اس جملہ پر ہوتا ہے کہ:

> ''لہٰذا **توفی** سے مراد بغیر موت آسمان پر اٹھالینا ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے کہ **وما قتلوہ وما صلبوہ**، نہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کیا اور نہ صلیب دی۔ وجدان شاہد ہے کہ اگر اٹھائے جانے سے پہلے عیسیٰؑ کی موت کی نفی تسلیم نہ کی جائے تو نفی قتل کی صراحت کا کیا فائدہ؟ قتل کا نتیجہ بھی تو موت ہی ہے۔''

ان تصریحات کے بعد پورے شرح صدر اور اطمینان کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قاضی عطاء اللہ مذکور یا ان کے بیٹوں کو جو تمام معاملات میں اپنے باپ کے ساتھ ہیں، قادیانی قرار دینا اور ان پر کفر کا فتویٰ عائد کرنا شرعاً یا اخلاقاً کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور اگر ان کی تحریر میں کوئی جملہ اس سے ہٹ کر کسی دوسرے معنیٰ کا احتمال بھی رکھتا ہے تو اسے اس صراحت اور اقرار کی روشنی میں اسی معنیٰ پر محمول کیا جانا چاہیے، البتہ ان سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ابہام کو اس کتاب میں ہی دور کر دیں اور اگلے ایڈیشن میں اس کی وضاحت کر دیں۔ اس استفتاء کے حوالہ سے آپ دونوں بزرگوں کی تشویش کی وجہ سے میں اس کے بعد دوبارہ ۱۸ نومبر ۲۰۰۷ء کو خود پسرور گیا ہوں اور وہاں کے بعض علماء کرام سے از سرنو اس مسئلہ پر بات کی ہے اور انہیں اپنے سابقہ موقف پر مطمئن پایا ہے، اس لیے میں قاضی عطاء اللہ پسروری کے منظوم ترجمۂ قرآن کریم ''مفہوم القرآن'' پر لکھی گئی اپنی تقریظ پر قائم ہوں اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

شکریہ والسلام

ابو عمار زاہد الراشدی

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

۱۹/۱۱/۲۰۰۷ء''

ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں مفکر اسلام علامہ راشدی نے ''دینی جدوجہد اور اس کی اخلاقیات'' کے عنوان سے اپنی طرف منسوب ''قادیانیت نوازی'' کی داستان پیش کی، اس مضمون کے دو اقتباس بھی ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

> ''بعض دوستوں کی طرف سے اعتراض ہو کہ میں نے ایک قادیانی کی تفسیر قرآن کریم پر تقریظ لکھ دی ہے۔ صرف اعتراض نہیں ہوا بلکہ ملک بھر میں اس کی خوب تشہیر کی گئی، چنانچہ مختلف شہروں سے مجھے فون آنے لگے، بلکہ عام حلقوں میں تقسیم کیے جانے والے ایک پمفلٹ میں اس اعتراض کا ذکر کیا گیا جس پر میں نے قاضی عطاء اللہ موصوف سے رابطہ کیا تو وہ ایک بڑی فائل لے کر میرے پاس آ گئے جو ان کے قادیانی ہونے

کے اخباری پراپیگنڈا اور ان کی طرف سے جوابات پر مشتمل تھی اور ان کا ایک حلف نامہ بھی اس میں شامل تھا جس میں پوری وضاحت سے کہا گیا ہے کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں اور قادیانی نہیں ہیں۔ اس حلف نامہ میں انہوں نے اپنے عقائد کا بھی دوٹوک انداز میں ذکر کیا ہے اور اس پر پسرور کے دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث مکاتب فکر کے معروف علماء کرام کی تصدیقات ہیں۔ اس کے بعد ایک موقع پر میں پسرور گیا تو مختلف علماء کرام سے براہ راست بھی اس مسئلہ پر بات کی۔ انھوں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا کہ قاضی صاحب موصوف پر قادیانی ہونے کا الزام غلط ہے اور وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس کے باوجود نہ صرف پراپیگنڈا مہم جاری رہی بلکہ مسلسل لابنگ بھی ہوتی رہی، چنانچہ ہمارے اپنے مدرسہ جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ کے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا سید عبدالمالک شاہ صاحب اور حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس کی تحریری وضاحت طلب کی اور تقاضا کیا کہ میں قاضی عطاء اللہ موصوف کی کتاب ''مفہوم القرآن'' پر اپنی تقریظ سے رجوع کا اعلان کروں۔ اس پر میں نے ایک مرتبہ پھر پسرور کے علماء کرام سے رابطہ کیا مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ پا کر تقریظ واپس لینے سے معذرت کر دی اور دونوں بزرگوں کو تحریری طور پر اصل صورت حال اور اپنے موقف سے آگاہ کر دیا۔''

علامہ راشدی مزید فرماتے ہیں:

''پاکستان شریعت کونسل میں میرے قریب کے ساتھیوں سے رابطہ کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ مجھے اپنے موقف پر نظر ثانی کے لیے کہیں۔ مولانا عبدالحق خان بشیر میرے حقیقی بھائی ہیں اور پنجاب شریعت کونسل کے امیر ہیں جبکہ لاہور باغبان پورہ کے مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر میرے حقیقی بھائیوں کی طرح ہیں اور مرکزی شریعت کونسل کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل ہیں۔ دونوں حضرات میرے پاس الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں تشریف لائے اور اس مسئلے پر مجھ سے تفصیلی بات کی۔ میں نے گزارش کی کہ مجھے اپنے موقف پر اس قدر اصرار نہیں ہے کہ اس پر کسی کی بات نہ سنوں۔ آپ دونوں حضرات خود پسرور تشریف لے جائیں اور اپنے طور پر وہاں کے علماء کرام سے بات کر کے تحقیق کریں۔ اس کے بعد آپ دونوں حضرات جو بھی کہیں گے، میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات پسرور تشریف لے گئے اور اپنے طور پر صورت حال معلوم کی۔ واپسی پر انہوں نے جو رپورٹ پیش کی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی عطاء اللہ صاحب کو قادیانی قرار دینے کی بات تو درست نہیں ہے، البتہ ان کی اس کتاب کے بعض مندرجات پر اشکالات ہیں اور ان سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ان عبارات سے قادیانیوں کی بعض باتوں کی حمایت کا تاثر ملتا ہے۔ ان کی اگر وضاحت ہو جائے تو مناسب ہوگا۔

اس حوالے سے قاضی صاحب سے میری بات اس سے قبل بھی ہو چکی تھی اور انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ عالم دین نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے قرآن کریم کا ازسرنو کوئی ترجمہ کیا ہے، بلکہ انہوں نے اردو

تراجم کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کے اردو ترجمہ کو منظوم شکل دی ہے، اس لیے علماء کرام جہاں بھی کوئی اشکال محسوس کریں، اس کی نشاندہی کر دیں، میں اس عبارت کی اصلاح کر دوں گا، مگر مولانا عبدالحق خان بشیر اور مولانا قاری جمیل الرحمان اختر کی پسرور سے واپسی کے بعد میں نے دوبارہ قاضی عطاء اللہ صاحب سے رابطہ کیا اور وہ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا موقف اب بھی وہی تھا کہ علماء کرام کتاب کا مطالعہ کر کے نشاندہی کریں۔ جو عبارت بھی مشتبہ ہوگی، وہ اسے تبدیل کر دیں گے۔ چنانچہ اب وہ کتاب میں نے نظر ثانی اور تفصیلی مطالعہ کے لیے مولانا عبدالحق خان بشیر کو دے دی ہے اور ان کی ابتدائی رپورٹ یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی واضح عبارت تو نظر نہیں آئی، البتہ بعض عبارات سے اشتباہ ہوتا ہے جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔''

رافضیت نوازی کا الزام

''رافضیت نوازی'' کے ضمن میں وہ علامہ راشدی کی اس عبارت کو بھی زیر بحث لایا جا رہا ہے کہ:

''(اسلام) اسلامی سوسائٹی کے ہر فرد کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے حق کیلئے آواز اٹھائے، حکمرانوں اور مقتدر طبقات پر تنقید کرے اور سوسائٹی کے مفاد کیلئے ہر سطح پر مشورہ دے۔ اسلام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بات حرف آخر ہے۔ وہ خلفائے راشدین کو بھی مجتہد کے درجہ میں تسلیم کرتا ہے جن کی ہر بات میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال موجود ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۲۰۰۸ء)

مندرجہ بالا عبارت کے خط کشیدہ الفاظ سے انتہائی حیرت انگیز طور پر یہ مطلب اخذ کیا گیا ہے کہ علامہ راشدی خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کو حجت شرعیہ نہیں تسلیم کرتے۔ اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کی آرا اور فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہونا ایک اور چیز ہے اور ان کے اجتماعی فیصلوں کا حجت شرعیہ ہونا ایک بالکل الگ چیز ہے، اور ان دونوں باتوں کو گڈ مڈ کر کے اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرنا شدید بددیانتی کا مظہر ہے۔

بلاشبہ خلفائے راشدینؓ کے فیصلے حجت شرعیہ ہیں اور اس بارے میں مفکر اسلام حضرت علامہ راشدی رقمطراز ہیں کہ

''صحابہ کرامؓ کے اقوال کے دائرے میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا ایک ایسا اصول ہے جو نہ صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کی ایک اہم اساس ہے، بلکہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' میں ''الجماعۃ'' کا لفظ بھی اسی کی غمازی کرتا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر زمانہ میں نئی تعبیر وتشریح اور استدلال واستنباط کی گنجائش ہے اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ماضی کے اجتہادات اور علمی تسلسل بالخصوص حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجماعی فیصلوں اور رجحانات کی نفی نہ ہو، بلکہ نیا استدلال واستنباط ماضی کے علمی تسلسل میں اضافہ اور اس کے ارتقاء کا باعث بنے۔'' (ماہنامہ الشریعہ مئی جون ۲۰۰۹ء)

ایک اور مقام پر مختلف دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

''جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ اور حضرت امام شافعیؒ کے ان ارشادات کی روشنی میں کسی معاملے کو طے کرتے وقت ترجیحات کی ترتیب یوں ہوگی۔

۱۔کتاب اللہ، ۲۔سنت نبویؐ، ۳۔خلفائے راشدینؓ کے فیصلے، ۴۔اجماع امت، ۵۔صلحاء امت کے فیصلے

تو اب بات یوں طے ہوئی کہ جن امور میں (۱) کتاب اللہ (۲) سنت نبویؐ (۳) خلافت راشدہ (۴) اجماع امت اور (۵) علماء امت کا کوئی واضح فیصلہ سامنے آ چکا ہے، وہ طے شدہ امور ہیں، ان میں ترمیم و تبدل یا جدید اصطلاح میں قانون سازی کی گنجائش نہیں ہے''۔ (اسلام، جمہوریت اور پاکستان صفحہ ۵۶)

مولانا راشدی کی جس عبارت پر اعتراض کیا گیا ہے، اس سے متعلق ایک ساتھی نے براہ راست ان سے استفسار کیا تو انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریری طور پر اس کا جواب عنایت فرمایا جو موقع کی مناسبت سے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

''حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلے بلاشبہ حجت ہیں، لیکن کیا خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش نہیں تھی اور کیا اس دور میں ان کے فیصلوں سے اختلاف نہیں کیا گیا؟ مثلاً:

۱۔حضرت صدیق اکبرؓ نے بیت المال سے وظائف کی تقسیم میں مساوات کا اصول اختیار کیا تھا مگر حضرت عمرؓ نے ان کے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے درجہ بندی کا اصول اختیار کیا اور پورا نظام تبدیل کر دیا۔

۲۔حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے حج تمتع سے منع کر دیا تھا جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ کا اس سے کھلا اختلاف احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہے اور آج بھی حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے اس موقف پر عمل نہیں ہو رہا۔

۳۔حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جنبی کے لیے تیمم کی اجازت نہیں دیتے تھے جبکہ جمہور صحابہؓ نے اس سے اختلاف کیا اور آج بھی اس فتویٰ پر عمل نہیں ہو رہا۔

۴۔حضرت عمرؓ کے دور میں شرابی کے لیے اسی ۸۰ کوڑے کی سزا مقرر کرنے کا باہمی مشاورت کے ساتھ فیصلہ ہوا مگر حضرت علیؓ نے اس کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا جو صحیح احادیث میں موجود ہے۔

۵۔خلفائے راشدینؓ کے متعدد انتظامی فیصلوں اور احکام سے عام صحابہؓ نے اختلاف کیا اور اس کا کھلم کھلا اظہار کیا جن پر بعض فیصلوں سے انہیں رجوع بھی کرنا پڑا۔

۶۔رائے کا اختلاف تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تسلیم کیا ہے جس کی واضح مثال غزوۂ احد میں اپنی رائے کے خلاف عام صحابہ کرامؓ کی رائے کو قبول کرنا ہے۔

۷۔یہ مسلمہ بات ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی حیثیت مجتہد کی تھی، امام معصوم کی نہیں تھی جس کے فیصلوں میں خطا کا احتمال نہ ہو اور ان کا ہر فیصلہ امت کے لیے ہر حال میں تسلیم کرنا واجب ہو۔

۸۔حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ

ان استقمت فاعینونی وان انا زغت فقومونی

اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

کیا یہ عام لوگوں کا رائے اور اختلاف کا حق تسلیم کرنے کا اعلان نہیں تھا؟

اس لیے صحابہ کرامؓ کے اجتماعی تعامل اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں کا حجت ہونا اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اس سے اختلاف کے حق کی نفی نہیں ہوتی اور دونوں باتوں کو خلط ملط کر کے اس سے اپنی مرضی کا نتیجہ نکالنے کی کوشش کرنا صحیح طرز عمل نہیں ہے جبکہ حضرت امام اعظمؒ کے ارشاد گرامی کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ اور خلفاء راشدینؓ کے باہمی اختلاف کے دائرے کو تسلیم کرتے ہیں البتہ جس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا باہمی اختلاف موجود ہے اس میں ان کے اقوال کے دائرے سے باہر نکل کر الگ قول اختیار کرنے کو پسند نہیں کرتے اور یہ بات اختلافات کی نفی کرنے کے بجائے انہیں تسلیم کرنے پر مبنی ہے۔''

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ عبارت (صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے) ''رافضیت نوازی'' کے ضمن میں کیوں زیر بحث لائے ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ عبارت اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان حد فاصل اور اہل تشیع کے ''نظریہ امامت'' کی زبردست تردید پر مبنی ہے۔ علامہ راشدی صاحب اس کی وضاحت میں ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''(اہل سنت اور اہل تشیع کے بنیادی اختلافات میں) چوتھا فرق یہ ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا براہ راست نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ''معصوم عن الخطاء'' ہے اور اس کی کسی بات کو خطا سے موسوم نہیں کیا جا سکتا جبکہ خلیفہ معصوم نہیں ہے بلکہ اس کا شرعی درجہ مجتہد کا ہے اور مجتہد کے فیصلوں میں صواب اور خطاء دونوں کا احتمال یکساں قائم رہتا ہے۔ ہمارا اہل سنت کا اصول ہے کہ 'المجتھد یخطی ویصیب" مجتہد خطا کا مرتکب بھی ہوتا ہے اور صواب کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اس لئے مجتہد کی کسی بھی بات سے علمی دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا اور خلفاء راشدینؓ اور ائمہ مجتہدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے، مگر ''امام'' معصوم اور اس کی رائے میں خطا کا احتمال نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں بزرگوں کے خلیفہ کی حیثیت سے یہ پہلے خطبوں میں صراحت موجود ہے کہ ہم قرآن وسنت کے مطابق حکومت کریں گے اور یہی وجہ ہے کہ تم پر ہماری اطاعت ضروری ہے۔ اگر ہم قرآن وسنت کے پابند رہیں تو ہمارا ساتھ دو اور اگر ہم قرآن وسنت سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں تو ہماری اطاعت تم پر ضروری نہیں ہے''۔ (ماہنامہ نصرت العلوم مئی ۲۰۱۱ء)

قارئین اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ''رافضیت نوازی'' اور ''شیعیت نوازی'' کا یہ الزام مشائخ نصرۃ العلوم بالخصوص بانی جامعہؒ پر بھی بہت پرانا ہے۔ ایک جذباتی شخص نے جامعہ نصرت العلوم میں موجود مفسر اعظم قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان صاحب سواتی نور اللہ مرقدہ کی مشہور زمانہ تفسیر ''معالم العرفان فی دروس القرآن''، ''دروس

الحدیث'' اور ''خطبات سواتی'' وغیرہ کتب پر مشتمل گودام کو صرف اس وجہ سے آگ لگا دی تھی کہ حضرت صوفی صاحب ؒ نے اپنے دروس وخطبات میں اہل تشیع کو اگرچہ گمراہ کن مگر مسلمانوں کا باقاعدہ ایک فرقہ تسلیم کیا ہے اور بحیثیت مجموعی وہ علی الاطلاق تکفیر شیعہ کے بھی قائل نہیں تھے بلکہ، ضروریات دین کا انکار کرنے والوں کے بارے میں شخصی یا ذیلی گروہ کے حوالے سے تکفیر کے قائل تھے اور اسی بنا پر وہ مشترکہ ملی وقومی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت کے حق میں تھے۔ مفکر اسلام علامہ راشدی پر ''رافضیت نوازی'' کا یہ الزام بھی مفسر قرآن ؒ کے اسی نظریہ سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے لگایا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ تکفیر شیعہ سے متعلق یہ نظریہ حضرت مفسر اعظم قرآن ؒ کے تفردات میں سے نہیں ہے بلکہ محقق اہل علم اور معتمد مفتیان کرام اور اکابر علماء دیوبند کی ایک اچھی خاصی تعداد بلکہ عملاً جمہور اہل السنۃ والجماعۃ علماء دیوبند اسی نظریہ پر کاربند ہیں، مثلاً تعلیمی میدان میں اتحاد تنظیمات مدارس اسلامیہ کا اسٹیج، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا اسٹیج، اور جمعیۃ علماء اسلام کے قومی وملی اتحادات کے اسٹیج اور مسلم پرسنل لاء بورڈ وغیرہ اور اگر اسی بنیاد پر ''رافضیت نوازی'' کے سرٹیفکیٹ جاری کرنیکی مہم شروع کر دی جائے تو معلوم نہیں اس کی زد میں کون کون آئے گا۔ سوچ بچار (جس کا بے حد فقدان ہے) کر کے انہیں اس کے ممکنہ نتائج پر بھی ایک نظر کر لینی چاہیے۔

مولانا مودودیؒ کے ''تفردات'' کے حوالے سے موقف

علامہ زاہد الراشدی صاحب نے مولانا معین الدین خٹک ؒ کے مجموعہ افادات ''معین القاری شرح صحیح البخاری'' سے متعلق ایک تحریر لکھی ہے جو مذکورہ کتاب کی پہلی جلد کے آغاز میں شامل کی گئی ہے۔ ناقدین کے نزدیک یہ بات بھی قابل اعتراض ہے، جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اکابر علماء دیوبند کے طرز عمل کی روشنی میں دیگر مسالک کے مصنفین کی کتابوں پر ''رائے''، ''تقریظ'' اور ''تائیدی تبصرہ'' وغیرہ تحریر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اکابر کی روایات کا تسلسل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ تقریظ، تبصرہ اور رائے لکھنے والے نے دوسرا مسلک بھی اختیار کر لیا ہے یا اس کی بالکلیہ تائید وتصویب کر دی ہے۔ یہ تو بعض مخصوص عنوانات میں ان کی قلمی، تحقیقی، ادبی، تاریخی، سیاسی، قومی اور ملی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے۔ اس کتاب پر بھی مولانا راشدی کی جو ''رائے'' درج ہے، اس میں مودودی صاحب کے حوالے سے ان کے شاگردوں کے دفاعی طرز عمل پر کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر فکری نقد بھی کیا گیا ہے۔ مولانا راشدی لکھتے ہیں:

> ''مولانا معین الدین خٹک ؒ کا تعلق کرک ضلع کوہاٹ سے تھا، انہوں نے دورہ حدیث مدرسہ شاہی مراد آباد (انڈیا) میں حضرت مولانا فخر الدین ؒ سے کیا اور پھر پوری زندگی درس وتدریس میں گزار دی۔ وہ ان علمائے کرام میں سے تھے جنہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرف سے دینی عقائد واحکام کی تعبیرات وتشریحات میں بعض تفردات سامنے آنے پر ان سے اختلاف کرنے والے جمہور علماء کا ساتھ دینے کے بجائے ان تفردات کے دفاع کا راستہ اختیار کیا اور آخر وقت تک اس موقف پر قائم رہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں اگر مولانا

مودودیؒ کے تفردات کو بھی دوسرے اہل علم کی طرح تفردات ہی کے درجے میں رہنے دیا جاتا اور انہیں مستقل موقف کی حیثیت دے کر ان کے اثبات ودفاع میں اس درجہ شدت اختیار نہ کی جاتی تو اس معاملہ میں بہت سے بگاڑ سے بچا جا سکتا تھا''۔

اس عبارت کے حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ مولانا راشدی مودودی صاحب کے نظریات کو ''اہل علم کے تفردات'' میں شامل کر کے امام اہل سنتؒ اور جملہ اکابر علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی مساعی جمیلہ پر پانی پھیر رہے ہیں۔ حالانکہ مولانا راشدی نے اپنا مؤقف برملا جمہور علماء کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ان کی عبارت میں دو باتیں بڑی واضح ہیں:

(۱) مودودی صاحب کو دینی عقائد واحکام کی تعبیرات وتشریحات میں جمہور علماء کے مؤقف سے علیحدہ شمار کیا ہے۔

(۲) مولانا مودودی کے دفاع میں ان کے شاگردوں نے ہر حال میں انہیں برحق ثابت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا، اسے بگاڑ سے تعبیر کیا ہے۔

ایک اور مقام پر اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ زاہد الراشدی صاحب رقمطراز ہیں:

''ایک صاحب علم دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ علمی تفردات میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے پیچھے نہیں ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کے تفردات علماء کے حلقہ میں اس شدت کے ساتھ موضوع بحث نہیں بنے جس شدت کے ساتھ مولانا مودودیؒ کے افکار کو نشانہ بنایا گیا؟ میں نے عرض کیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا سندھیؒ اور ابوالکلام آزادؒ کے علمی تفردات پر ان کے شاگردوں اور معتقدین نے دفاع اور ہر حال میں انہیں صحیح ثابت کرنے کی وہ روش اختیار نہیں کی جو خود مولانا مودودیؒ اور ان کے رفقا نے ان کی تحریروں پر علماء کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات پر اپنا لی تھی، چنانچہ اس روش کے نتیجے میں وہ جمہور علماء کے مدمقابل ایک فریق کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے اور بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہو گیا۔'' (عصر حاضر میں اجتہاد، صفحہ ۳۱۹)

مولانا راشدی ایک اور مقام پر مزید وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بعض افکار ونظریات اور دینی تعبیرات سے جمہور علماء کو اختلاف رہا ہے۔ اس کا اظہار شدت اور نرم روی کے دونوں لہجوں میں خاصا ہوا ہے اور اس کے دفاع میں بھی دونوں اسلوب یکساں کارفرما چلے آ رہے ہیں، جبکہ ہم اس معاملہ میں موقف کے حوالے بہر حال جمہور اہل علم کے ساتھ ہیں۔'' (الشریعہ، جولائی ۲۰۱۳ء)

مولانا راشدی اس رائے میں متفرد بھی نہیں ہیں، بلکہ کئی دیگر اکابر علماء دیوبند کی آراء بھی ایسی ہی ہیں۔ مثلاً محدث العصر حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے کے داماد اور معتمد خاص، فاضل دیوبند اور مؤلف ''انوار الباری'' حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

''ہم مولانا مودودی صاحب کی وسعت نظر، کثرت مطالعہ اور جدید مسائل کو دل نشین اور مدلل طرز میں

لکھنے کے امتیازات کی بڑی قدر کرتے ہیں، مگر جن مسائل میں وہ صرف اپنی دھنتے ہیں اور دوسروں کی نہیں سنتے یا کسی غلط فہمی کے تحت دوسروں کو بھی مغالطہ ڈال دیتے ہیں، اس طرز فکر یا انداز تحریر کی داد دینے سے ہم قاصر ہیں''۔ (ملفوظات محدث کشمیری صفحہ ۱۶۱)

مزید فرماتے ہیں:

''اس ایک صدی کے اندر جو کتب تفاسیر شائع ہوئیں، وہ بڑی حد تک غیر معیاری ہیں، تفسیر المنار مصری ہو یا سرسید کی تفسیر ہندی ہو، عنایت اللہ مشرقی کی تفسیر ہو یا مولانا آزاد کی ترجمان القرآن، مولانا عبیداللہ سندھی کی جدید تفسیر ہو یا مولانا مودودی کی تفہیم القرآن، مولانا فراہی کی تفسیر ہو یا مولانا امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن، وغیرہ ان سب میں عمدہ تفسیری مواد کے ساتھ آزادی رائے اور تفردات کے نمونے بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ان سب میں سے (مولانا مودودی کی) تفہیم القرآن قابل ترجیح ہے اور جن جن مقامات میں تفاسیر جمہور کے مطابق انہوں نے تشریحات وتقریرات کی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ لیکن جن جن مقامات پر وہ جمہور مفسرین اور اکابر امت سے الگ ہو کر اپنے تفردات رقم کر گئے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ قابل قبول نہیں ہو سکتے''۔ (ملفوظات محدث کشمیری صفحہ ۲۱۷)

مولانا بجنوریؒ، سید مودودی صاحب کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کو مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تفسیر پر ترجیح دے رہے ہیں اور ان کے نظریات کو تفردات بھی قرار دے رہے ہیں۔ مولانا راشدی تو اکابر علماء دیوبند کی مساعی جمیلہ پر پانی پھیرنے کے مرتکب قرار پائے ہیں، اب معلوم نہیں مولانا بجنوری کس فرد جرم کے مستحق قرار پاتے ہیں!!

صرف مولانا بجنوریؒ ہی نہیں، اس پر اور بھی کئی ایک مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جیسے سید مودودی کے رد میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسینی ندویؒ (فاضل دیوبند) نے ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے عنوان سے اور حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ نے ''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف'' کے نام سے کتاب لکھی ہے جن میں مولانا مودودی صاحب کی تحریری وقلمی خدمات کا برملا اعتراف واظہار کیا ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا راشدی نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی بنا پر اکابر کی روش وطرز سے دوری لازم آتی ہو۔ اس سلسلے میں لطیفے کی بات یہ ہے کہ ناقدین جس عبارت کو ''مودودیت نوازی'' قرار دے رہے ہیں، اسی عبارت کو ماہنامہ ترجمان القرآن کے جولائی ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں علامہ راشدی کی تصنیف ''عصر حاضر میں اجتہاد'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ''الزام تراشی'' اور ''مبالغہ آمیزی'' قرار دیا گیا ہے۔

''معین القاری'' پر شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب المدنی شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی ''رائے'' بھی موجود ہے جس میں ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا معین الدینؒ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے دستہائے راست محققین اربعہ میں سے

ایک تھے۔ حضرت مولانا مودودیؒ کے حلقہ بگوشوں میں کافی ارباب دانش وعرفان شامل ہیں۔ مگر چار بڑی شخصیات سے مولانا مودودیؒ کے اسلامی مشن کو نمایاں تقویت ملی۔ اب یہ حضرات اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد چراغؒ (فاضل دیوبند) تھے۔ پھر شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا معین الدین خٹکؒ (فاضل شاہی مراد آباد) تھے۔ اسی طرح حضرت مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلؒ (فاضل دیوبند) اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنیریؒ۔ مؤخر الذکر میرے استاذ تھے، دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اور درجہ علیا کے مدرس تھے''۔

بریلویت نوازی کا الزام

مولانا زاہد الراشدی نے گوجرانوالہ کے معروف اسکالر اور المشرق سائنس کالج کے چیئر پرسن ڈاکٹر عبد الماجد حمید المشرقی صاحب کی کتاب ''انوار خاص'' پر اپنی تقریظ درج فرمائی ہے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں بعض غیر مستند باتیں درج تھیں جن کی بنیاد پر ناقدین نے مولانا راشدی کی تقریظ کو ''بریلویت نوازی'' قرار دے کر اس پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک وضاحتی خط ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے جو اس سے قبل ماہنامہ نصرۃ العلوم کے دسمبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ! میں ایک عام مسلمان ہوں اور میرے عقائد وہی ہیں جو اہل سنت کے چلے آ رہے ہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے تعلیمی شعبہ میں تھوڑی بہت خدمت لے رہے ہیں جس پر میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں، المشرق سائنس کالجز کے نیٹ ورک کے تحت بحمد اللہ تعالیٰ کم وبیش سات ہزار طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں جنہیں حفظ، قرأت قرآن کریم و دیگر ضروریات دین کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

میں گزشتہ چالیس برس سے مولانا زاہد الراشدی کا مقتدی ہوں حتی الوسع جمعۃ المبارک ان کے پیچھے ادا کرتا ہوں جبکہ ان کے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ (امام اہلسنت) کے ساتھ میری دلی عقیدت رہی ہے اور ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہو کر ان کی دعائیں اور شفقتیں حاصل کر چکا ہوں، آپ کے وصال سے چار دن پہلے مجھے اپنی اہلیہ کے ساتھ تیمارداری کیلئے جانے کا بھی شرف حاصل ہوا، یہ زندگی میں میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس ملاقات کے دوران حضرت امام اہلسنتؒ نے میرے سر پر چار دفعہ ہاتھ پھیرا۔

البتہ میرا ذوق یہ ہے کہ میں تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور راہنماؤں کا احترام کرتا ہوں اور ان سے استفادہ کی کوشش بھی کرتا ہوں، میری ایک تصنیف ''انوار خاص'' کے بارے میں فیصل آباد کے کچھ دوستوں نے شکوہ کیا ہے کہ اس میں اہل سنت کے عقائد و مذہب کے خلاف چند باتیں درج ہو گئی ہیں مجھے اپنی کسی بات پر اصرار نہیں ہے اور میں نے جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد کے نائب مہتمم حضرت مولانا مفتی زاہد

صاحب سے گزارش کی ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کر کے اس میں اہل سنت کے عقائد اور مذہب کے خلاف جو بات بھی وہ محسوس کرتے ہیں اس کی نشاندہی کر دیں میں اگلے ایڈیشن میں اس میں ہر بات کو حذف کر دوں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

تمام احباب سے درخواست ہے کہ میرے لیے حسن عمل، حسن خاتمہ اور نیکی کی مسلسل توفیق کی دعا مانگتے رہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)''

ہمارے پیش نظر اس وقت ''انوار خاص'' کا تیسرا ایڈیشن ہے جو ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے متعلقہ مقامات کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس کا تقاضا ڈاکٹر صاحب کی بریلویت اور مولانا راشدی صاحب کی بریلویت نوازی کی صورت میں نکلتا ہو۔

ماہنامہ ''الشریعۃ'' کی پالیسی

الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ کا سنگ بنیاد امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور اس کے بعد متعدد مواقع پر اس کے پروگراموں میں شرکت فرما کر سرپرستی فرماتے رہے ہیں۔ ماہنامہ الشریعہ کا مطالعہ ان کا معمول تھا اور ان کی کئی تحریرات بھی الشریعہ میں شائع ہوئی ہیں جبکہ مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ بانی جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے بارے میں مولانا محمد فیاض خان سواتی نے ہمیں بتایا کہ والد ماجد کا معمول پروگراموں میں جانے کا نہیں تھا، لیکن الشریعہ اکیڈمی کے پروگرام میں انہوں نے بھی شرکت فرما کر اس کی سرپرستی فرمائی۔ وہ ماہنامہ الشریعہ کا بڑی باقاعدگی سے مطالعہ فرماتے تھے اور اگر کبھی رسالہ پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تو اس کے بارے میں مجھ سے استفسار فرماتے، بلکہ اس کا سالانہ چندہ خریداری بھی باقاعدگی سے جمع کراتے تھے۔ حضرت صوفی صاحبؒ کی بھی متعدد تحریرات اس میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ذیل میں ہم الشریعہ اور اس کی پالیسی کے متعلق چند اہل علم کے اقتباسات نقل کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، صدر دارالعلوم کراچی فرماتے ہیں کہ ''ابھی مولانا (زاہد الراشدی) فرما رہے تھے کہ الشریعہ اکادمی میں ہم جو کام کر رہے ہیں، وہ روایتی انداز سے ہٹ کر ہے، اس لیے لوگوں کو اس کے بارے میں بتلانا اور سمجھانا بھی بعض اوقات ذرا مشکل سا ہوتا ہے۔ لیکن سچی بات ہے، میں جو محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی جو تعلیمی پالیسی عہد رسالت سے چلی آ رہی ہے، یہ اسی کا ایک تسلسل ہے جو الشریعہ اکادمی نے شروع کیا ہوا ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ، مئی جون ۲۰۰۹ء)

معروف محقق حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب (ابن مناظر اسلام حضرت مولانا منظور احمد نعمانیؒ و سرپرست ماہنامہ ''الفرقان''، لکھنو) فرماتے ہیں کہ ''آپ نے ایک نئی طرح ڈالی ہے، باعث دلچسپی ہے، خدا کرے رفتہ رفتہ یہ تجربہ ایسے نہج میں ڈھل جائے کہ سوچ کی مثبت اور مفید تبدیلی کو راہ ملے، آپ کو ماشاء اللہ رفقائے قلم اچھے میسر آ گئے

ہیں، شاید نئی نہج کی برکت ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۲ء)

مفسر قرآن حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہیدؒ فرماتے ہیں ''ہمارے مذہبی حلقے میں غالباً آپ (مولانا زاہدالراشدی) پہلے فرد ہیں جنھیں علمی وفکری مسائل پر بحث ومکالمہ کا ایک آزاد فورم قائم کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ بے شمار احباب کے تحفظات بلکہ اعتراضات کے باوجود ناچیز محسوس کرتا ہے کہ اس قسم کے فورم کی بہر حال ضرورت تھی۔ مخالفانہ نقطہ نظر کو یکسر رد کر دینا اور اپنے مبلغ علم ہی کو قطعیت کا درجہ دینا ان اہل نظر کو زیب نہیں دیتا جو فکر ولی اللّٰہی کے وارث ہیں۔ دلیل کا جواب دلیل ہی سے دینا چاہیے، لٹھ ماری سے نہیں۔ آپ کو لکھنے والے بھی خوب میسر آئے ہیں۔'' (ماہنامہ الشریعہ، مارچ ۲۰۰۷ء)

عظیم مذہبی سکالر حضرت مولانا علامہ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ صاحب (سابق صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد) فرماتے ہیں کہ ''میں روز اول سے اس رسالے کا باقاعدہ قاری ہوں، آپ کی تحریروں اور مضامین میں جو اعتدال اور توازن ہوتا ہے وہ گزشتہ کچھ عرصے سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تحریریں ملک میں ایک متوازن اور معتدل مذہبی رویے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کریں گی۔'' (ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۲ء)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد زاہد صاحب، نائب رئیس جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد فرماتے ہیں کہ ''ماہنامہ ''الشریعہ'' نے دینی جرائد میں ایک مستحسن روایت قائم کی ہے کہ وہ ہر نقطہ نظر اس کے دلائل کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اللہ کرے ہمارے بعض حلقوں میں غیر منصوص مسائل میں بھی دوسرے کا نقطہ نظر نہ سننے بلکہ جلدی سے اس کی نیت پر حملہ آور ہونے کا جو رجحان پایا جاتا ہے، اس کا ''الشریعہ'' کے اس طرز عمل سے کچھ علاج ہو جائے۔'' (ماہنامہ الشریعہ، اگست ۲۰۰۴ء) مزید فرماتے ہیں کہ ''ماہنامہ الشریعہ ہر مہینے وصول ہو کر ہوا کا ایک تازہ جھونکا مہیا کرتا رہتا ہے...... الشریعہ جیسے جریدے میں اپنے نقطہ نظر کی اشاعت میں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسے تنقید اور بحث کی چھلنی سے گزرنے کا موقع مل جائے گا اور اس سے مختلف کوئی رائے ہوگی تو وہ بھی سامنے آ جائے گی۔ دیگر دینی جرائد میں یہ بات تقریباً ناپید ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۲ء)

معروف کالم کار حضرت مولانا حذیفہ وستانوی صاحب (آف انڈیا) فرماتے ہیں کہ ''میں تقریباً ڈیڑھ سال سے مجلّہ ''الشریعہ'' کا پابندی سے مطالعہ کر رہا ہوں، واقعتاً آپ فارسی کی اس کہاوت کے مصداق ہیں جس میں کہا گیا ہے ''پسر نمونہ پدر است''...... ویسے تو میرے پاس ہندو پاک کے علاوہ سعودیہ، کویت وغیرہ سے بھی بے شمار رسائل، اردو، عربی، انگریزی و گجراتی میں موصول ہوتے ہیں مگر ان تمام میں سب سے زیادہ دلچسپ ومعلومات افزا بندہ کو ''الشریعہ'' لگا، الشریعہ کا ہر ماہ بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے مگر مجھے بہت دیر سے ملتا ہے، کبھی بے تاب ہو جاتا ہوں تو وقت نکال کر انٹرنیٹ پر بیٹھ جاتا ہوں اور alsharia.org پر جا کر اہم مضامین کا مطالعہ کر لیتا ہوں۔ (ماہنامہ الشریعہ مئی ۲۰۰۷ء)

شیخ الحدیث حضرت مولانا علامہ عبدالقیوم حقانی صاحب، بانی ومہتمم جامعہ ابو ہریرہؓ ومدیر القاسم فرماتے ہیں کہ ''گوجرانوالہ سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''الشریعہ'' ممتاز علم دین، محقق ومصنف اور جامعہ نصرت العلوم کے شیخ الحدیث

حضرت مولانا علامہ زاہدالراشدی صاحب کی زیرِ سرپرستی گزشتہ تیئیس سال سے شائع ہو رہا ہے۔ایک عرصہ تک خود علامہ راشدی صاحب اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں اور اب یہ علمی جریدہ ان کے جواں سال صاحبزادے محمد عمار خان ناصر کی زیرِ ادارت شائع ہو رہا ہے۔اس علمی جریدے نے روزِ اول سے عمومی گروہ بندی اور فرقہ بندی سے اٹھ کر فکری حوالے سے ایسی ساکھ بنالی ہے کہ یہ جریدہ ''پڑھے جانے والے جرائد'' میں سرفہرست ہے۔اس کے مضامین تنوع کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کا رنگ نمایاں ہے جو گہرائی اور گیرائی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اور شائع کرنے سے پہلے ان کے مندرجات پر ادارتی ٹیم ان مضامین پر خاصا غور و فکر بھی کرتی ہے۔

''الشریعۃ'' کی ادارتی ٹیم کالج و مدرسہ کے اہلِ علم و قلم پر مشتمل ہے جو علامہ راشدی صاحب کے فکر و دانش کا پتہ دیتی ہے۔اگرچہ جناب عمار خان ناصر کے بعض تفردات پر علمی حلقوں میں اضطراب پایا جاتا ہے، ''القاسم'' میں بھی ان کے تفردات پر گرفت کی گئی ہے، مگر جہاں تک اس جریدہ کے مضامین کی ندرت کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس علمی جریدہ نے مختلف حوالوں سے اپنی خصوصی اشاعتوں میں فکری رہنما کا کردار ادا کیا ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۲۰۱۲ء)

مشہور محقق حضرت مولانا صاحبزادہ نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب (مدیر سہ ماہی ''احوال و آثار'' کاندھلہ، انڈیا) فرماتے ہیں کہ ''میں الشریعہ کی تحریروں کا خاص توجہ سے مطالعہ کرتا ہوں۔ایسا فکری جریدہ ہمارے ہاں انڈیا سے شائع نہیں ہوتا۔'' (ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۲ء)

حضرت مولانا محمد وارث مظہری صاحب (مدیر ''ترجمان دارالعلوم'' دہلی، انڈیا) فرماتے ہیں کہ ''الشریعہ اتنا بڑا رول ماڈل ہے کہ ڈاکٹر ظفرالاسلام (مدیر ملی گزٹ، دہلی) نے مجھ سے کہا کہ ہمیں ''الشریعۃ'' جیسا فکری پرچہ انڈیا سے بھی نکالنا چاہیے۔'' (ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۲ء)

معروف صاحبِ قلم حضرت مولانا محمد ازہر صاحب (مدیر ماہنامہ ''الخیر'' ملتان) فرماتے ہیں کہ ''الشریعہ کی پاکستان کے علمی حلقوں میں اپنے مخصوص اسلوب اور سنجیدہ تحریروں کے باعث امتیازی پہچان ہے، الشریعہ قدیم علمی مباحث کے بجائے امت کو درپیش مسائل میں رہنمائی کو فوقیت دیتا ہے...... ہماری دانست میں سنجیدہ علمی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ''الشریعۃ'' کا انتخاب بالکل بجا ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۲ء)

''الشریعۃ'' کی پالیسی پر اعتماد کرنے والے اور اس کو سراہنے والے اہلِ علم و قلم اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں صرف چند ایک کے بیان پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔اللہ تبارک و تعالیٰ حق سچ سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین یا رب العالمین۔

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

مولانا راشدی اور ان کے تنگ نظر ناقدین

[حافظ محمد اسامہ مدنی کی تصنیف ''شواہدات بجواب نوازشات'' کے پیش لفظ کے طور پر لکھا گیا]

مولانا راشدی کی شخصیت سے کون متعارف نہیں! مسلمانان عالم خواہ عرب وعجم کے ہوں یا یورپ وافریقہ اور دیگر براعظموں کے، سب ہی کے ہاں وہ اہل السنۃ والجماعۃ، احناف اور مسلک دیوبند کے ایک مدبر، صاحب فہم وفراست، حالات حاضرہ کی نبض پر مضبوط گرفت رکھنے والے کہنہ مشق اور ہر دلعزیز عالم باعمل انسان ہیں۔ ان میں بہت سی خصوصیات ایسی بھی ہیں جو ملک کے خال خال اہل علم میں بھی شاید مفقود ہوں، الا ماشاءاللہ۔ اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے وہ مسلسل ''محسود'' چلے آ رہے ہیں، لیکن ہمیں خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ ہے کہ ان میں موجود خداداد صفات میں کیڑے نکالنے والے پہلے کی طرح ہمیشہ ناکام ہی ہوں گے، ان شاءاللہ العزیز، کیونکہ و ذلك فضل اللّٰہ یؤتیه من یشاء۔

ے ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میری ناقص رائے کے مطابق مولانا راشدی پر اعتراضات کرنے والا آدمی کم از کم مندرجہ ذیل صفات کا حامل ضرور ہونا چاہیے، وگرنہ اسے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا:

(۱) جس نے ان کی اول تا آخر تحریرات کا بنظر غائر مطالعہ کر رکھا ہو۔

(۲) اکابر اہل السنۃ والجماعۃ احناف اور علماء دیوبند کی تحریرات اور طرز عمل سے بھی آگاہ ہو۔

(۳) سنی سنائی باتوں پر یقین رکھنے والا اور کانوں کا کچا نہ ہو۔

(۴) تفصیلی عبارات کو چھوڑ کر مجمل اور مبہم عبارات سے استدلال کرنے والا نہ ہو، یعنی تاویل القول بما لا یرضی به القائل کا داعی نہ ہو۔

(۵) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فہم سلیم اور تدبر وحوصلہ سے بھی مالا مال ہو۔

ان اوصاف سے متصف آدمی اگر انفرادی طور پر ہمارے ساتھ زبانی یا تحریری بات کرنا چاہے تو ہم ان شاءاللہ العزیز اس کی تسلی وتشفی کر دیں گے۔

مولانا راشدی جامعہ نصرۃ العلوم کے صدر مدرس ہیں اور احقر مہتمم کے منصب پر فائز ہے۔ اس سلسلے میں اب تک

جتنے بھی علماء کرام اور احباب سے بات ہوئی ہے، انہوں نے مولانا راشدی کی عالم اسلام کے لیے بے بہا خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کے معاندانہ ومخاصمانہ رویہ پر شدید افسوس کا اظہار بھی کیا ہے اور جن چند لوگوں نے ان پر اعتراضات کو صحیح سمجھا ہے، میرے مشاہدے کی حد تک یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ لوگ مندرجہ بالا صفات کے حامل نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے بعض حضرات سے استفسار پر اصل حقائق سے بے خبر ہونے کی وجہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ صرف للہ فی اللہ مخالفت برائے مخالفت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

ایک بڑا المیہ بلکہ سانحہ یہ بھی ہے کہ مولانا راشدی کے خلاف پراپیگنڈا سے متاثر حضرات میں سے ہر کہ ومہ یہ چاہتا ہے کہ وہ مولانا کو اپنی عدالت کے کٹہرے میں تنہا کھڑا کر کے ان سے براہ راست سوال وجواب کر کے اطمینان حاصل کرے، لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان حضرات کے پاس شاید اتنا فالتو وقت ہو، لیکن جس شخص نے روزانہ تفسیر قرآن، بخاری شریف، مسلم شریف، طحاوی شریف، حجۃ اللہ البالغہ، دیوان الحماسہ، متن الکافی وغیرہ جیسے اسباق پڑھانے ہوں، صبح کا عوامی درس قرآن و حدیث دینا ہو، جمعہ کی خطابت کرنی ہو، متعدد رسائل وجرائد کے مضامین اور کئی اخبارات کے کالم لکھنے ہوں اور ملک بھر میں خصوصی وعمومی اجتماعات کے لیے مسلسل اسفار کرنے ہوں اور ذاتی ضروریات بھی ہوں، وہ اتنا فارغ البال نہیں ہوتا کہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ مطمئن کر سکے، لہٰذا ان سے اس قسم کی باز پرس کی توقع رکھنا کم از کم نادانی سے کم نہیں ہے۔

مولانا راشدی کی شخصیت وہ ہے جس پر عالم اسلام کے اکابر اہل علم نے اعتماد کا اظہار کیا ہے، یہ بات شاید بہت سے حضرات کو معلوم نہ ہوگی کہ

☆ اہل السنۃ والجماعۃ فقہ حنفی کے نامور امام، محدث اور فقیہ عالم دین علامہ زاہد الکوثری المصریؒ کے مشہور زمانہ اور ممتاز شاگرد اور جانشین الحافظ الکبیر المحدث الفقیہ الشیخ ابو زاہد عبد الفتاح ابو غدہ الحلبی الشامیؒ نے اپنی سند کے ساتھ انہیں حدیث کی اجازت دی ہے۔

☆ اہل السنۃ والجماعۃ فقہ شافعی کے مرجع الخلائق محدث عالم الشیخ المسند ابو الفیض محمد یاسین الفادانی المکیؒ نے اپنی سند کے ساتھ انہیں حدیث کی اجازت دی ہے۔

☆ اہل السنۃ والجماعۃ فقہ حنبلی کے ہر دلعزیز معمر عالم الشیخ المحدث عبد اللہ بن احمد الناخبی الیافعی الحضرمی الیمنیؒ نے اپنی سند کے ساتھ انہیں حدیث کی اجازت دی ہے۔

☆ اہل السنۃ والجماعۃ فقہ حنفی اور سلسلہ دیوبند اور ندوہ کے عرب وعجم میں ممتاز عالم دین اور مفکر الاستاذ الکبیر الشیخ السید ابو الحسن علی الحسنی الندوی الہندیؒ نے اپنی سند کے ساتھ انہیں حدیث کی اجازت دی ہے۔

☆ مفسر اعظم پاکستان حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتیؒ فاضل دیوبند، محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ فاضل دیوبند، محقق العصر حضرت مولانا محمد نافع جھنگوی مدظلہ العالی فاضل دیوبند، الشیخ الکبیر

حضرت مولانا مفتی جمال احمد المظاہری بنویؒ فاضل مظاہر العلوم سہارنپور اور استاذ الکل حضرت مولانا عبد القیوم ہزارویؒ فاضل جامعہ خیر المدارس جیسے اساطین علم وفضل نے بھی اپنی سندوں کے ساتھ انہیں اجازت حدیث عطا فرمائی ہے۔

☆ امام الہدیٰ جانشین امام الاولیاء حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ فاضل دیوبند نے اپنے دست حق پر انہیں بیعت فرمایا اور راشدی کی نسبت بھی عطا فرمائی۔

☆ مفکر اسلام حضرت مولانا السید ابوالحسن علی الندویؒ فاضل دیوبند نے اپنے دست مبارک پر انہیں بیعت فرمایا۔

☆ امام اہل السنۃ محدث کبیر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے اپنے دست بابرکت پر انہیں بیعت فرمایا اور خلافت سے سرفراز فرمایا، اپنی مسند تفسیر وحدیث پر بٹھایا، تصوف کے موضوع پر کتاب لکھنے کا حکم فرمایا اور اپنا جنازہ پڑھانے کی وصیت بھی فرمائی۔

☆ مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ وغیرہ اکابر کا مکمل اعتماد اور رفاقت بھی آپ کو نصیب ہوئی۔

الغرض یہ ایک طویل داستان ہے۔ مولانا راشدی کی شخصیت کو سمجھنے، جانچنے اور پرکھنے کے لیے نسل نو کو عموماً اور ان پر نکتہ چینی کرنے والے حضرات کو خصوصاً بانی دار العلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فلسفہ اور علوم کے وارث حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کی تقریر کے چند اقتباسات ضرور مطالعہ کرنے چاہئیں جو انہوں نے اسلاف کی موت کے ضمن میں موجودہ دور کے علماء کی ذمہ داریوں اور طرز عمل اور ان کے نتائج کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

......''ایک زمانہ تھا کہ روایت کا غلبہ تھا۔ عوام میں سے کوئی اس وقت تک دین کی بات نہیں مانتا تھا جب تک کہ سند پڑھ کر کوئی حدیث نہ سنا دی جائے۔ تو یہ روایت کا دور تھا، روایتی طور پر دین کو قائم کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا، یہ معتزلہ کا دور تھا۔ کوئی شخص دینی مسئلہ نہیں جانتا تھا جب تک کہ عقل کے پیرائے میں نہ سمجھائیں۔ تو ایسے علماء اللہ نے کھڑے کیے، امام رازیؒ، امام غزالیؒ کہ انہیں کی زبان میں دین سمجھایا، ان کو تائب کیا۔ پھر ایک زمانہ تصوف پسندی کا آیا۔ جب تک صوفیانہ رنگ میں کوئی نہ سمجھائے، لوگ نہیں سمجھتے تھے تو اللہ نے ایسے صوفیائے کرام کھڑے کیے کہ ہر مسئلہ کو صوفیانہ رنگ میں ڈھالتے کہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔ آج حسیّات کا دور ہے، فلسفۂ قدیم کا دور ختم ہو گیا جو محض نظریاتی طور پر فلسفہ تھا۔ اب حسیّات کا دور ہے، مشاہدات کا دور ہے۔ جب تک ایسے علماء نہ ہوں کہ مشاہدات کے انداز میں، سائنس کے انداز میں، حسّی مثالوں سے دین کو نہ سمجھائیں گے، لوگ نہیں سمجھیں گے۔ اگر بڑے ہی لوگ بیٹھے رہتے، آج کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے تو دین نہ سمجھا سکتے۔ اللہ نے انہیں اٹھا لیا، ان کے خلف صالح پیدا کر دیے کہ وہ اس دور کے مطابق اسی رنگ میں سمجھائیں''......

......''اگر قیامت تک سارے بڑے بیٹھے رہا کرتے تو چھوٹوں کے جوہر کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی،

چھوٹوں کا نہ علم سامنے آتا نہ کمال، مگر بڑوں کا کمال سامنے رہتا، سب اسی میں لگے رہتے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں تشریف رکھتے تو صحابہؓ کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اطاعت اور اطاعت گزاری میں رہتے۔ مستقل ہو کر، آگے آ کر اپنی طبیعت اور قلب کے جوہر نہ دکھلاتے۔ نہ صدیق اکبرؓ کے جوہر کھلتے، نہ فاروق اعظمؓ کے جوہر کھلتے۔ یہ جبھی ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور یہ قائم مقام بنے، قائم مقامی کا کام انجام دیا، اس میں تمام جوہر کھلے''......

......''سو برس میں ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر آئندہ آنے والی نسل کے نظریات الگ ہوتے ہیں، افکار الگ ہوتے ہیں، نفسیات الگ ہوتی ہیں، اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ اسی دور کے اہل علم اپنی نفسیات میں ان کو دین سمجھانے والے ہوں۔ پرانے لوگ اگر ہوتے تو اپنی نفسیات میں سمجھاتے تو وہ لوگ دین کو نہ سمجھ سکتے، اس لیے اللہ نے موت کو رکھا تاکہ نئے لوگ جب آئیں تو نئے مجدد بھی پیدا ہوں، اسی زمانے کی اصطلاح میں، اسی زبان میں، اسی ڈھنگ سے دین کو پیش کریں اور سمجھائیں''......

(خطبات حکیم الاسلام ج ۲ ص ۳۶۴ تا ۳۶۶)

فقہ حنفی کے مشہور فتاویٰ حاشیہ ابن عابدین علی الدر المختار میں مشہور مقولہ درج ہے کہ من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج اکثر سطحی علوم کے حامل علماء اس دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عوام کی صحیح راہنمائی کے جوہر سے محروم ہیں، اسی لیے مؤرخ ابن خلدون نے اپنے ''مقدمہ'' میں ایک فصل کا عنوان قائم کرتے ہوئے کیا عجیب تبصرہ کیا ہے: ان العلماء من بين البشر ابعد عن السياسة اور جن میں اللہ رب العزت نے یہ صلاحیت رکھی ہے، ان کو قدم قدم پر اپنوں اور بے گانوں کی طعن وتشنیع، گالی گلوچ، الزام تراشی، بہتان بازی، دشنام طرازی اور نت نئے پراپیگنڈوں کا سامنا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ خدا کا شکر ادا کریں کہ ہماری جماعت میں اللہ نے ایسے صلاحیت والے لوگ پیدا کر رکھے ہیں جو بعض معاملات میں پوری جماعت کی طرف سے تن تنہا فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، ایسے معترضین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی رسائی کی حد تک پہنچ کر آگے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سنیت، حنفیت اور دیوبندیت کو بس اسی خول میں مقید دیکھنا چاہتے ہیں جو انہیں نظر آ رہا ہے۔ حالانکہ دیوبندیت تو ایک بحر بیکراں ہے جس کی لامحدود وسعتوں کو ایک جوہڑ میں تبدیل کرنے کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

تحدیث نعمت کے طور پر ہم یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور اسے پاکستان کا بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ دیوبندیت کی صحیح علمی وتحقیقی ترجمانی جتنی جامعہ نصرۃ العلوم اور اس کے مشائخ نے کی ہے، اتنی کسی بڑے سے بڑے ادارہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ آج دیوبندیت کا ٹکٹ اور سرٹیفکیٹ وہ لوگ تقسیم کرنا چاہتے ہیں جو خود دیوبندیت کی صحیح تعریف کرنے سے بھی عاجز وقاصر ہیں۔

مولانا راشدی کے خلاف مخالفین کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ انہوں نے آزاد فورم قائم کیا ہے جس کی دیوبندیت میں کوئی مثال نہیں ہے، حالانکہ ایسے لوگ اکابر کی تحریرات اور طرز وروش سے بالکل ہی نابلد ہیں۔ یہ لوگ

جانشین شیخ الہندؒ، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے جنہوں نے آزاد فورم کی ایک منظم طریقے سے طرح ڈالی۔ ان کا سورت کے مقام میں ۲۷/اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کے انیسویں اجلاس میں تحریری پیش کردہ خطبۂ صدارت ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کو کیا تجاویز دی تھیں۔ لکھتے ہیں:

......''جمعیۃ علماء ہند کا ادارہ نشر واشاعت اس سلسلہ میں متعدد قیمتی رسالے اور کتابچے شائع کر چکا ہے، مگر جب تک اصحاب استطاعت اور ہمدردانِ ملت اپنے فرض کو محسوس کرتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون نہ کریں گے، اس ادارہ کی فیض رسانی اور افادیت کا دائرہ خاطر خواہ وسعت اختیار نہیں کر سکے گا، اس ادارہ کو کامیاب بنا کر ہم اس فرض کو انجام دے سکیں گے جو حدود وطن میں ہم پر عائد ہوتا ہے، مگر جو دعوت عمومی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے جس کا مخاطب کسی ملک یا خطہ کو نہیں بلکہ پوری نوع انسان کو گردانا گیا ہے۔، وہ ایک ایسے ادارہ نشر واشاعت کا مطالبہ کرتی ہے جس کا پیمانہ ہمارے اس ادارہ سے بہت زیادہ وسیع ہو اور جس کا دامن پوری دنیا کے ہر ایک سمجھنے والے انسان تک دراز ہو سکے......

......ایسے ہی ہمارے ادارہ نشر واشاعت اور ہماری تعلیمی انجمنوں کا بھی فرض ہے کہ جس طرح وہ بڑوں کی معلومات کے لیے کتابچے مرتب کریں، ایسے ہی بلا لحاظ مذہب وملت ہر ایک بچے کے سامنے بھی ایسے دلچسپ رسالے پیش کریں جن سے وہ تمام ہی فرقوں کے پیشواؤں کو جان سکیں اور ان کے احترام کے لیے ابتدا ہی سے ان کے ذہن ودماغ میں گنجائش پیدا ہو سکے۔'' (خطبات صدارت ص ۴۸۴ تا ۴۸۶)

افسوس صد افسوس کہ یہی کام اگر مولانا راشدی کریں تو وہ قابل گردن زدنی قرار پائیں۔ ہم اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ وہ ایسے مخالفین کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب فرمائے اور اس کتاب کو اہل اسلام کے لیے احقاق حق اور ابطال باطل میں صحیح امتیاز کا ذریعہ بنائے، آمین یا رب العالمین۔

حالیہ فتویٰ بازی

پس منظر و پیش منظر

مولانا عبدالمتین نعمانی*

تنظیم فکر ولی اللٰہی کے متعلق جامعہ فاروقیہ کا فتویٰ

اصول فتویٰ اور دینی اخلاقیات کی روشنی میں

دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کا فتویٰ

سوال: تحریک شاہ ولی اللہ اور تحریک کے قائد مولانا سعید احمد رائے پوری کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔ نیز ان کی تنظیم میں شامل ہونا اور ان کی تائید کرنا کیسا ہے؟

جواب: یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اسلام کو آج تک کفار نے میدان جنگ میں مقابلے میں آ کر اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ انھوں نے منافقت کی چادر اوڑھ کر اسلام کے نام سے اسلام کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں اسلام کے لباس میں ننگ دین وننگ ملت لوگ اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ قرون اولیٰ سے یہ لوگ مختلف اوقات میں نئے نئے اور خوش کن ناموں سے سادہ لوح عوام کو اپنے جال میں پھانستے رہتے ہیں اور اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے بزرگ ہستیوں سے اپنا تعلق جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ حقیقت میں ان بزرگان دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسند ہند، حضرت شاہ ولی اللہؒ ایک عالم گیر شخصیت کے مالک تھے۔ دین کی خدمت اور تبلیغ کے سلسلے میں عالم اسلام پر عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں پر خصوصاً حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے احسانات ایک ناقابل انکار حقیقت ہیں، اس لیے برصغیر کا ہر مسلمان (اگر اسے دین سے ادنیٰ تعلق بھی ہو تو) حضرت شاہ صاحب کا نام نہایت ادب واحترام سے لیتا ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا تعلق بھی ان اکابرین سے ہے جن کی انتہائی کوششوں سے انگریز برصغیر چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

سوال میں مذکورہ جماعت ''تحریک فکر شاہ ولی اللہ'' اپنے آپ کو حضرت شاہ صاحب اور مولانا سندھی صاحبؒ کے سیاسی افکار کی امین سمجھتی ہے، جبکہ ان بزرگان دین کا ان کے وضع کردہ افکار سے دور کا بھی واسطہ نہیں، بلکہ یہ ایک انتہائی گمراہ کن جماعت ہے۔ یہ لوگ اپنا نظریہ اور منشور عام لٹریچروں اور مجلسوں میں بیان نہیں کرتے، بلکہ مختلف پروگراموں کے ذریعے تدریجاً اپنے کارکنوں کے ذہن میں منتقل کرتے رہتے ہیں، چنانچہ کچھ عرصے بعد اس تنظیم سے

---

*استاذ دارالعلوم مدرسہ عربیہ اسلامیہ، بورے والا

منسلک ہونے والا آخر کار دہریت کے قریب یا بالکل دہریہ بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے چند باطل نظریات ذکر کرتے ہیں:

(۱) بغیر اسباب کے اللہ تعالیٰ کسی کام کے کرنے پر قادر نہیں۔

(۲) نماز کا درجہ صرف ''سبحان اللہ'' کہنے کی طرح ہے۔ نماز نہ پڑھنے پر گناہ نہیں۔

(۳) امام مہدی کا تصور مردہ قوموں کا تخیل ہے۔

(۴) جنت و دوزخ من گھڑت خیالات ہیں۔

(۵) کمیونزم عین اسلام ہے۔

(۶) قتال کرنا قطعاً جائز نہیں۔

(۷) صحابہ معیار حق نہیں۔

(۸) خلافت کے بغیر ایمان و اعمال بے کار ہیں۔

(۹) سود جائز ہے۔

(۱۰) ڈاڑھی کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔

(۱۱) موجودہ دور میں حدود ظلم ہیں۔

(۱۲) علما معاشرے پر بوجھ ہیں، انھیں قتل کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا ایسی باطل تنظیم سے کسی کا تعلق رکھنا جائز نہیں، بلکہ اس کے فتنے کو ختم کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش کرنا ضروری ہے۔

(شائع شدہ ماہنامہ ''الفاروق''، کراچی، رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ)

فتویٰ جاری کرنے کے بعد تائیدی مواد کی تلاش

مذکورہ فتویٰ شائع ہونے کے تین ماہ بعد مولانا سلیم اللہ خان کا اپنے ایک خیر خواہ دوست کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''مکرمی حضرت مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! فکر ولی اللہی کے متعلق کئی حضرات پوچھتے رہتے ہیں، لیکن سنی سنائی باتوں کے علاوہ کوئی مطبوعہ مواد اس فرقے کا جو ان کے خیالات کے سلسلے میں مستند قرار دیا جا سکے، دستیاب نہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ جناب اس سلسلے میں راہنمائی فرما سکتے ہیں۔ اگر مہربانی فرمائیں تو ممنوں ہوں گا۔

امید ہے کہ جواب میں تاخیر نہیں ہوگی۔ جوابی لفافہ حاضر ہے۔

سلیم اللہ خان

۱۴۲۰/۱۲/۹ھ

۲۰۰۰/۳/۱۵ء''

خط کا راز فاش ہونے پر مولانا سلیم اللہ خان کی وضاحتی تحریر

''ان کے عقائد سینہ بسینہ منتقل کیے جاتے ہیں۔ ان کو طبع کرنے سے یہ گریز کرتے ہیں۔ ان کی مخصوص مجلسوں میں بھی ہر شخص کو شرکت کی اجازت نہیں ہوتی، جب تک وہ ان کے لیے قابل اعتماد نہ ہو جائے۔ وہاں کوئی کاغذ قلم لے جا سکتا ہے نہ ٹیپ ریکارڈ، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے تحریر ضروری نہیں، ثقہ اور معتبر گواہی بھی ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اسلام کا نظام عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ کرنے کے لیے شہادت کو کافی قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے مدعا علیہ کی تحریر ضروری نہیں۔ روافض نے بھی اپنے باطل عقائد کو پھیلانے کے لیے تقیہ ہی کا سہارا لیا تھا۔ یہی طریقہ ان کا ہے تو ان کا استاد اس معاملے میں عبداللہ بن سبا یہودی ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ شاید فلاں صاحب کے پاس کوئی تحریر ان کے عقائد کے متعلق ہو تو میں نے ان کو خط لکھ دیا تھا۔ انھوں نے بجائے جواب دینے کے یہ مہربانی فرمائی کہ میرے خط کو ان لوگوں کے حوالہ کر دیا، اس کو لے کر یہ پھیلا رہے ہیں۔ عدالتی نوٹس بھجوا رہے ہیں۔ مغلظات سے بھرے ہوئے خطوط لکھ رہے ہیں۔ خدائے پاک ان کو ہدایت دے، آمین۔ باقی ان کا معاملہ واضح ہے، وہ تحریر پر موقوف نہیں۔ چونکہ ان کے خلاف گواہیوں کی کمی نہیں، اسی لیے یہ علماء پاکستان کے نزدیک اپنے نظریات کے اعتبار سے مشتبہ نہیں ہیں۔ رائے پور سے منسوب ایک معروف بزرگ سید نفیس شاہ صاحب سے بھی میں نے ان کے متعلق پوچھا تھا۔ وہ بھی افسوس کا اظہار فرما رہے تھے۔ اسی طرح خانقاہ رائے پور کے اکثر وبیشتر منتسبین نے جب ان پر حقیقت کھلی تو ان سے قطع تعلق کر لیا ہے۔''

سلیم اللہ خان

۱۴۲۱/۵/۱۸ھ

۲۰۰۰/۸/۱۹ء

مکتوب بنام جناب مولانا عبد المجید لدھیانوی

محترم جناب مولانا عبد المجید صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث مدرسہ باب العلوم کہروڑ پکا (لودھراں)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

مقصود تحریر اس وقت یہ ہے کہ آپ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء بروز منگل دار العلوم مدرسہ عربیہ اسلامیہ بورے والا میں وفاق

المدارس العربیہ کے قائم کردہ امتحانی مرکز کے معائنہ کے لیے تشریف لائے تو آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس موقع پر تنظیم فکر ولی اللّٰہی اور حضرت شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ مسند نشین خانقاہ عالیہ رائے پور کے بارے میں صدر وفاق المدارس کے رویے اور وفاق کی مجلس کے فیصلے پر گفتگو ہوئی تو آپ نے بتایا کہ وفاق کے ایجنڈہ پر تنظیم کے حوالہ سے کوئی بات نہ تھی اور یہ کہ آپ مذکورہ اجلاس میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ نیز آپ نے صدر وفاق کی طرف سے تحقیق نہ کرنے کو تسلیم کیا اور ساتھ ہی پیشکش کی کہ ماہنامہ الفاروق میں مندرجہ الزامات واتہامات کے حوالہ سے نکتہ وار جواب لکھ دیا جائے تو آپ وفاق کے ذمہ داروں کو رجوع پر آمادہ کریں گے۔ سو اتمام حجت کے لیے مطلوبہ جواب حاضر ہے۔ امید ہے کہ جن حضرات کو واقعتہ کوئی غلط فہمی ہے وہ حقائق کو تسلیم کرنے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیں گے اور رجوع کرنے میں سبکی محسوس نہیں کریں گے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ اسباب کا محتاج نہیں کیونکہ اسباب مخلوق ہیں اور خالق اپنی مخلوق کا محتاج نہیں ہوسکتا۔ وہ قادر مطلق ذات اور فعال لمایرید کی صفت کا حامل ہے۔

۲۔ نماز بعد از شہادتین (توحید ورسالت) دین اسلام کا سب سے اہم رکن اور شعائر دین میں سے ہے۔ اس کی فرضیت کا انکار کفر اور اس کا ترک گناہ کبیرہ ہے۔

۳۔ مہدی علیہ السلام کا ظہور مستند احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ جن کی رو سے وہ زمین کو عدل وانصاف سے مالا مال کریں گے اور ظلم کا قلع قمع کریں گے۔

۴۔ جنت ودوزخ برحق ہیں اور قیامت کے روز تمام افراد انسانیت اپنے اعمال کے مطابق ان مقامات میں جزا یا سزا پائیں گے۔

۵۔ کمیونزم سمیت دنیا کا کوئی مادی نظام اور ملحدانہ فکر، اسلام کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ اسلام ایک مکمل جامع اور تمام نظاموں کو منسوخ کرنے والا ہے۔ تنظیم کے اغراض و مقاصد میں ''اسلام کے خلاف مستشرقین کے گمراہ کن پروپیگنڈے، الحاد ارتداد، بے دینی، تحریف فی الدین کی تحریکوں اور مخالف دین نظاموں پر عالمی سطح پر ہونے والی انسانیت دشمن اور معاند اسلام سازشوں سے نوجوانوں کو باشعور رکھنا، شامل ہے۔ (دفعہ نمبر ۴، دستور تنظیم)

۶۔ جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معیار حق وصداقت، اس کی عظیم خدمات اور تاریخ اسلام کے اجتماعی نقطہ نظر سے نوجوانوں کو واقف کرانا تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے اغراض ومقاصد میں شامل ہے (دفعہ نمبر ۴ (ب) دستور تنظیم) اور ہر تنظیم اپنے اغراض ومقاصد سے ہی پہچانی جاتی ہے۔

۷۔ قتال از روئے قرآن فرض ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے، اس کی فرضیت کی نوعیت (عینی یا کفائی، اقدامی یا دفاعی وغیرہ) کا تعین فقہائے کرام نے جن حوالوں سے کیا ہے اس کی پابندی لازمی ہے اور اس سے انحراف موجب فساد وانتشار ہے۔

۸۔ ایمان اور نیک اعمال کا ہر مکلّف انسان مخاطب ہے۔ ان پر عمل کے لیے قیام خلافت کے انتظار کا نظریہ

شریعت کو معطل کرنے کے مترادف ہے جس کی اجازت کسی انسان کو حاصل نہیں۔ تاہم قیام خلافت کے لیے جدوجہد کرنا ایک مستقل دینی فریضہ ہے، جس سے انحراف بے دینی ہے۔

۹۔ سود نہ صرف حرام بلکہ اس کو جائز قرار دینے والا دائرہ اسلام سے خارج، دشمن انسانیت اور محارب خدا اور رسول ہے۔ اس کے خلاف جدوجہد تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا ایک اہم ترین مقصد ہے۔

۱۰۔ داڑھی سنت مؤکدہ ہے اور امور فطرت میں سے ہے۔ اس کا احیاء حب رسول کی پہچان اور اس کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنا دینی تقاضہ ہے۔

۱۱۔ حدود کا ثبوت قطعی نصوص سے ہے۔ ان کا نفاذ قیام عدل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ان سے ہی صحیح معنوں میں جرائم کی بیخ کنی ہوگی۔

۱۲۔ علماء حق انبیاء کرام کے وارث اور لائق اتباع ہیں۔ تنظیم کے دستور کی دفعہ ۲ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا نصب العین تمام شعبہ ہائے حیات میں دین کے مکمل غلبہ کے ذریعہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے قرآن وسنت کے احکام کے مطابق علماء حق کی رہنمائی میں انفرادی، اجتماعی زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔ (علماء حق وہ ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، آئمہ اربعہ اور سلف صالحین رحمہم اللہ کی نقل کردہ تعبیر دین کے ترجمان ہوں)

ان مندرجہ بالا حقائق کے اثبات کے لیے قرآن وسنت سے دلائل کا تذکرہ آپ جیسے عالم دین کے لیے ضروری نہیں سمجھتا۔ اس لیے ان کو تحریر میں نہیں لایا گیا۔ آخر میں واضح لفظوں میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رسالہ الفاروق میں مذکورہ عقائد ونظریات سے حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی اور تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور ان کی طرف سے ان کی نسبت کرنے والے کاذب ومفتری اور ظالم ہیں۔

الا لعنة اللّٰہ علیٰ الکاذبین والمفترین. الا لعنة اللّٰہ علیٰ الظالمین. الذین یصدون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجا.

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

فقط والسلام
عبدالمتین نعمانی
(12-11-2000)

مکتوب بنام مولانا سلیم اللہ خان

محترم جناب مولانا سلیم اللہ خان صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید ہے کہ مزاج سلامت ہوں گے۔ آپ کے جامعہ سے جاری ہونے والے رسالہ الفاروق میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی اور ان کی قائم کردہ تنظیم فکر ولی اللّٰہی (پاکستان) کے خلاف بے بنیاد

الزامات پر مبنی ایک مضمون پڑھا۔ ایک دینی رسالہ میں اس طرح کے جھوٹے اور من گھڑت مضمون کا چھپنا نہایت افسوسناک ہے جس سے خانقاہ عالیہ رائے پور سے وابستہ لاکھوں عقیدت مندوں کی دل آزاری ہوئی۔

مضمون نگار اور مضمون شائع کرنے والے حضرات کو چاہیے تھا کہ وہ صاحب معاملہ سے جن سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں۔ تحقیق وتصدیق کیے بغیر محض سنی سنائی باتوں اور جھوٹی گواہیوں کی بنیاد پر برصغیر کی عظیم خانقاہ کے مسند نشین کے خلاف مضمون چھاپنے سے پہلے ان سے ملاقات کر کے یا کم از کم خط وکتابت کے ذریعے ہی آگاہی حاصل کر لیتے۔ قطب وقت کی طرف جھوٹے عقائد کو نسبت کرنا اور ان پر کفر والحاد کا فتویٰ لگانا علماء کرام کے لیے تو کسی صورت روا نہیں۔

آپ کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا پروگرام کوئی نیا نہیں، یہ اکابرین علمائے حق کی جدوجہد کا تسلسل ہے۔ تنظیم سے وابستہ حضرات کو حضرت امام شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حضرت مولانا محمد میاں اور حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہم اللہ کے افکار، مضامین وکتب پڑھائی جاتی ہیں۔ ہم نے اپنا کوئی لٹریچر تیار کیا ہے نہ ہی اکابر کے لٹریچر کی موجودگی میں کسی لٹریچر کی ضرورت ہے، بلکہ آج تو ضرورت ہی اکابرین حق سے وابستہ کرنے کی ہے۔ تنظیم کے دوستوں نے سینکڑوں نوجوانوں کو حضرات اکابرین کے پروگرام سے واقف کرایا اور شعوری طور پر وابستہ کروایا ہے۔ اس کا اہل حق سے وابستہ کسی دوسری تنظیم یا ادارہ سے کوئی تضاد نہیں بلکہ اس کے کام کے نتائج تمام اہل حق تنظیموں کے حق میں ظاہر ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

تنظیم کی دعوت پر مشتمل کتابچہ ارسال کر رہا ہوں تاکہ آپ حقائق سے آگاہ ہو سکیں۔ ہمارے عقائد الحمد للہ وہی عقائد ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ تک کی کتب میں مندرج ہیں۔ ان عقائد سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو کہ آپ کے ''الفاروق'' میں منسوب کیے گئے ہیں۔ یہ کسی مفتی ماجن کے خیالات محسوس ہوتے ہیں۔ ابھی آپ کے دستخط کے ساتھ ایک اور مضمون سامنے آیا جس میں تو غیر ذمہ داری کی انتہا کر دی گئی۔ تنظیم کی یہ پالیسی نہیں کہ وہ کسی کے خلاف غلیظ زبان استعمال کرے اور نہ ہی تنظیم کا کوئی ذمہ دار فرد ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ چونکہ حضرت رائے پوری مدظلہ العالی کے عقیدت مند پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور کئی ایک تنظیم کے نظم سے باہر ہیں، اس لیے ان میں سے کسی نے الفاروق کے ہجویات پڑھ کر شدید جذبات میں آپ کے منصب کا خیال نہ رکھا ہو جس کو آپ سے دستخط لینے والے حضرات بھی پامال کر چکے ہیں۔ حضرت رائے پوری مدظلہ العالی اور تنظیم پر ملحد ہونے اور سبائی ہونے کا الزام کوئی انتہائی کم ظرف شخص ہی لگا سکتا ہے، چہ جائیکہ ایک مدرسہ کے شیخ الحدیث سے اس قسم کی افترا پردازی پر دستخط لیے جائیں۔ تحریر میں سید نفیس شاہ صاحب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کیا انہوں نے بھی اپنی خانقاہ کے مسند نشین کی جانب من گھڑت عقائد منسوب کیے ہیں یا کسی کی بیان کردہ کہانی پر اظہار افسوس کیا ہے؟

تحریر میں یہ شکایت بھی کی گئی ہے کہ تنظیم کے خصوصی اجلاسوں میں کسی کو شرکت کی اجازت نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا وفاق المدارس کی شوریٰ کے اجلاس میں ہر مسلمان یا ہر عالم شریک ہو سکتا ہے؟ بلکہ وفاق کی انتظامیہ تو مجلس شوریٰ

کے اجلاس سے مجلس عمومی کے ارکان علماء کرام کو بھی نکال باہر کرتی ہے۔ تو کیا اس کا یہی مطلب ہے کہ وفاق کی مجلس شوریٰ میں تخریب دین اور پاکستان دشمن طاقتوں سے ساز باز جیسے معاملات طے پاتے ہیں؟ اگر نہیں تو تنظیم کے بارے میں ایسے افسانے گھڑنے کا کیا جواز ہے کہ خصوصی اجلاسوں میں غلط نظریات پڑھائے جاتے ہیں؟ دراصل تنگ نظر افراد اپنے اکابر کے نظریات وافکار سے ناواقف ہیں۔ **والناس اعداء لما جھلوا** (اور لوگ ان باتوں کے دشمن ہوتے ہیں جن سے وہ واقف نہیں ہوتے) کے اصول کے تحت انہیں اپنے علاوہ سب غلط نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اکابرین کی کتابیں استعداد کے مطابق درجہ بدرجہ پڑھتے ہیں۔ جیسے درس نظامی کے درجہ اولیٰ کے طالب علم کو دورہ حدیث کے علوم سمجھ نہیں آتے، اسی طرح اکابر کی کتب سمجھنے کے لیے ابتدائی استعداد ناکافی ہوتی ہے۔ ہمیں استاد محترم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ کبھی بھی منبر پر عوام کے سامنے حنفی شافعی دلائل مت بیان کرنا کہ اس سے کئی لوگ دین سے بدظن ہو سکتے ہیں۔ اس لیے درجاتی تعلیمی نظام کا قیام ضروری قرار پاتا ہے۔

منسوب کردہ عقائد کے بارے میں ہماری تحقیقاتی رپورٹ یہ ہے کہ یہ عقائد دراصل آپ کے ایک افغان شاگرد خالد محمود گیان فاضل جامعہ فاروقیہ کے ہیں جو اس نے دوران تعلیم اپنائے اور پھر تنظیم میں ان کو لانے کی کوشش کی جس پر تنظیم نے اس شخص اور اس کے خیالات سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا جو صوبہ سرحد کے اخبارات میں شائع بھی ہوا۔ یہ شخص تنظیم کے اعلان لاتعلقی کے بعد تنظیم کی دشمنی پر اتر آیا اور بڑے کہلانے والے حضرات کی سرپرستی میں تنظیم کے خلاف کیچڑ اچھالنے لگا، حالانکہ یہ شخص ان لوگوں کے ساتھ مخلص نہیں جن کے ثبوت محفوظ ہیں۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ بہتر ہوگا کہ آپ حضرات اپنے اشکالات بالمشافہ گفتگو کے ذریعے دور کرنے کی معقول راہ اپنائیں تاکہ دہریہ اور ملحد حلقوں کے سامنے وابستگان دین کی جگ ہنسائی نہ ہو۔ لہٰذا آپ یا آپ کے معتبر نمائندے کوئی وقت مقرر کر کے مرکزی دفتر لاہور یا جیسے باہم اتفاق سے طے ہو، تشریف لائیں تاکہ حقیقت حال واضح ہو سکے۔ اگر آپ اس پر تیار نہ ہوں تو از راہ دیانت اس خط کو اپنے رسالہ الفاروق میں شائع کر دیں تاکہ تصویر کا حقیقی رخ بھی قارئین کے سامنے آ سکے اور وہ خود کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

فقط والسلام

عبد المتین نعمانی

(09-10-2000)

افسوسناک امر یہ ہے کہ تا حال ان دونوں خطوں کا جواب نہیں دیا گیا جس سے حقیقی صورت حال کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

مولانا صاحبزادہ محمود شاہ کا مولانا سلیم اللہ خان کے نام مکتوب

خانقاہ یاسین زائی پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے مسند نشین اور فاضل دار العلوم دیوبند حضرت مولانا صاحبزادہ محمود

شاہ صاحب نے بھی ماہنامہ الفاروق میں شائع الزامات پر مولانا سلیم اللہ خان کو درج ذیل مکتوب تحریر کیا۔ (اصل مکتوب فارسی میں ہے)۔

محترم المقام برادرم مولانا سلیم اللہ خان صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ خیریت طرفین مطلوب

گزشتہ رات تنظیم فکر ولی اللّٰہی (پاکستان) کے بارے میں آپ کا فتویٰ دیکھ کر حیران ہو گیا، اس لیے کہ تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے بانی مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری صاحب کے میری خانقاہ (خانقاہ یاسین زئی پنیالہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان) کے ساتھ اچھے مراسم ہیں اور کبھی کبھی تشریف بھی لاتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ بات کس حد تک صحیح ہے۔ انہوں نے سختی سے انکار کیا اور کہا کہ میں بھی یہ عقائد، کفر کے عقائد سمجھتا ہوں۔ اور جو کوئی بھی میرے ساتھ اس بارے میں بات کرنا چاہے، تمہاری اس خانقاہ میں تمہاری موجودگی میں دلائل سے میرے ساتھ بات کر کے ثابت کرے۔ میں از سر نو اسلام کا کلمہ پڑھ لوں گا۔ میں نے یہی بیان شیخ معز الحق صاحب (شیخ الحدیث دار العلوم عربیہ ٹل ضلع ہنگو) کو لکھا۔ انہوں نے کفر کا فتویٰ لگایا ہے، لیکن انہوں نے مناظرہ اور بات کرنے سے انکار کیا۔ مولوی امان اللہ صاحب (شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ کاہی ضلع ہنگو) کو لکھا، انہوں نے بھی بات کرنے سے انکار کیا۔ مولوی شیر علی شاہ صاحب (شیخ الحدیث دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ) سے کہا، انہوں نے بھی انکار کیا۔ اس بات پر میں حیران ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ یہ لوگ کفر کا حکم لگانے میں تو اس قدر سختی کرتے ہیں لیکن کفر کو ثابت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

جناب! آپ سے بھی عرض کر رہا ہوں کہ کسی پر صرف دعویٰ کرنے سے ثبوتِ دعویٰ نہیں ہو جاتا جب تک دعویٰ کے لیے دلیل نہ لائی جائے اور دعویٰ بھی کفر کا دعویٰ ہے۔ اس کے لیے دلیل تو ضروری ہے۔ آخر وہ اقوال جن کی وجہ سے آپ نے ان پر کفر کا حکم لگایا ہے، مدلّل انداز میں پیش کیجیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں گا اور میں بھی اس کو بری نظر سے دیکھوں گا، لیکن صرف یہ بات کہ فلاں نے یوں کہا، فلاں نے یوں کہا، اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارے اسلاف رحمہ اللہ مسلمان پر کفر کا حکم لگانے میں بہت زیادہ محتاط تھے۔ خود حضرت مدنیؒ (شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) سے سنا ہے کہ ہمارے اسلاف نے مولانا احمد رضا خان کے گروہ پر کفر کا حکم نہیں لگایا۔ تم لوگوں نے جب کفر کے حکم کا پروپیگنڈہ ہر طرف پھیلا دیا، اب میدان میں آیئے اور اس کو روزِ روشن کی طرح ثابت کیجیے۔ آپ کراچی سے تشریف لائیں اور میں مولانا سعید احمد رائے پوری صاحب کو لے آؤں گا اور میری خانقاہ میں ان کے ساتھ اس بارے میں مدلّل گفتگو کریں۔ اس نیت کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ شاید ان کو ہدایت نصیب فرمائیں اگر وہ گمراہ ہیں یا مجھے غلط فہمی سے نکالیں اگر میں غلط فہمی میں پڑا ہوا ہوں۔ مناظرہ کی نیت سے بات نہ ہو، کیونکہ مناظرہ اللہ تعالیٰ کا قہر ہے جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے۔ آخر میں ایک دفعہ پھر عرض کرتا ہوں کہ ان اشتہارات اور اخبارات و رسائل کے ان فتوؤں سے اسلام کو بدنام کر کے عام مسلمانوں کو حیرانی و پریشانی میں ڈالنا، علماء حق کا یہ کام نہیں ہے۔

والسلام

محمود عفا عنہ خانقاہ یاسین زئی پنیالہ

ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

۱۹ر رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

جوابی لفافہ بھیج رہا ہوں۔ اخلاقاً جواب کا حق رکھتا ہوں۔

مولانا سلیم اللہ خان کا جواب

''۲۰ر رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

از سلیم اللہ خان جامعہ فاروقیہ کراچی

باسمہ تعالیٰ

مکرمی! زید مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش یہ ہے کہ دلوں کا حال اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ انسان جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ آج کل تفرد کا مرض عام ہو گیا ہے۔ علماء حقانی کے نظریات سے تفرد اختیار کرنے والا کوئی شخص بھی حق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر وہ امر جو ہر ذی علم اور ہر اہل صلاح کے نزدیک معروف ہو چکا ہو، اس کو بیان بدل کر یا تقیہ کے ذریعے چھپانا دانشمندی نہیں۔ نہ دعوتِ مبارزہ سے یہ مسائل حل ہوتے ہیں اور نہ کبھی ہوئے ہیں۔ بالخصوص اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے لوگ اس کو مفید نہیں سمجھتے۔ باقی آپ کیا سمجھتے ہیں، وہ مجھ پر حجت نہیں اور میں کیا سمجھتا ہوں، وہ آپ پر حجت نہیں۔ ہر ایک کو اللہ پاک سے اپنا معاملہ درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔''

گویا موصوف اپنے دعویٰ کو اور تفرد کے الزام کو کسی دلیل سے سمجھانے سے معذور ہیں۔ پھر یہ بھی خوب رہی کہ اللہ سے ڈرنے کا دعویٰ کرنے والے دعوتِ مبارزہ کو تو مفید نہیں سمجھتے مگر کفریہ الزامات لگانے کو مفید خیال کرتے ہیں۔ صد افسوس! واضح رہے کہ موصوف نے جواب حضرت صاحبزادہ صاحب کے مکتوب کے حاشیہ میں ہی لکھ کر ارسال کر دیا، حالانکہ موصوف مکتوب الیہ کے مقام سے اچھی طرح آشنا ہیں۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

اسلامی بینکاری سے متعلق ''متفقہ'' فتویٰ کیسے وجود میں آیا؟

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد

اس فتوے کا پس منظر یہ ہے کہ مورخہ ۹ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ کو میرے پاس حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کا فون آیا کہ میں اور میرے کچھ رفقاء آپ سے ملنے کے لیے آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کو زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ بالآخر حضرت مولانا نے اس کو منظور فرمالیا اور منگل کے دن بعد عصر کا وقت طے ہوا۔ اس پر میں نے حضرت سے پوچھا کہ ''حضرت! ملاقات کا موضوع کیا ہے؟'' حضرت نے جواب دیا کہ ''بینکاری کے سلسلے میں کچھ مشورہ ہے۔'' چونکہ میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ بینکاری کے مسائل سے متعلق اس سے پہلے حضرت نے کچھ اجتماعات منعقد کیے ہیں، اس لیے بندہ نے عرض کیا کہ ''پھر اس کام کے لیے کوئی باقاعدہ اجتماع رکھ لیا جائے۔'' حضرت نے فرمایا کہ ''نہیں، آپ ہی سے مشورہ کرنا ہے۔'' ٹیلی فون کی بات یہاں ختم ہوگئی اور میں مقررہ وقت پر حضرت کے پاس جامعہ فاروقیہ حاضر ہوا۔ اس وقت میرے ساتھ مولانا عصمت اللہ صاحب اور مولانا محمد یحییٰ عاصم صاحب بھی تھے۔ وہاں حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کے علاوہ متعدد علماء کرام بھی تشریف فرما تھے جن میں مفتی عبدالمجید دین پوری اور مولانا سعید احمد جلال پوری صاحب، مولانا زرولی خان صاحب، مولانا خالد صاحب اور مولانا نجم الحسن صاحب کے نام مجھے اس وقت یاد ہیں۔

حضرت مدظلہم نے رسمی گفتگو کے بعد فرمایا کہ میں نے آپ کے نام اسلامی بینکاری کے سلسلے میں ایک تحریر لکھی ہے جو میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں اور اس کی کاپی بھی آپ کو دے دی جائے گی۔ اس پر کوئی مذاکرہ مقصود نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت نے مندرجہ ذیل تحریر سب کے سامنے پڑھ کر سنائی۔

''............ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس اضطراب وتشویش کو دور کرنے کے لیے علماء اور...... سے وسیع مشاورت کے بعد ایک فتویٰ اسلامی بینک کاری کے عدم جواز کا شائع کیا جائے اور اس کی پورے ملک میں تشہیر کا اہتمام کیا جائے۔ ہم ہرگز تصادم کے خواہاں نہیں۔ ہم تو دل وجان سے آپ کے خیر خواہ ہیں اور آپ کا احترام کرتے ہیں۔ امت کو ربا کی لعنت سے بچانے کے لیے اپنا شرعی فرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس

میں ذرا بھی تردد نہیں کہ کہ اس فرض کی ادائیگی ہم پر لازم اور ضروری ہے اور اب تک جو کوتاہی ہم سے ہوئی، اس پر استغفار کرتے ہیں۔ آپ کے لیے بھی دنیا و آخرت کی فلاح کا واضح تقاضا ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں اور غلط کار اور مفادات کے اسیر مشورہ دینے والوں سے اپنے آپ کو بچائیں۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (ق ۳۷)

سلیم اللہ خان

۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ

۱۷ جون ۲۰۰۸ء

یہ تحریر سنانے کے بعد حضرت نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ سب حضرات نے دعا کی۔ دعا کے بعد میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! کیا مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟'' اس پر حضرت یہ کہہ کر اٹھنے لگے کہ ''مجھے ایئرپورٹ جانا ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! آپ نے مشورے کے لیے بلایا تھا، اس لیے بہت اختصار کے ساتھ مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجیے۔'' اس پر حضرت چند لمحوں کے لیے بیٹھ گئے اور میں نے کچھ عرض کرنا شروع کیا، لیکن ابھی چند جملے ہی بول پایا تھا کہ حضرت دوبارہ اٹھ گئے اور فرمایا کہ ''مجھے تو ایئرپورٹ جانا ہے۔''............

جس انداز سے وہ تحریر بندہ کو سنائی گئی اور میری بات سننے سے انکار کیا گیا، اس پر بندہ کو حیرت بھی تھی اور افسوس بھی، چنانچہ میں نے حضرت کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بگرامی خدمت مخدومی ومکرمی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہفتہ ۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ کو آنجناب نے بندہ کو ٹیلی فون پر یاد فرمایا اور بندہ کے استفسار پر آنجناب نے بتایا کہ بینکاری کے سلسلے میں کچھ مشورہ کرنا ہے جس میں کچھ ساتھی اور بھی ہوں گے اور اس کے لیے اتوار اور پیر کے بعد کوئی دن مقرر کر لیا جائے۔ چنانچہ بندہ نے منگل ۲۱ جمادی الثانیہ کو عصر کے وقت آنجناب کی خدمت میں حاضری طے کر لی اور اس کے مطابق بندہ جامعہ فاروقیہ حاضر ہوا جہاں شہر کے کچھ دوسرے علماء بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ خیال تھا کہ بینکاری سے متعلق شرعی مسائل کے بارے میں کوئی مشورہ ہوگا، لیکن آنجناب نے فرمایا کہ کوئی مذاکرہ مقصود نہیں ہے بلکہ ایک تحریر پڑھ کر سنائی جو بندہ کے نام تھی اور اس کا ایک نسخہ بندہ کو بھی عطا فرمایا اور اس کے فوراً بعد دعا کرا کر فرمایا کہ مجھے ہوائی اڈے جانا ہے۔ چونکہ یہ تحریر بندہ کے نام تھی اور اس میں غیر سودی بنکاری کی کسی معین غلطی کی نشان دہی کے بغیر یہ فرمایا گیا تھا کہ ''اسلامی بینکاری کا نظام جاری کرنے میں آپ سے غلطی ہوئی ہے'' اور آخر میں سورۂ جاثیہ کی ایک آیت کریمہ کے حوالے سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا تھا کہ مجھ سے یہ غلطی خواہش پرستی کی وجہ سے ہوئی ہے، اس لیے یہ تحریر سننے کے بعد بندہ نے

آنجناب سے کچھ عرض کرنے کی درخواست کی جس پر آنجناب نے کچھ عرض کرنے کی اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ مجھے ایئرپورٹ جانا ہے۔ بندہ نے اختصار ہی کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی درخواست کی اور کچھ جملے بولنے شروع کیے تو اس پر بھی آنجناب نے اجازت نہیں دی اور اٹھ کر تشریف لے گئے۔

بندہ آنجناب کا شاگرد اور نیازمند ہے اور نہ جانے کتنے مسائل میں آنجناب سے استفادے اور مشورے کا رابطہ ہمیشہ رہتا ہے، لیکن بینکاری کے حوالے سے آنجناب نے اس سے قبل کبھی نہ کسی اضطراب کا اظہار فرمایا، نہ اس موضوع پر کبھی کوئی بات کی، نہ بندہ کا موقف معلوم فرمایا۔ بینکاری کے حوالے سے آنجناب سے کسی قسم کی کوئی بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا جسے آنجناب نے ہی مشورے کا عنوان دیا تھا، لیکن بندہ کی کوئی بات سنے بغیر یہ یکطرفہ تحریر سنا کر بندہ کو کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہ دینا ایسا معاملہ ہے جس کی کوئی توجیہ بندے کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر اس وقت سفر پر تشریف لے جانا طے تھا تو اس ملاقات کے لیے اس وقت کے بجائے کوئی اور وقت بآسانی رکھا جا سکتا تھا۔ بندہ خطاؤں کا پتلا ہے اور اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی پر ہی گزارہ ہو رہا ہے۔ نہ جانے کتنی غلطیاں بندے سے سرزد ہوتی ہیں۔ آنجناب تو بندے کے استاذ ہیں۔ جو لوگ ضابطے میں بندے سے چھوٹے سمجھے جاتے ہیں، ان کی طرف سے بھی اگر کسی غلطی کی نشان دہی ہوتی ہے، بندہ تو اس پر بھی ممنون ہو کر غور کرتا ہے اور غلطی واضح ہونے پر اس کا اعلان واعتراف شائع بھی کرتا رہا ہے۔ لہٰذا غیر سودی بینکاری کے سلسلے میں بندے سے جو غلطی ہوئی ہے، کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کی متعین نشان دہی کے بعد بندے کا موقف بھی ٹھنڈے دل کے ساتھ سن لیا جاتا؟............

آنجناب نے مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے چاہیے تھا کہ جن حضرات کو اس معاملے میں تشویش تھی، ان کو مطمئن کرتا۔ بندے کی گزارش یہ ہے کہ اپنی دانست اور بساط کے مطابق بندہ تحریر وتقریر اور انفرادی سوالات کے جوابات میں صورت حال کی وضاحت کرتا رہا ہے۔ کم از کم تین کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں اور تین مرتبہ علماء کرام کے سامنے یہ مسائل پیش کرنے کے لیے دارالعلوم میں مفصل کورس منعقد کیے ہیں جن میں دار العلوم سے باہر کے علماء کرام کو بھی دعوت دی گئی اور کراچی وبیرون کراچی سے متعدد معروف مدارس کے اساتذہ اور علماء حضرات نے شرکت بھی فرمائی۔ نیز مختلف دورانیوں کے مسلسل کورسوں کا سلسلہ تا حال جاری ہے جس میں معروف مدارس کے علماء بھی شریک ہوتے ہیں۔ جن حضرات کو تشویش تھی، وہ اگر اپنی تشویش سے بندے کو مطلع فرماتے اور اس پر فقہی انداز میں گفتگو ہو جاتی تو اگر میری غلطی ثابت ہوتی تو میں اس سے رجوع کر لیتا اور اگر ان کو غلط فہمی ہوتی تو وہ دور ہو جاتی۔............

آنجناب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس اضطراب اور تشویش کو دور کرنے کے لیے علماء اور...... سے وسیع مشاورت کے بعد ایک فتویٰ اسلامی بینکاری کے عدم جواز کا شائع کیا جائے اور اس کی پورے ملک میں تشہیر کا اہتمام کیا جائے۔'' ...... جب آنجناب نے یہ فیصلہ فرما لیا ہے کہ فتویٰ عدم جواز ہی کا

ہوگا تو پھر ''مشاورت'' کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔............''

یہ خط دے کر میں نے مولانا عصمت اللہ صاحب اور مولانا محمد یحییٰ عاصم صاحبان کو بھیجا تا کہ وہ دوستی طور پر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کو پہنچا دیں۔ یہ حضرات گئے تو حضرت مولانا آرام فرما رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے حضرت کے صاحبزادہ جناب مولانا عادل خان صاحب کو خط پہنچا دیا۔

اسی شام عصر کی اذان کے وقت مجھے اطلاع ملی کہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب بذات خود دارالعلوم تشریف لے آئے ہیں اور مسجد میں ہیں۔ میں مسجد پہنچا تو نماز کے بعد حضرت نے فرمایا کہ آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے، چنانچہ ہم برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ کے مکان پر چلے گئے۔ وہاں اس وقت حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ، ان کے صاحبزادے جناب مولانا خالد صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، میں اور میرے بیٹے مولوی حسان اشرف سلمہ موجود تھے۔ بعد میں مولانا زبیر اشرف صاحب اور مولانا عمران اشرف صاحب آ کر گفتگو میں شامل ہو گئے تھے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد حضرت نے فرمایا کہ ''اچھا یہ بتاؤ کہ اسلامی بینکاری ممکن بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے عرض کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو اتو یقیناً یہ ممکن ہے کہ ربا کے بغیر بیع اور تجارت کی جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ جب سارے بینکوں پر اسٹیٹ بینک کی حکمرانی ہے اور وہ اسٹیٹ بینک کے پابند ہیں جو سود کی بنیاد پر چل رہا ہے تو پھر کوئی بینک غیر سودی کیسے ہوسکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! پاکستان میں غیر سودی بینکوں کے لیے اسٹیٹ بینک میں الگ شعبہ قائم ہے، غیر سودی بینکوں کے لیے الگ قواعد وضوابط ہیں، اس لیے اسٹیٹ بینک کے تحت کوئی غیر سودی بینک سودی معاملہ کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ حضرت نے یہ سن کر حیرت کا اظہار فرمایا کہ پہلے ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ پھر اب تک پاکستان یا بیرون پاکستان اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئی ہیں، ہم نے مختصراً ان کا تذکرہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ الحمدللہ، یہ نشست بہت مفید ہوئی اور بعض باتیں ایسی علم میں آئیں جن کا ہمیں پہلے علم نہیں تھا اور جنھیں معلوم کر کے فی الجملہ تسلی ہوئی، البتہ اہل علم کو فقہی اعتبار سے جو اشکالات ہیں، ان کا معاملہ ابھی باقی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ''بیشک جو اشکالات ہیں، وہ سامنے آ جائیں۔ اگر ہماری کوئی غلطی ثابت ہوگی تو ان شاء اللہ اس سے رجوع کر لیں گے اور اگر دوسری جانب کوئی غلط فہمی ہوگی تو وہ دور ہو جائے گی۔ اس کے لیے کوئی اہل فتویٰ کا اجتماع کر لینا مناسب ہوگا۔'' حضرت نے فرمایا کہ ''اس وقت بعض حضرات سفر پر ہیں۔ ان شاء اللہ ان کے آنے پر بعد میں آپ سے رابطہ کروں گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ کی تحریر سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ آپ یا کچھ دوسرے حضرات یک طرفہ طور پر ایک ذہن بنا چکے ہیں، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ وہ اجتماع افہام وتفہیم کے بجائے بحث ومناظرہ میں تبدیل ہو جائے۔'' حضرت نے فرمایا کہ ''اصل معاملہ تو ہمارے آپ کے درمیان تھا۔ جب وہ بات نہ رہی تو اب اس کا اندیشہ نہ کیا جائے اور اس اجتماع کے لیے آپ جہاں کہیں گے، وہاں اجتماع رکھ لیا جائے گا اور آپ خود ہی اس کے لیے ضابطہ اخلاق مرتب کر لیں۔'' حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ ''اس میں اہل فتویٰ علماء کو

جمع کرنا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ شرکاء کا تعین بھی مشورے سے ہو جائے۔'' حضرت نے ان تمام باتوں کو منظور فرمایا اور اس طرح یہ مجلس خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت نے جامعہ فاروقیہ میں ختم بخاری کے موقع پر اس مسئلے کو دوبارہ اپنی تقریر کا موضوع بنایا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ذکر فرمایا کہ اس کے لیے ایک اجتماع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد اطلاع ملی کہ وفاق کے ممتحنین کا جو اجتماع دارالعلوم کراچی میں ہونے والا ہے، اس وقت حضرت بھی یہیں تشریف فرما ہوں گے اور اجتماع کے سلسلے میں اسی موقع پر ہم سے بات کریں گے۔ وفاق کے ممتحنین کا اجتماع دارالعلوم میں ہوا اور حضرت نے روزانہ یہاں پورے پورے دن قیام فرمایا، لیکن از خود کوئی بات اس سلسلے میں نہیں کی۔

تین چار روز اس طرح گزر جانے پر میں نے چہارشنبہ ۱۷ شعبان ۱۴۲۹ھ کو حضرت سے وقت لے کر حضرت کے پاس گیا اور پوچھا کہ آپ نے جس اجتماع کا ذکر فرمایا تھا، اس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے، وہ کب اور کس طرح بلانے کا ارادہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ ''کل ہی ہماری میٹنگ ہوئی ہے جو صبح دس بجے سے شام تین بجے تک جاری رہی۔'' میں نے پوچھا کہ اس میٹنگ میں کون حضرات تھے؟ اس پر انھوں نے کراچی کے مختلف علماء کے نام لیے اور بتایا کہ بنوری ٹاؤن کے ایک مفتی صاحب نے ایک مفصل تحریر لکھی ہے جس کی کل خواندگی کی گئی ہے، البتہ ابھی وہ نامکمل ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ ''سودی بینکاری کا متبادل کوئی نظام تو ہونا چاہیے، مگر وہ ایسا ہو جو اشکالات سے خالی ہو۔'' میں نے عرض کیا کہ اسی کے پیش نظر تو یہ طے ہوا تھا کہ اشکالات مرتب کر کے اس پر غور کر لیا جائے، لہٰذا کیا یہ تحریر مرتب ہونے کے بعد ہمارے سامنے لائی جائے گی؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ابھی اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔............ جب میں نے یہ عرض کیا کہ جو تحریر مرتب ہو رہی ہے، وہ ہمارے سامنے بھی آ جائے تو وہ گفتگو کی بنیاد بن سکے گی تو حضرت نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں تو مفتی نہیں ہوں اور نہ مجھے ان معاملات کا زیادہ علم و تجربہ ہے، البتہ مختلف مفتی حضرات کو اشکالات ہیں اور انھیں یہ خطرہ ہے کہ اگر یہ تحریر آپ کے سامنے لائی جائے گی تو آپ یہ کہہ دیں گے کہ ''یہ بھی ایک رائے ہے اور ہم اس پر غور کریں گے۔'' میں نے عرض کیا کہ تحریر سامنے آنے کے بعد دونوں ہی احتمال ہیں۔ یہ بھی کہ اس کے مندرجات سے اتفاق ہو جائے اور یہ بھی کہ اتفاق نہ ہو اور اجتماع کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ باہمی گفت و شنید سے افہام و تفہیم ہو سکے اور یہ احتمال جانبین کے سامنے رہنا چاہیے۔ حضرت نے اس پر سکوت فرمایا۔ پھر میں نے پوچھا کہ ''کیا اس سلسلے میں میرے کرنے کا کچھ کام ہے؟'' حضرت نے فرمایا کہ ''نہیں''۔ اس کے بعد بندہ واپس آ گیا۔

حضرت کی اس گفتگو سے میں نے تاثر یہی لیا کہ وہ سلسلے کے کسی مشورے میں ہمیں شریک کرنے کے بجائے یک طرفہ طور پر ہی کوئی اجتماع منعقد کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ۲۵ شعبان ۱۴۲۹ھ کو جامعہ فاروقیہ میں ایک اجتماع بلایا گیا جس میں بیرون کراچی سے بھی علماء شریک تھے۔ اس کی اطلاع ہمیں نہیں دی گئی اور ۲۶ شعبان ۱۴۲۹ھ کو اخبارات میں یہ فتویٰ شائع ہو گیا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا صوفی محمد سرور اور حضرت مولانا سلیم اللہ خان کے مابین مراسلت

(۱)

باسمہ تعالیٰ

محترم جناب مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امابعد! مزاج گرامی؟

دو مسئلوں میں آپ حضرات کی تحقیق بندہ نے بغور پڑھی (اسلامی بنکنگ اور تصویر والا مسئلہ)۔ کافی عرصہ سے مختلف تحریرات کے ذریعے چند باتیں سننے میں آئیں۔

میں اس وقت کسی کی طرف داری یا ثالثی نہیں کر رہا، بلکہ آپ جیسی عظیم شخصیت کی طرف سے [جو] اختلاف رائے کو اعتدال سے تجاوز کر کے پیش کیا گیا اور فریقین کی مکمل گفتگو سنے بغیر اس قدر تشدد کے ساتھ تذلیل والا رویہ اختیار کیا گیا، اس کا ذکر کر رہا ہوں، جبکہ اظہار حق کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آپ کے اور آپ کے رفقاء کرام کے خیال میں جو حق تھا، وہ ظاہر کر دیا جاتا۔ پھر سائل کو حق ہوتا کہ وہ آپ کی بات سے اتفاق کرے یا دوسرے فریق کی رائے اختیار کرے۔ کسی مسئلے پر تشدد کا حق کسی کو نہیں ہے۔، جبکہ فریق ثانی کے علماء بھی گمراہ نہیں ہیں، بلکہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی رحمہ اللہ جیسے بزرگوں کے معتمد ہیں۔

مجھے بحیثیت آپ کے استاد ہونے کے جناب کے اس سخت رویے سے بہت افسوس ہوا کہ اس واقعے سے علماء اور عوام کے اندر جو تاثر قائم ہوا، اس کے نتائج بہت سنگین ہیں۔ آپ نے یہ انداز اختیار کر کے راہ تذلیل کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی، کیونکہ ہمارے اکابرین کے مابین بھی اختلاف رہا، مگر اس انداز کا رویہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جبکہ ہمارے اسلاف کا طرز مبارک یہی تھا کہ جب تک کسی بھی معاملے میں فریقین کے مکمل دلائل کا بغور جائزہ نہ لیتے، اس وقت تک کوئی رائے قائم نہ کرتے۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ اس قسم کے معاملات میں بہت احتیاط سے کام لیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ جو کہ یقیناً آپ کے مرتبے اور شرف کے عین مطابق ہے اور بندہ کا یہ خیر خواہانہ مشورہ ہے۔

بندہ آپ کے حق میں دعا گو و دعا جو ہے۔

محمد سرور عفی عنہ

مدرس جامعہ اشرفیہ بتدریس بخاری

۲۰۰۹/۱/۳۰ / ۱۴۳۰/۲/۳ھ

(۲)

حضرت اقدس مولانا صوفی محمد سرور مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی؟

آج ہر طرف سے فتنوں کا سیلاب امڈ رہا ہے۔ منصوصات سے انکار، تحریف اور غلط تاویلات کی گرم بازاری ہے۔ عوام تو عوام ہیں، خواص کا حال بھی مختلف نہیں ہے۔ ہر ذی شعور اپنے اپنے حلقے میں یہ مناظر دیکھ کر دل گرفتہ اور شکستہ خاطر ہو کر نڈھال ہو رہا ہے۔

وراثت نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کا تقاضا ہے کہ ان فتنوں کا تعاقب کیا جائے، لیکن ہم نے مفادات کو مقدم کیا ہوا ہے اور شخصی مصلحتوں کی حفاظت کی فکر میں لگے ہیں یا پھر احساس وادراک نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مدرسہ اور مسجد اور گھر میں سبق پڑھا دینا، امامت وخطابت کر لینا، اللہ اللہ کے ذکر سے رطب اللسان ہونا ہمارے نزدیک اتباع سنت کے لیے کافی قرار پایا ہے۔

ہمارے اکابر کی تاریخ بھی فتنوں کے تعاقب کے حوالے سے معلوم ومعروف ہے اور بلاشبہ وراثت نبوت (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کا حق فتنوں کے تعاقب کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ہم نے فتنوں کو اسی رفتار سے بڑھنے دیا تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ پھر ہمارا انجام کیا ہوگا۔

جناب والا نے تصویر اور مروجہ اسلامی بینکاری کی تردید کرنے والوں کو فریق اول اور حمایت کرنے والوں کو فریق ثانی قرر دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''فریقین کی مکمل گفتگو سنے بغیر اس قدر تشدد کے ساتھ تذلیل والا رویہ اختیار کیا گیا۔''

حضرت والا! فریقین کی گفتگو ان مسائل پر ایک مرتبہ نہیں، مختلف اوقات میں کراچی کے مفتیان کرام کی سطح پر طویل مدت سے ہوتی رہی ہے اور فریق ثانی کی کتابیں اور کتابچے مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ پھر فریق اول کا مسئلہ بیان کرنا اور فریق ثانی کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دلائل سے اس کو مزین کرنا تشدد کیونکر قرار دیا جا رہا ہے؟ کتاب ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمائیں۔ احترام کا لحاظ کیا گیا ہے یا نہیں؟

فریق ثانی یقیناً بہت سی صفات حسنہ سے متصف ہے، لیکن معصوم تو نہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے معتقد ہیں، لیکن تصویر کے مسئلے میں ان سے اختلاف کر رہے ہیں۔ مفتی محمد تقی عثمانی کے بیٹے کی شادی میں وڈیو فلم بنائی گئی۔ جب اعتراض ہوا تو فرمایا: جائز ہے۔ کیا جن دو بزرگوں کے اعتماد کا حوالہ دیا گیا ہے، ان کی حیات میں یہ فلم بنائی جاتی؟ اور اگر بنائی جاتی تو ان بزرگوں کا ردعمل کیا ہوتا؟ جناب کا کیا خیال ہے؟ اور ذرا اس پر بھی غور فرمائیں کہ اس طرح کی فلم بنانے کے وقت کا ماحول کیا ہوتا ہے؟ حجاب کے احکام کی کتنی رعایت کی جاتی ہے؟

حضرت والا کو خادم کے رویے پر تو بہت افسوس ہے اور ان خلاف شرع حرکتوں پر بھی افسوس ہے یا نہیں؟ اس کا ذکر نہیں فرمایا۔

اکابر اور اسلاف کا طرز مبارک ہی تو اختیار کیا گیا ہے۔ فریقین کے مکمل دلائل سامنے آنے کے بعد ہی رائے قائم کی گئی ہے۔ حضور بھی علم ودانش کے بڑے مینار ہیں۔ فریق ثانی نے آج تک سوائے الزام تراشی، یاوہ گوئی اور کذب وافترا کے کسی فقہی اشکال کا جواب نہیں دیا۔ اگر حضرت مہربانی فرما کر جواب باصواب مرحمت فرمائیں تو بڑا ہی احسان ہوگا۔

حضرت اقدس! جدیدیت کا فتنہ ہم پر مسلط ہے۔ یہ سارا فساد اسی وجہ سے ہے۔ ہم نے اکابر واسلاف سے بے نیاز ہو کر نیا دین ایجاد کرنا اپنا وطیرہ بنایا ہوا ہے۔

احقر حضرت والا کے التفات خاص پر بے حد مشکور ہے۔ جزاکم اللہ کل خیر۔ آمین

محتاط تو تھا ہی، اور احتیاط کروں گا۔

خادم نے اپنے خیالات کا اظہار بہت محتاط انداز میں کیا ہے، ورنہ لکھنے کو تو بہت سی باتیں ہیں۔ ان کو لکھا جائے تو حضرت بھی غم زدہ ہی ہوں گے۔

والسلام

سلیم اللہ خان

۷ رصفر ۱۴۳۰ھ / ۳ فروری ۲۰۰۹ء

(۳)

۱۴۳۰/۲/۲۰ھ / ۱۶/۲/۲۰۰۹

باسمہ تعالیٰ

برادرم حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

۱۔ میرا مقصد کسی کو فریق اول یا ثانی سمجھنا نہیں تھا اور نہ ہی کسی فریق کی طرف داری مقصود تھی اور نہ ہی اب ہے۔

۲۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے جو بیٹے کی شادی پر مووی بنانے کی اجازت دی، وہ ان کا ذاتی فعل ہے جو غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مرسل روایت کا مفہوم ہے کہ جب کسی عالم سے غلطی ہو جائے تو تین کام کرنے چاہییں:

o اس کی غلطی کا چرچا نہ کیا جائے۔

o اس کی اس غلطی میں اتباع نہ کی جائے۔

o اس کو اس غلطی سے بچانے کے لیے خوب دعائیں کی جائیں۔

۳۔ جو حضرات اسلامی بینکاری کا مسئلہ مجھ سے پوچھتے ہیں، میں یہی بتاتا ہوں کہ جن کو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب پر اعتماد ہے، وہ جو حساب کتاب کرنا چاہیں، ان کے اعتماد پر کریں۔ میں خود نہ اسلامی بینکاری میں حصہ لیتا ہوں نہ اس کا کسی کو خود مشورہ دیتا ہوں، البتہ چونکہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس لیے میں کسی کو یہ نہیں کہتا کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی سرپرستی والے بینکوں سے بچو، وہ نام نہاد اسلامی بینکاری ہے۔

۴۔ مدارس میں بھیجی گئی تحریر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض علماء کرام کا جیسا خیال ہے کہ دوسرے بینکوں میں حرام کو حرام سمجھا جاتا ہے اور ان اسلامی بینکوں میں حرام کو حلال سمجھا جانے لگا ہے۔ جناب اس بات کا اندازہ فرمائیں کہ اگلا قدم ایک دوسرے کی تکفیر کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

۵۔ بندے کا جناب کو برادرانہ مشورہ پہلے بھی تھا۔ اب بھی ایک تو احتیاط کا ہے اور دوسرا اگر مناسب خیال فرمائیں تو ان دو مسئلوں میں اپنی رائے کا اظہار فرما کر فریقین سے غیر جانب دار ہو جائیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔ بندہ کی رائے بھی ان دونوں مسئلوں میں احتیاط والی جانب ہی ہے، مگر اس بات کا اظہار ۳۱ علماء کے دستخط کے ساتھ نہ کرنا چاہوں گا کیونکہ ۳۱ علماء کے دستخطوں پر ''چاروں صوبوں کا متفقہ فتویٰ'' کا عنوان نہیں سجتا۔

بڑی شخصیتوں کو بڑے پلیٹ فارم پر بڑا حوصلہ ونرم رویہ رکھنا پڑتا ہے جو جناب کے شایان شان معلوم ہوتا ہے۔

نیز ایک دعا خود بھی کروں گا ان شاء اللہ اور جناب سے بھی کہوں گا کہ یہ دعا فرماتے رہیں کہ خدا کرے، علماء اور وفاق کو توڑنے کی کبھی سازش نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حامی وناصر ہوں۔ آمین

بندہ دعا گو ودعا جو ہے۔

محمد سرور عفی عنہ

مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور

وہ ولولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

[اہل تشیع کی تکفیر کے باوجود اتحاد تنظیمات مدارس میں شمولیت کے حوالے سے مولانا علی شیر حیدری اور مولانا سلیم اللہ خان کے مابین مراسلت]

وفاق المدارس کے اراکین شوریٰ کے نام مولانا علی شیر حیدریؒ کا خط

قابل صد احترام علماء کرام و اراکین شوریٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بعد از تسلیم مسنون گذارش یہ ہے کہ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے اور آپ جیسے اہل علم و بصیرت سے مخفی بھی نہیں کہ پاکستانی شیعہ عموماً اثنا عشری ہی ہیں اور خصوصاً تحریک جعفریہ، جامعۃ المنتظر لاہور کا تعلق شیعہ کے فرقہ اثنا عشریہ سے ہے اور چودہ صدیوں کے محقق علماء کرام نے بالعموم اور علما دیوبند نے بالخصوص شیعہ کے فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کو خارج از اسلام قرار دیا ہے اور ان کی تکفیر فرمائی ہے۔ پہلے یہ فیصلہ ۱۳۴۸ھ میں امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ نے شائع فرمایا جس پر اس وقت دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مدنیؒ سمیت تمام مفتیان و مدرسین دارالعلوم دیوبند کے دستخط موجود ہیں اور پھر ایرانی انقلاب کے بعد ۱۴۰۷ھ میں اسی فیصلہ کی دوبارہ مدلل تجدید حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے استفتاء کے جواب میں فرمائی گئی جس کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ''الفرقان'' کے خصوصی نمبر میں لکھنو سے اور حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ نے ''بینات'' کے خصوصی نمبر میں جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے ''خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ'' کے نام سے شائع فرمایا جس کے بعد اب شیعہ کے کفر میں کسی قسم کا ابہام باقی نہیں رہا۔

دنیا کے متعدد ممالک کے محقق علماء نے اس فتوے پر دستخط کر کے شیعہ کے کفر کے بارے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے استفتاء کے جواب میں علماء ہند میں سے جس شخصیت نے شیعہ کی تکفیر کا مدلل فتویٰ تحریر فرمایا ہے، وہ محدث جلیل علامۃ العصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ ہیں جنہوں نے اپنے فتوے کی ابتدا میں اور پھر شیعوں کے دلائل کفر لکھنے کے بعد دوبارہ فرمایا ''اثنا عشری شیعہ بلا شک و شبہ کافر، مرتد ہیں''۔ صدر جمعیت علماء ہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کا مذکورہ فتویٰ پڑھنے کے بعد تحریر فرماتے

ہیں''استفتاء اور جواب بحمد اللہ حرف بحرف پڑھا، احقر حرف بحرف متفق ہے، احقر اہل فتویٰ میں سے نہیں مگر اس جہاد میں شرکت کو سعادت سمجھ کر دستخط کر دیے ہیں۔''

دارالعلوم دیوبند جو ہم سب کی بنیاد و اساس ہے جس سے نسبت و تعلق پر ہمارا سر فخر سے بلند ہے وہاں کے مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں''شیعہ کے جو عقائد ذکر کیے گئے ہیں، یہ صریح کفر ہیں۔ ان عقائد کی بناء پر یہ لوگ قطعی کافر و مرتد ہیں'' اور پاکستان سے حضرت نعمانیؒ کے اس استفتاء کے جواب میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ نے مفصل و مدلل فتویٰ تحریر فرمایا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں''لہٰذا شیعہ اثنا عشری رافضی کافر ہیں، مسلمانوں سے ان کا نکاح، شادی بیاہ جائز نہیں حرام ہے مسلمانوں کے لیے ان کے جنازے میں شرکت جائز نہیں۔ ان کا ذبیحہ حلال نہیں، ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں، غرض ان کے ساتھ غیر مسلموں جیسا سلوک اور معاملہ کیا جائے'' جس پر حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ، حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ، مرشد الموحدین حضرت مولانا حافظ محمود اسعد ہالیجویؒ، غزالی دوراں حضرت مولانا عبدالکریم قریشیؒ، خواجہ خواجگان حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ اور موجودہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب سمیت دنیا بھر کے سینکڑوں مقتدر علماء کے دستخط موجود ہیں جس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ شیعہ کی تکفیر پر تمام اکابرین امت متفق ہیں اور جس نے بھی شیعہ عقائد و نظریات کا بغور جائزہ لیا ہے، اس نے انہیں کافر ہی کہا ہے۔

جبکہ اس وقت صورتحال بہت ہی مختلف اور انتہائی تشویشناک ہے کیوں کہ محققین کے فیصلے کی روشنی میں کافر مرتد قرار پانے کے باوجود شیعہ اثنا عشریہ کے تعلیمی مراکز کو دینی مدارس کے طور پر''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ'' میں شامل کر کے عملاً اکابرین کے فتاویٰ جات سے روگردانی کرتے ہوئے انہیں مسلمان اور دیندار کہلا کر دھوکہ سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے اور علماء نے از خود کفار و مرتدین کو اپنے ساتھ دینی نمائندگی دے کر اپنے اکابر و اسلاف کے فیصلہ کو مشکوک بنا دیا ہے بلکہ ایسے محسوس ہوتا ہے گویا عملاً اس کی تردید کر دی ہے۔

کیا آپ حضرات کے علم میں نہیں کہ شیعوں کے ساتھ دینی عنوان پر الحاق و اتحاد کی وجہ سے علماء حق پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں اور ایسے ایسے سوالات ابھر رہے ہیں جن کا جواب دینا خاصا مشکل ہے؟ اور دشمنان دین کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ علماء جب چاہیں کسی کو کافر کہہ کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور جب راضی ہو جائیں تو وہی کافر دیندار بن جاتے ہیں ان ہی کافروں کی پارٹی، دینی جماعت اور ان ہی کافروں کے کفریہ مراکز، دینی مدارس بن جاتے ہیں حال ہی میں ایک رسالہ''آتش فشاں'' نظر سے گذرا جس کے مضمون نگار نے علماء پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے''استفتاء کے جواب میں پہلا فتویٰ جامعہ بنوری ٹاؤن کے مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسنؒ صاحب کا تھا جس میں اہل تشیع کو واضح الفاظ میں کفر کی کئی وجوہات کی بناء پر مرزائیوں سے بدتر کافر قرار دیا گیا لیکن پھر اہل تشیع کو تحفظ دین کی خاطر اتحاد تنظیمات مدارس میں شامل کیا گیا اور تحریک جعفریہ صوبہ سندھ کے صدر حسن ترابی اور دیگر شیعہ رہنماؤں کو بنوری ٹاؤن

کے جلسوں میں نہ صرف شرکت کی دعوت دی گئی بلکہ ان سے تقاریر کرائی گئیں'' نوٹ: اس مضمون نگار کو شاید معلوم نہیں کہ اسی تحریک جعفریہ کے مرکزی صدر ساجد نقوی کو بھی مولانا عبداللہ شہیدؒ کے عظیم دینی ادارہ جامعہ فریدیہ اسلام آباد میں دینی مدارس کے اجلاس میں دینی نمائندگی دی گئی تھی۔

قابل صد احترام علماء کرام! کیا آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ شیعوں کے الحاق سے قبل ہمارے مدارس کے وفاق کا نام تھا ''وفاق المدارس العربیہ'' اور اب شیعوں اور دیگر فرق سے اتحاد کے بعد نام رکھا گیا ہے ''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ''، یعنی جب تک شیعہ مدارس سے الحاق نہیں تھا اس وقت تک ہمارے مدارس صرف عربیہ تھے، شیعوں کی شمولیت کے بعد اب ہمارے مدارس بھی دینیہ ہو گئے ہیں!!! عربیہ کی جگہ لفظ دینیہ کی آخر کیا وجہ تھی؟ کوئی دشمن آپ کی زبان سے کافروں کو دیندار تو نہیں کہلوانا چاہتا؟

جن لوگوں کو اکابر علماء اہل سنت خصوصاً علماء دیوبند نے کافر، مرتد اور زندیق قرار دیا تھا کیا آج ان کی کفریہ درسگاہوں کو دینی مدارس تعلیم کر کے اکابر کے فیصلے سے اظہار برأت نہیں کیا گیا؟ کیا اس طرح دین، ایمان، کفر اور اسلام کے الفاظ کا وزن ختم تو نہیں ہو جائے گا اور وہ بے معنیٰ تو نہیں سمجھے جائیں گے؟ کیا عرف عام میں دینی مدارس کا لفظ اسلامی درسگاہوں کے ساتھ مخصوص نہیں؟ کیا کافروں کی مذہبی درسگاہوں کو بھی مسلمانوں کی اصطلاح میں دینی مدرسہ کہا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر وہ کون سا عنصر ہے جو ہمیں اپنے اکابر کی راہ سے ہٹا کر، کفریہ مراکز کو دینی مدارس تسلیم کرنے اور عوام کو ان کافروں اور زندیقوں کے یقینی کفر کے متعلق شک میں ڈالنے پر مجبور کر رہا ہے؟

اے کاش! ہم وقت کی مصلحتوں کا شکار ہونے کی بجائے اکابر کی طرز پر وقت کے دھاروں کو بدل دیں اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کہنے کی پالیسی ترک کر کے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی عزت و وقار کو بلند رکھنے کی کوشش کریں۔

یاد رکھیں! اگر آج ہم واضح الفاظ میں شیعہ کو مسلمان بھی تسلیم کر لیں، تب بھی ہمیں کسی بھی میدان میں ان کی وفاداریاں نہیں مل سکتیں، اس لیے کہ ان کی تاریخ ہی غداریوں، سازشوں اور منافقانہ پالیسیوں سے عبارت ہے۔ ان سے وفا کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ سانپ کو جتنا بھی پالا پوسا جائے وہ سانپ ہی رہتا ہے اور موقع ملنے پر ڈسنے سے دریغ نہیں کرتا۔ میری یہ درمندانہ گفتگو صرف تنقید برائے تنقید نہیں اور نہ ہی کسی کی توہین و تذلیل مقصود ہے بلکہ اپنوں کے سامنے اپنے دکھ کا اظہار ہے اور اس مسئلہ کی طرف متوجہ کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم دوستوں اور دشمنوں میں تمیز پیدا کریں اور کسی ملامت کی پرواہ کیے بغیر حق وصداقت کی راہ پر گامزن رہیں اور دشمنان دین کو اہل حق علماء پر انگشت نمائی اور مفاد پرستی کا داغ لگانے کا موقع نہ دیں اور اپنے اسلاف واکابر کی اس کفر کے خلاف محنت وقربانی پر پانی پھیرنے سے بچنے کی کوشش کریں۔ نیز عنداللہ وعندالناس اس سوال کا خوف ہے کہ تمہاری زندگی میں تمہارے سامنے ایسے غلیظ ترین کفر کے مراکز کو دینی مدارس اور اس کفر کی علمبردار پارٹی کو دینی جماعت کہہ کر ان کافروں اور بے دینوں کے دیندار اور ایماندار ہونے کا تاثر دے کر اکابر واسلاف کی محنت پر پھیرا جاتا رہا۔ عام مسلمان گمراہ ہو کر کافروں کا حرام ذبیحہ کھاتے اور اپنی

بچیاں ناجائز نکاح میں دیتے رہے اور سب کچھ جانتے ہوئے تم نے چپ سادھ لی۔ آخر کیوں؟

اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص واستقامت کی دولت سے نوازے اور اپنے اکابر واسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر کفر وظلم کے مقابلے کی توفیق بخشے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

خاکپائے اہل حق

علی شیر حیدری عفی عنہ

مولانا سلیم اللہ خان کی طرف سے خط کا جواب

محترم جناب مولانا علی شیر حیدری صاحب حفظکم اللہ تعالیٰ ورعاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کا مکتوب بنام ذمہ داران وفاق المدارس العربیہ پاکستان ملا۔ اس مکتوب میں اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان میں شیعہ مکتب فکر کی شرکت پر اعتراض کیا گیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ تھا کہ عنوان عام کے بجائے وفاق کے صدر یا ناظم اعلیٰ کے نام یہ لکھا جاتا۔ فتدبر!

پہلے تو آپ نے لفظ ''دینیہ'' پر اعتراض کیا ہے۔ چونکہ شیعہ دین اسلام کے اندر داخل نہیں، اگر صرف مدارس کا لفظ ہوتا، یا دینیہ کے بجائے عربیہ کا لفظ ہوتا تو آپ کے خیال میں ان کو دین اسلام میں شرکت کی سند حاصل نہ ہوتی۔ یہ بحث اس لیے قابل غور نہیں کہ مدارس کا لفظ ہو یا اس کے ساتھ عربیہ کا اضافہ کر دیا جائے، عرف عام وخاص میں ان الفاظ کا اطلاق مدارس دینیہ ہی پر ہوتا ہے، اس لیے یہ ترمیم آپ کے مقصد کے لیے مفید نہیں۔

باقی اتحاد میں ان کی شرکت اس لیے ہے کہ حکومت نے دوسرے وفاقوں اور تنظیمات کی طرح وفاق المدارس الشیعہ پاکستان کو منظور کیا ہوا ہے۔ اس بنا پر مدارس کے جملہ معاملات میں وہ اور دیگر وفاق اور تنظیمات متحد ہو کر مذاکرات پر مجبور ہیں۔ بصورت دیگر ہم اپنے مطالبات کے لیے حکومت کے ساتھ مذاکرات میں مضبوط پوزیشن اختیار نہیں کر سکیں گے اور کامیابی کا حصول دشوار ہوگا۔ حکومت کی خواہش اور کوشش وفاقوں اور تنظیمات کو کمزور کرنے کی رہی ہے اور اب بھی یہی صورت حال ہے۔

باقی آپ نے لکھا ہے کہ ذمہ داران وفاق کا طرز عمل اکابر علماء دیوبند کے طرز سے ہٹا ہوا ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ خدائے بزرگ وبرتر آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھیں۔ آپ ماشاء اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر محسوس نہ فرمائیں تو ٹھنڈے دل سے ضرور غور فرمائیں اور بار بار غور فرمائیں کہ آپ نے اپنی تحریک کو اشتعال انگیز نعرے دے کر اب تک کیا کھویا کیا پایا؟

کیا اکابر علماء دیوبند کا یہی طریقہ رہا ہے؟ آپ کا قیمتی سرمایہ اس اشتعال کی نذر ہوگیا اور بے شمار علماء، صلحاء اور نوجوان آپ کی اس پالیسی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دشمن منظّم ہوگیا اور اس نے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کاروائیاں شروع کر دی۔ آپ کی اس پالیسی کا بھیانک اور لرزا دینے والا یہ نتیجہ پوری دنیا میں عام ہوا کہ مسلمان دہشت گرد ہیں اور اسلام دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام باڑوں اور مسجدوں میں لاشیں گر رہی ہیں، زخمی تڑپ رہے ہیں، دونوں جگہ حفاظت کے لیے پہرے بٹھا دیے گئے ہیں، بہت سے لوگ خوف کی وجہ سے نماز کے لیے مسجدوں میں نہیں آتے اور یہ سلسلہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ کیا یہ صورت حال اور اس کا تسلسل آپ کو اور آپ کی جماعت کو پسند ہے؟ اگر پسند نہیں ہے تو بتائیں کہ اس کے سد باب کے لیے جماعت نے کیا اقدامات کیے ہیں؟ آپ کے اشتعال انگیز نعروں اور ان کے مکروہ و مذموم نتائج نے حضرات صحابہؓ کرام کو بدنام کیا۔ بد باطن معاند کہتا ہے کہ جب سپاہ صحابہ دہشت گرد ہے اور اس کے کرتوت یہ ہیں تو سمجھ لو صحابہ کیسے ہوں گے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس جماعت نے اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے ڈاکے ڈالے، چوریاں کیں اور اغوا کے مرتکب ہوئے۔ یقیناً یہ حرکتیں آپ کے علم میں ہیں اور آپ بھی ان کو غلط سمجھتے ہیں، لیکن ان پر کنٹرول کرنا آپ کے بس سے باہر ہے، مگر ذمہ دار تو آپ ہی ہیں، چونکہ یہ سب آپ کی پالیسی کا یقینی اور حتمی نتیجہ ہے۔

اکابر علماء دیوبند کا نام لینا تو آسان ہے، لیکن ان کے طریقے پر چلنا دوسری چیز ہے۔ جن اکابر کے نام آپ نے اپنے خط میں لکھے ہیں، آپ کے طرز عمل اور نتائج میں ان کے طور طریقہ کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ للہ آپ غور فرمائیں، **واللہ العظیم** طعن ہرگز ہرگز مقصود نہیں، اس تحریک نے اسلام اور صحابہ کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، علماء اور مدارس کو جتنا نقصان اس اشتعال انگیز تحریک نے پہنچایا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ احقر پوری امید رکھتا ہے کہ آپ ان معروضات پر غور فرمائیں گے اور جماعتی تعصب کو در آنے کا ہرگز موقع نہ دیں گے۔ یہ نصیحت محبّ و مخلص کی طرف سے ہے، کسی معاند کی جانب سے فضیحت نہیں ہے۔

روافض کے جن غلیظ اور بدبودار حوالوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہے اور نہ ہی یہاں ان حوالوں پر متفرع نتیجہ زیر بحث ہے۔

فقط۔ سلیم اللہ خان
رئیس وفاق المدارس العربیہ پاکستان
صدر اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان
۲۰ شعبان ۱۴۲۶ھ / ۲۴ ستمبر ۲۰۰۵ء

[مکمل مراسلت ''امام اہل سنت علامہ علی شیر حیدریؒ: حیات و خدمات'' مرتبہ: محمد یونس قاسمی و عبدالجبار شیخ، شائع کردہ: خلافت راشدہ اکیڈمی، خیر پور سندھ (پہلا ایڈیشن ۲۰۱۲ء) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔]

''الشریعہ'' اور اربابِ ''الشریعہ'' کے بائیکاٹ کے حوالے سے

شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان کی تحریر

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الرسل وخاتم النبیین وعلیٰ اصحابہ وازواجہ واتباعہ وامتہ ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

وبعد! اللہ بزرگ و برتر جل وعلا نے علماء دیوبند کو دین اسلام اور شریعت بیضاء کی بے مثال خدمت سے سرفراز فرمایا ہے جس کے آثار کا پوری دنیا میں مشاہدہ کیا جا تا رہا ہے، وہیں باطل کی سرکوبی اور استیصال کرنے میں بھی اس مقدس جماعت کی نظیر موجود نہیں۔

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی نے ''آزاد فورم'' کے نام سے ''ماہنامہ الشریعہ'' میں حساس، نازک اور اہم موضوعات پر ایسی تحریریں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جو نہ صرف مذہب اہل سنت، مسلک احناف اور مشرب دیوبند سے مطابقت نہیں رکھتیں، بلکہ وہ سراسر اسلام کے اجماعی موقف سے بھی متصادم ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ہفوات کا اصل مرکز زاہد الراشدی صاحب کا بیٹا محمد عمار خان ناصر غامدی ہے۔

مولانا زاہد الراشدی کی بعض ترجیحات اور تحریرات پر بھی علماء دیوبند کو شدید تحفظات ہیں۔ کئی اکابر و محققین کے مسلسل توجہ دلانے اور باحوالہ و مدلل گفتگو کے باوجود ان حضرات نے اپنی روش نہیں بدلی اور بدستور ان کی ایمان سوز تحریریں شائع ہو رہی ہیں، بلکہ مولانا زاہد الراشدی ان بے اصولیوں پر اپنے بیٹے کو روکنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی، بلکہ دفاع بھی کرتے ہیں۔ ''الشریعہ'' بھی انھی کی نگرانی اور سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے، لیکن انھوں نے تا حال نہ یہ سلسلہ ختم کیا اور نہ ہی بیٹے کو برطرف کیا۔ تنبیہ و تفہیم کا ہر طریقہ اب تک بے اثر ہی رہا۔ فیا للاسف!!

یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ خانوادۂ علم وعرفان سے جب کوئی فتنہ نمودار ہوتا ہے تو اس کے اثرات دور دور تک پہنچتے ہیں اور ضرر بھی شدید ہوتا ہے، کیونکہ ہر مسلمان کے لیے اپنے ایمان، عقائد، افکار اور نظریات کی حفاظت انتہائی ضروری، بلکہ فرض ہے اور دیگر موضوعات کی طرح جملہ اہم، نازک اور حساس موضوعات پر بھی اپنے اکابر اہل سنت

(کثر اللہ سوادہم) کی کتابیں اور تحقیقات کافی وشافی موجود ہیں، اس لیے عوام الناس کو ان حضرات کے ''آزاد فورم'' کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس سے بچنا اور اس کا بائیکاٹ کرنا لازم ہے۔

عوام وخواص کو چاہیے کہ وہ ماضی قریب کے امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ، وکیل صحابہ مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ، شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ اور وکیل احناف مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ کی تحقیقات پر مضبوط اعتماد رکھیں اور جمہور اہل سنت ہی سے وابستہ رہیں۔

سردست انتہائی ضروری ہے کہ اس ضال ومضل ٹولے کا ہر محاذ پر بائیکاٹ کیا جائے۔ شاید یہ طریقہ ان کے رجوع الی الحق کا ذریعہ بن جائے۔ اہل حق کو ان کی ذات سے کوئی کد نہیں، ان کے نظریات اور رویے سے شکایت ہے۔ اسی کی اصلاح کے لیے بائیکاٹ کی تجویز دی گئی ہے۔

سلیم اللہ خان
رئیس جامعہ فاروقیہ کراچی
یوم الجمعہ، ۲ صفر ۱۴۳۵ھ/ ۶ دسمبر ۲۰۱۳ء

<u>مویدین:</u>

مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر (رئیس جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی)
مولانا عبد المجید لدھیانوی (جامعہ اسلامیہ باب العلوم، کہروڑ پکا)
مولانا مفتی حمید اللہ جان (رئیس دار الافتاء والارشاد، کراچی)
مولانا انوار الحق حقانی (استاذ الحدیث جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک)
مولانا منیر احمد منور (جامعہ اسلامیہ باب العلوم، کہروڑ پکا)
ودیگر علماء کرام

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ اور مولانا زاہد الراشدی کے مابین مراسلت

مخدومی ومکرمی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت فیوضکم
رئیس جامعہ فاروقیہ کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ راقم الحروف کے بارے میں آنجناب کی ایک تحریر پر ملک کے مختلف حصوں میں سرکردہ علماء کرام سے دستخط کرانے کی مہم جاری ہے اور آنجناب کے اعتماد پر بہت سے حضرات نے اس پر دستخط فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آنجناب اور دستخط کرنے والے دیگر بزرگوں کو اس سلسلہ میں پہلے مجھ سے رابطہ کر کے میرا موقف معلوم کرنا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا جبکہ مسلمہ شرعی اصول ہے کہ جس پر الزامات عائد کیے جا رہے ہوں، اس کا موقف معلوم کیے بغیر اور اسے وضاحت کا موقع دیے بغیر کوئی بھی فیصلہ یک طرفہ کہلاتا ہے اور اس کی کوئی شرعی پوزیشن نہیں ہوتی۔

اس بنا پر میں آنجناب سے درخواست کر رہا ہوں کہ مجھے ان الزامات کی متعین فہرست فراہم کر کے مجھ سے ان کا جواب طلب کیا جائے اور میرے جوابی موقف اور وضاحت کو سامنے رکھ کر جو رائے بھی مناسب سمجھیں، اس کا اظہار کیا جائے۔

میری یہ بھی درخواست ہے کہ معینہ اور مصرحہ الزامات اور میری طرف سے ان کے جوابات وتوضیحات پیش کیے جانے کے بعد کم از کم تین غیر جانب دار ذمہ دار مفتی صاحبان پر مشتمل کمیٹی مقرر کی جائے جو دونوں طرف کا موقف ملاحظہ کر کے ان پر فیصلہ صادر کرے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کمیٹی جو فیصلہ بھی کرے گی، مجھے من وعن منظور ہوگا۔

مجھے آنجناب کی طرف سے اس درخواست کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ نیز میں اس خط کی کاپیاں دستخط کرنے والے بزرگوں اور دیگر سرکردہ علماء کرام کو بھی بھجوا رہا ہوں۔ شکریہ!

ابوعمار زاہد الراشدی
۱۰ر جنوری ۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وبعد!...... احقر کئی ہفتے سے بیماری کی شدت میں مبتلا ہے، اس لیے خط لکھنے میں تاخیر ہوئی۔ امید ہے معذرت قبول فرمائیں گے۔

احقر آپ کی روش، اکابر دیوبند (اور خود امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر صاحبؒ جو آپ کے والد ماجد بھی ہیں) کے خلاف نظریات اور طریقہ کار پر سخت آزردہ اور افسردہ ہے۔ معلوم نہیں، کسی کی نظر لگی ہے یا کسی ناروا عمل کی پاداش ہے۔ واللہ اعلم۔ ہمیشہ آپ کے لیے راہ راست پر آنے کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ پاک قبول فرمائیں، آمین ثم آمین۔

آپ حضرت والد صاحب کے جانشین ہیں، جامعہ نصرۃ العلوم میں شیخ الحدیث ہیں، لیکن نہ آپ کا عمل حضرت مرحوم کے عمل کے مطابق ہے، نہ آپ کی فکر اور ترجیحات ان کی فکر اور ترجیحات کے مطابق ہیں۔ اس پر جتنا افسوس ہو، کم ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب رحمۃ اللہ علیہ علماء کرام کی جماعت میں فی زمانہ سرخیل کا درجہ رکھتے ہیں اور حق وصداقت کو جاننے کے لیے ان کو کسوٹی کا مقام حاصل ہے اور آپ ان کی بالکل ضد بنے ہوئے ہیں۔ فیاللاسف!!

اگر جناب والا اصلاح احوال چاہتے ہیں تو پہلے: [۱] آزاد فورم کا سلسلہ ختم کریں۔ [۲] عمار خان ناصر کے گمراہ ہونے کا واضح اعلان کریں۔ [۳] اس کی ہر قسم کی سرپرستی سے دست برداری اختیار کریں۔ [۴] اور اسے ماہنامہ الشریعہ اور الشریعہ اکیڈمی سے علیحدہ کریں۔ [۵] ماہنامہ الشریعہ کی پالیسی تبدیل کریں، اس میں صرف جمہور اکابر علماء دیوبند کے مسلک سے مطابقت رکھنے والے مضامین شائع کریں۔ [۶] تمام اختلافی مسائل میں جمہور اکابر علماء دیوبند کے فیصلے کو حرف آخر سمجھنے کا تحریری اقرار کریں۔

اگر یہ تمام امور منظور ہوں تو پھر جناب کی تجویز کے مطابق جید علماء کرام کی کمیٹی کے سامنے آپ کے تفردات کو پیش کیا جائے گا اور وہ کمیٹی جمہور علماء دیوبند کی تحقیق کے مطابق ان کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے گی۔

اگر حضرت محترم ان گزارشات پر آمادہ ہوں تو یہ پیچیدہ معاملہ بخوبی حل ہو جائے گا۔

سلیم اللہ خان

مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ / یکم مارچ ۲۰۱۴ء

باسمہ تعالیٰ

مخدومی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت فیوضکم، رئیس جامعہ فاروقیہ کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

نوازش نامہ موصول ہوا، علالت میں اضافے کا پڑھ کر تشویش ہوئی، اللہ تعالیٰ آنجناب کو شفاءِ کاملہ سے نوازیں اور صحت وعافیت کے ساتھ اہل حق کی سرپرستی تادیر جاری رکھنے کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

آنجناب نے گرامی نامہ میں ایک فیصلہ صادر فرما کر اس پر عملدرآمد کا حکم دیا ہے اور پھر تحقیقات کے لیے کمیٹی قائم کرنے کی بات کی ہے۔ میں نہیں سمجھ پایا کہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد یہ کمیٹی کیا کرے گی؟

مخدومِ گرامی!

میں نے اپنے عریضہ میں فیصلہ کے اسی طریق کار پر طالب علمانہ اشکال پیش کیا تھا، اس لیے کہ فیصلہ کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ فرد جرم عائد کی جاتی ہے، مدعا علیہ کو جواب کا موقع دیا جاتا ہے، اس کے جواب پر بحث وتمحیص اور جرح و تعدیل کے بعد غیر واضح امور پر اس سے وضاحت طلب کی جاتی ہے اور اس کے بعد فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ مگر یہاں فرد جرم عائد کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی اور فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔

مثلاً گرامی نامہ میں مجھ سے کہا گیا ہے کہ تمہارا طرز عمل حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کے طرز عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ لیکن کسی ایک بات کی بھی نشاندہی نہیں کی گئی، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ دینی، تعلیمی، صحافتی، سیاسی اور تحریکی معاملات میں میرا جو طرز عمل حضرت والد محترمؒ کی زندگی میں تھا اور ان کے علم میں تھا، بلکہ بہت سے امور میں ہماری باہمی رفاقت بھی رہی۔ ان کی وفات کے بعد میں اسی طرز عمل پر بدستور قائم ہوں۔ اور الشریعہ میں علمی وفکری مسائل پر کھلے بحث ومباحثہ کے اہتمام سمیت کوئی ایسا کام نہیں کر رہا جو ان کی زندگی میں نہیں کرتا تھا، اور جو ان کے علم میں نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی ایک ایسے کام کی بھی نشاندہی کر دی جائے تو اس سے رجوع کرنے بلکہ کھلم کھلا معافی مانگنے میں مجھے کوئی تأمل نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس سب کچھ کے باوجود مجھے آخر دم تک ان کا مکمل اعتماد حاصل رہا ہے جس پر پورا خاندان اور ماحول گواہ ہے تو ان کی وفات کے بعد اس قسم کی باتیں کرنا صرف میرے ساتھ نہیں بلکہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔

اس لیے میں سابقہ عریضہ اس گزارش نامہ کے ساتھ دوبارہ منسلک کر رہا ہوں اور اپنے اس اشکال اور درخواست پر اب بھی قائم ہوں کہ پہلے مجھے معینہ الزامات کی فہرست مہیا کی جائے جس کا پوری تسلی کے ساتھ جواب دیا جائے گا۔ پھر چند غیر جانبدار اصحاب علم پر مشتمل کمیٹی دونوں طرف کا موقف ملاحظہ کر کے وضاحت طلب امور کی وضاحت طلب کرے اور اس کے بعد وہ جو مناسب سمجھے فیصلہ کرے، مجھے وہ فیصلہ پوری طرح قبول ہوگا۔

عزیزم محمد عمار خان ناصر سلّمہٗ کے حوالہ سے بھی یہی عرض ہے جسے آنجناب کے گرامی نامہ میں گمراہ قرار دیا گیا ہے، کہ اسے گمراہ قرار دینے کے وجوہ تحریر کیے جائیں۔ میں اسے ان کے حوالے سے اپنا موقف واضح کرنے کے لیے کہوں گا۔ اس سے وضاحت طلب امور کی وضاحت طلب کی جائے گی اور جو باتیں علمی وشرعی طور پر فی الواقع ''گمراہی'' کے دائرے میں آتی ہوں، ان سے رجوع کے لیے کہا جائے گا۔ آنجناب اس بات کا پوری طرح اطمینان رکھیں کہ اگر وہ ''گمراہی'' کی کسی بات پر اصرار کرتے ہوئے رجوع نہیں کرے گا تو میری طرف سے برأت کے اعلان میں ایک لمحہ کا

بھی توقف نہیں ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آنجناب نے اپنے گرامی نامہ میں جمہور علماء دیوبند کے دائرہ کی پابندی کا ذکر فرمایا ہے، بحمد اللہ تعالیٰ میں نے ہمیشہ اس کی پابندی کی ہے بلکہ کئی بار اپنی تحریروں میں اس کی صراحت کر چکا ہوں کہ اگر کسی مسئلہ میں ذاتی طور پر میری رائے مختلف ہوتی بھی ہے تو عمل اسی پر کرتا ہوں جو جمہور کی رائے ہوتی ہے۔ فتویٰ تو ویسے بھی میں نہیں دیا کرتا مگر کوئی صاحب کسی مسئلہ پر مشورہ طلب کرتے ہیں تو جمہور کے موقف پر ہی عمل کی تلقین کرتا ہوں۔ البتہ اس سلسلہ میں ایک گزارش مناسب سمجھتا ہوں کہ چونکہ خود اکابر علماء دیوبند کے درمیان مختلف مسائل پر بیسیوں اختلافات موجود ہیں بلکہ فتاویٰ کے مختلف مجموعہ جات کا تتبع کیا جائے تو یہ تعداد شاید سینکڑوں تک پہنچ جائے۔ ان میں عقائد کی تعبیرات اور جائز و ناجائز کے فقہی احکام بھی شامل ہیں۔ اور چونکہ مدارس کے دارالافتاء اور مفتیان کرام تعداد میں دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی فقہی اختلافات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے، اس لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ چند امور کا اصولی طور پر جائزہ لیا جائے کہ:

☆ کون سا اختلاف قابل قبول ہے اور کون سا ناقابل قبول ہے؟

☆ کس سطح کے اختلاف پر کسی شخص کو دیوبندیت سے اور کس درجہ کے اختلاف پر اہل سنت سے خارج قرار دینا ضروری ہو جاتا ہے؟

☆ جن مسائل میں خود اکابر علماء دیوبند میں اختلافات موجود ہیں، ان میں کس موقف کو دیوبندیت کا موقف قرار دیا جائے گا؟

اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ (۱) جامعہ فاروقیہ کراچی (۲) جامعہ دارالعلوم کراچی (۳) جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی (۴) جامعہ الرشید کراچی (۵) جامعہ اشرفیہ لاہور (۶) جامعہ خیر المدارس ملتان (۷) دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (۸) جامعہ امدادیہ فیصل آباد (۹) جامعہ عثمانیہ پشاور اور اس سطح کے دیگر بڑے مدارس کے مفتیان کرام کے ذمہ لگایا جائے کہ وہ باہمی مشاورت کے ساتھ اس سلسلہ میں کوئی ضابطہ اخلاق اور اصول وضوابط طے کریں جنہیں اس نوعیت کے معاملات میں فیصلوں کی بنیاد بنایا جا سکے۔ ورنہ جس طرح موجودہ حالات میں شخصی یا محدود گروہی سطح پر اس قسم کے فیصلے سامنے آ رہے ہیں، اس سے خلفشار میں اضافہ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔

مجھے امید ہے کہ آنجناب میری ان طالب علمانہ معروضات پر مشفقانہ غور فرمائیں گے، اور جواب سے جلد نوازیں گے۔ شکریہ! والسلام

ابوعمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
۱۱ مارچ ۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۰۱۴/۳/۱۶ء

الحمد للّٰہ و کفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   وبعد!......

ا۔ آنجناب نے حق کی فہمائش اور نصیحت کو قبول کر کے رجوع الی الحق کے بجائے الشریعہ کے ''آزاد فورم'' کے مزاج کی طرح حسبِ سابق بحث کو آگے بڑھانے اور مزید طول دے کر معاملہ کو الجھانے کی غرض سے خطوط کے جواب در جواب کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا ہے، بقول آپ کے ''چوں کہ آپ اس موضوع پر مورچہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں'' لہٰذا اب مزید کسی جوابی خط کا مطالبہ کرنے کے بجائے سابقہ دو خطوط اور اس عریضے کو حرفِ آخر سمجھ کر اصلاحِ احوال فرمالیں۔

۲۔ اکابر کے طریقہ کار اور جمہور علمائے دیوبند کی تائیدات اور تحریرات کو آپ بیک جنبش قلم یہ کہہ کر کہ ''فردِ جرم عائد کرنے کی زحمت کیے بغیر فیصلہ سنا دیا گیا ہے'' رد کر دیتے ہیں، حالاں کہ یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس ہے، کیوں کہ بائیکاٹ کی تجویز والی تحریر میں صراحتاً یہ لکھا ہے کہ آپ نے:

☆......آزاد فورم کے نام گمراہی پھیلانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

☆......علماء کرام کے توجہ دلانے کے باوجود روش نہیں بدلی۔

☆......عمار خان کی حوصلہ افزائی اور دفاع کرتے ہیں۔

نیز ۲۰۰۹ء کے خط میں آپ نے خود اقرار کیا تھا کہ:

''وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے آرگن ماہنامہ ''وفاق المدارس'' کے مارچ ۲۰۰۹ء کے شمارے میں ماہنامہ ''الشریعہ'' کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے راقم الحروف کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ:

☆......میں اکابر کی راہِ مستقیم سے الگ ہو رہا ہوں۔

☆......اسلامی احکام کی حقیقی صورت مسخ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

☆......فکری کج روی پھیلا رہا ہوں۔

ظاہری بات ہے کہ وفاق المدارس کے آرگن میں شائع ہونے کی وجہ سے میرے بارے میں یہ رائے وفاق کے اکابر اور قیادت ہی کی تصور کی جائے گی اور کی جا رہی ہے۔''

آپ نے یہ بھی کہا کہ: میرا موقف نہیں معلوم کیا گیا۔ یہ بھی غلط ہے، کیونکہ ۲۰۰۷ء میں آپ نے ماہنامہ الشریعہ میں الشریعہ کی پالیسی اور آزاد فورم کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھا تھا کہ الشریعہ میں ''کسی بھی علمی موضوع پر لکھی جانے والی کوئی بھی تحریر شائع کی جا سکتی ہے'' چناں چہ آپ نے ایسا ہی کیا اور الشریعہ کو واقعتاً ایک ایسا ''آزاد فورم'' بنا دیا جس نے اکابر کے افکار و نظریات اور ہر طرح کی اخلاقی حدود و قیود سے ''آزاد'' ہو کر روافض، اہل بدعت، ملحدین،

منکرین حدیث، متجددین، مستشرقین، غامدیت نواز اور اہل حق کی فکر سے نالاں ہر لکھاری کی تحریروں کو کھلے دل سے بحث آگے بڑھانے کے نام سے شائع کیا اور کر رہا ہے، یہ سب کچھ آپ کا مؤقف اور مدعا نہیں، تو پھر اور کیا ہے؟ آنجناب کی سرپرستی میں الشریعہ کے اس فکری انحراف کو ایک عام مسلمان قاری سے لے کر دینی اور فکری سلامتی رکھنے والے عصری اداروں سے منسلک افراد، علمائے کرام اور وفاق المدارس کی قیادت، سب نے نہ صرف محسوس کیا، بلکہ بارہا اس جانب آپ کی توجہ مبذول کرائی گئی، مگر سب بے سود! لہٰذا اس سب کے بعد آپ یہ کہنا بالکل بے جا ہوگا کہ مؤقف معلوم نہیں کیا گیا، یا فرد جرم عائد کیے بغیر فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

۳۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کا طرزِ عمل امام اہل سنت رحمہ اللہ کی زندگی اور بعد میں یکساں ہی رہا ہے، اس بارے میں گذارش ہے کہ جب امام اہل سنتؒ کو ''عمار خان ناصر'' کی بعض فکری گمراہیوں کا علم ہوا تو حضرت امام اہل سنتؒ نے مولانا عبدالقدوس قارن صاحب سے فرمایا تھا کہ:

''یہ ناصر کس طرف چل نکلا ہے؟ تم اسے روکتے کیوں نہیں؟ تم تو اس کے استاد بھی ہو، اس کو سختی سے روکو۔''

الشریعہ میں جو کچھ ان کی علالت یا انتقال کے بعد ہوا اور ہو رہا ہے اگر وہ حضرت امام اہل سنتؒ کی حیات میں ہوتا اور اُنہیں اس کا علم ہوتا تو حضرت امام اہل سنتؒ یقیناً آپ کو بھی اس طرح سمجھاتے اور سختی کے ساتھ روکتے یا سمجھانے اور روکنے کا حکم فرماتے۔

الغرض آپ کا طرزِ عمل ہرگز بھی دونوں زمانوں میں یکساں نہیں رہا ہے، اس پر ماحول اور خاندان کے افراد دونوں گواہ ہیں، الشریعہ کے قاری اور خاندان کے افراد ہر دو طرف سے عمار خان ناصر اور آنجناب کے اس انحرافی طرزِ عمل کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا گیا بلکہ بارہا سمجھایا بھی گیا، کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس موقعہ پر آپ نے اپنے ہی خود ساختہ اخلاقی اور بحث ومباحثہ کو آگے بڑھانے کے اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کبھی یہ فرمایا: ''وہ (عمار) ابھی ایسے موڑ پر ہے کہ شاید نہ سمجھے''، کبھی آپ نے فرمایا: ''کیا میں اسے گھر سے نکال دوں؟'' اور کبھی غصہ کی شدت میں فرمایا: ''کیا میں اسے گولی ماردوں؟''، ایسا تو آپ نے کچھ بھی نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے آپ سے ایسا کرنے کا مطالبہ کیا، البتہ یہ ضرور کہا گیا کہ آپ عمار خان کی سرپرستی نہ فرمائیں اور اس کے گمراہ ہونے کا اعلان کر دیں، لیکن آنجناب نے ایسا کرنے کی بجائے اس کی بھرپور سرپرستی کی، بلکہ جب اس نے ''حدود وتعزیرات'' لکھ کر اجماع کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اجماع اور صحابہ کرام کا مذاق اڑایا تو آپ نے ہمدردی کے نام پر نہ صرف اس کے سر پر ہاتھ رکھا بلکہ بعنوان دیباچہ اس پر تائیدی کلمات بھی ثبت فرمائے، آپ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے بتلایئے گا کہ کیا اس طرح کے طرز عمل کی جراءت آپ حضرت امام اہل سنتؒ کی زندگی میں کر سکتے تھے؟!! حضرت امام اہل سنتؒ تو اپنے مریدین کو مودودی صاحب کی کتب پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، باطل فرقوں کے اجتماعات میں شرکت کو حرام کہتے تھے، قادیانیوں کا لٹریچر منگوانے پر اپنے بیٹے کو نہ صرف ڈانٹا بلکہ وہ لٹریچر بھی لے لیا تھا، لہٰذا یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ باطل فرقوں کی تحریریں خود شائع کر کے عوام کے سامنے پیش کرنے کی حمایت وتائید کریں؟

۴۔ آپ نے کہا کہ ''میں اب بھی اپنے اشکال پر قائم ہوں، پہلے مجھے معینہ الزامات کی فہرست فراہم کی جائے، جس کا پوری تسلی سے جواب دیا جائے گا۔۔۔الخ''، خدارا! بتلائے کہ اب تک جو تحریریں آپ کو متوجہ کرنے اور بطورِ نصیحت و رجوع الی الحق کی غرض سے لکھی گئی ہیں کیا ان میں کسی بھی الزام کا ذکر نہیں ہے؟ اور یقیناً ہے تو پھر آپ نے سوائے الفاظ کے ہیر پھیر کے ان کا کیا جواب دیا؟

اگر آپ پھر بھی اپنی بات پر مصر ہیں تو عرض مکرر کے طور پر گذارش ہے کہ آنجناب کی بے اعتدالیوں میں سے...... عمار خان کی بے جا سرپرستی و ناجائز تائید بلکہ دفاع......آزاد فورم کے نام پر لادینیت کی ترویج......مسئلہ توہین رسالت پر غامدی موقف کی حمایت...... قادیانیوں کے لیے ذمیوں کے حقوق تسلیم کرنا......فتویٰ سے لوگوں کا اعتماد اٹھانے کی کوشش کرنا......مودودی صاحب کے گمراہ کن نظریات کو اہل علم کے تفردات میں شمار کرنا......اہل علم کے لیے جمہور سے اختلاف کا حق تسلیم کرنا......امت کے اجماع سے ہٹ کر جداگانہ رائے قائم کرنے کا اختیار دینا......طلاق میں مفتیان کرام کے فتوے کو جمود قرار دے کر گنجائش نکالنے کا مشورہ دینا...... نبی کریم کی ذات پر تنقید برداشت کرنے کا قائل ہونا......خلفائے راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کے نعرے لگانا...... بدعات والی کتاب کو حُسن ذوق قرار دینا...... مبینہ قادیانی کی کتاب پر تقریظ لکھنا...... وغیرہ امور کیا آپ کے علم میں نہیں؟ اور مختلف علماء آپ کو ان امور کی طرف متوجہ نہیں فرما چکے؟ اس کے باوجود آپ کا فہرست فراہم کرنے پر اصرار کرنا معاملے کو اُلجھانے اور طول دینے کے سوا کیا معنی رکھتا ہے؟

مزید برآں! جب ۲۰۰۹ء میں ''ماہنامہ وفاق المدارس'' میں الشریعہ کی بابت ایک تبصرہ شائع ہوا تو آنجناب نے جو ''جارحانہ انداز'' اختیار کیا وہ کسی سے بھی مخفی نہیں، بلکہ آپ کے تحریر کردہ سارے خطوط اب بھی فائلوں میں محفوظ ہیں، کیا اس وقت وفاق المدارس کی قیادت کی جانب سے غیر جانبدار اہل علم حضرات حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہ، حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب مدظلہ، حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا قاری حنیف جالندھری صاحب مدظلہ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل نہیں دی گئی تھی؟! کیا آپ کو باقاعدہ اس کی اطلاع نہیں دی گئی تھی؟! آنجناب سے گذارش ہے کہ خدارا! حقائق کو مسخ مت کیجیے۔

۵۔ جب کمیٹی قائم کر دی گئی تھی تو ''وضاحت نہ مانگے جانے کا اب کی طرح ڈھنڈورا پیٹ کر'' اس وقت اس میں پیش ہو کر صفائی دینے کے بجائے بقول حضرت مولانا قاری حنیف جالندھری صاحب'' آپ نے نہ صرف استعفیٰ پیش کیا، بلکہ ''الشریعہ'' کے تحریری دفاع کو ترجیحا اختیار فرمایا''، وفاق المدارس کے ذمہ دار حضرات نے اس پر بھی آپ سے بائیکاٹ کا اعلان نہیں فرمایا، بلکہ معاملہ مکالمہ اور افہام و تفہیم سے حل کرنے کے لیے صدر وفاق کی سربراہی میں پھر ایک کمیٹی تشکیل دی اور آپ سے اپنے مؤقف کی وضاحت کے لیے اجلاس میں شرکت کی درخواست کی تو آنجناب نے فرمایا: ''مجلس عاملہ کو عدالتی کٹہرہ بنانے میں کیا افادیت؟ اور اکابر علماء کی جیوری قائم کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے؟ مزید فرمایا: ''مجھے اس معاملہ میں شرح صدر نہیں، میں کسی مزید پیش رفت کے لیے خود کو ذہنی طور تیار نہیں پاتا''، کیا

اس سب کے باوجود آنجناب کا اب دوبارہ الزامات کی وضاحت کے لیے معینہ فہرست کے مطالبے کا مقصد معاملے کو ''طول دینے اور مزید اُلجھانے'' کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

مزید برآں وفاق المدارس کی قیادت نے اس موقعہ پر بھی بائیکاٹ کی تجویز دینے کی بجائے معاملہ کو بات چیت سے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے آپ سے کراچی تشریف لاکر مؤقف کی وضاحت کے لیے وقت مانگا تو آپ نے مدرسہ میں یک ماہی امتحان کا عذر پیش کرنے کے علاوہ یہ کہہ کر سفر سے معذرت کردی کہ ''جب تک وفاق المدارس کی قیادت کا ذہن صاف نہیں ہوتا، تو آپ کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوں گے''، محترم راشدی صاحب کیا یہ ہے وہ شرعی اصول جس کا موجودہ خط میں رونا رویا گیا ہے کہ ''وضاحت نہیں مانگی گئی اور یک طرفہ فیصلہ سنادیا گیا ہے؟!!''، اے کاش آنجناب اس وقت اپنے ذکر کردہ اس شرعی اصول کو ملحوظ خاطر رکھ کر وضاحت کے لیے پیش ہوتے اور اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی وضاحت فرماتے تو شاید ''بائیکاٹ'' کی تجویز کی نوبت ہی نہ آتی، لیکن بغیر وضاحت پیش کیے اپنے ہی بیان کردہ اصول کی خلاف ورزی کرکے یہ مطالبہ کرنا کہ وفاق کی قیادت کا پہلے ذہن صاف ہوجائے نری زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟!! آپ کا طرزِ عمل تو بتلارہا ہے کہ آپ وضاحت کے لیے ہرگز پیش نہیں ہوں گے، تحریر کے ذریعے معاملہ کو مزید طول دے کر اُلجھاتے رہیں گے اور دوسری طرف وفاق کی قیادت کا ذہن خود بخود صاف ہوجائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا یہ ہیں اخلاقی حدود اور مسلمہ شرعی اصول کہ وفاق کی قیادت تو معاملہ سلجھانے کے لیے باربار آپ سے وضاحت کے لیے حاضری کی درخوست کرتی رہی اور آپ ہر دفعہ دامن بچاتے رہے اور کبھی حاضری کی زحمت گوارا نہیں کی!!

۶۔ آنجناب نے وفاق المدارس کی غیر جانبدار کمیٹی میں پیش ہونے کے بجائے ''الشریعہ'' مئی رجون ۲۰۰۹ء کے شمارے میں اپنا مؤقف نہایت ہی وضاحت کے ساتھ ''ارباب علم ودانش کی عدالت میں الشریعہ کا مقدمہ'' کے عنوان سے بیان فرمایا، کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ نے وفاق کی مجلس عاملہ کی عدالت میں پیش ہونے کے بجائے الشریعہ کے ارباب عقل و دانش کی عدالت میں اپنا مقدمہ کیوں دائر کردیا؟ کیا آپ کے نزدیک مجلس عاملہ والے حضرات کی حیثیت اتنی بھی نہیں کہ آپ نے ایک دفعہ بھی ان کے سامنے پیش ہونے کی زحمت گورا نہیں کی اور الشریعہ کے نام نہاد ارباب عقل و دانش کو اپنے اکابر پر ترجیح دی، آخر کیوں؟! پھر یہ الشریعہ کے نام نہاد ارباب و دانش کون ہیں؟ کیا یہ وہی لوگ تو نہیں جن کے غلط سلط مضامین الشریعہ میں احترام کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں؟!!۔ اتنی بات تو یقینی ہے کہ الشریعہ کے یہ ارباب عقل و دانش وفاق کی قیادت اور مجلس عاملہ کے ارکان اور غیر جانبدار کمیٹی کے معزز حضرات تو نہیں، کیوں کہ اگر وہ مراد ہوتے تو آنجناب ایک دفعہ تو ضرور ان کے روبرو پیش ہونے کی زحمت گوارا فرمالیتے، لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنا مقدمہ بہت ہوشیاری کے ساتھ اپنی پسند کی کسی دوسری عدالت میں لے گئے، اس کے بعد اگر کسی صاحب نے الشریعہ کی عدالت میں جواب دعویٰ دائر کیا تو آنجناب نے اپنے ہی تمام مسلمہ اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے الشریعہ میں شائع نہیں کیا، یہ سب کرنے کے بعد اب دوبارہ وضاحت نہ مانگے

جانے کا واویلا کرنا اور مسلمہ شرعی اصولوں کی خلاف ورزی کا الزام عائد کر کے پھر سے کمیٹی کا مطالبہ بالکل بھی سمجھ سے بالاتر بات ہے۔

۷۔ الشریعہ مئی/جون ۲۰۰۹ء والے مؤقف کے بارے میں آنجناب نے کہا تھا کہ ''یہ میرا اول اور آخر مؤقف ہے، جس میں کسی قسم کی نظر ثانی کے لیے میں تیار نہیں''، اب آپ ہی فرمائیں کہ ''اول اور آخر مؤقف جس میں کسی قسم کی نظر ثانی کی گنجائش بھی نہیں'' کے سامنے ہوتے ہوئے رجوع الی الحق کی فہمائش کی جائے، بصورت دیگر بائیکات کی تجویز دی جائے تو یہ کس مسلمہ شرعی اصول کی خلاف ورزی ہوئی، مزید اس کے بعد آپ کا یہ کہنا کہ ''مدعی علیہ کو جواب کا موقعہ دیے بغیر فیصلہ سنایا گیا ہے'' کیسے درست ہوسکتا ہے؟! حالاں کہ آنجناب کو نہ صرف جواب کا بھرپور موقعہ دیا گیا تھا، بلکہ ایک غیر جانبدار کمیٹی بھی بنادی گئی تھی، آپ نے اس میں پیش ہو کر کسی وضاحت کی زحمت گوارا نہیں کی، بلکہ تحریری طور سے دفاع کا انداز اختیار فرمانے کے بعد اب دوبارا وضاحتی کمیٹی کا مطالبہ اس سابقہ تبدیل نہ ہونے والے مؤقف پر نظر ثانی کی نیت سے ہے یا پھر حسبِ سابق معاملہ کو طول دے کر الجھانے کی غرض سے ہے؟

۸۔ باقی رہی بات فساد کی اصل جڑ جناب عمار خان ناصر غامدی کی گمراہی کی تو عیاں را چہ بیاں!!

الشریعہ کا ریکارڈ، عمار خان کی تحریرات و کتب، مولانا مفتی عبدالوحد کی کتاب ''عمار خان کا نیا اسلام'' اور دیگر علماء کے مقالات و مضامین آپ کے سامنے ہیں۔ جناب عمار صاحب نے آپ کی سرپرستی کی چھتری تلے اجماع کی حجیت اور اجماع کے وجود کا انکار کیا، اتباع سلف سے انحراف کر کے رجم کی شرعی حیثیت سے انکار کیا، مرد کے طلاق کے حق میں رخنہ اندازی کر کے عورتوں کو طلاق کا حق دینے کے لیے حیلہ سازی کی مذموم کوشش کی، مسجد اقصیٰ کو یہودیوں کا حق قرار دیا، صحابہ کرام پر طعن و تشنیع کی شنیع حرکت کا مرتکب ہوا، اسے حیاتِ عیسیٰ پر عدم یقین ہے، وہ مرتد کی شرعی سزا کا انکار کرتا ہے، وہ قانون ناموس رسالت سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، افغان طالبان کے دفاعی جہاد کے ساتھ ساتھ اقدامی جہاد کا انکاری ہے، اکابر کا گستاخ ہے، اکابر پر بہتان طرازی کرتا ہے اور مدارس کے نظام تعلیم پر تنقید اور اس کے ساتھ استہزاء کرنا اس کا عام وطیرہ ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ اسے معروف گمراہ، ملحد و متجدد جاوید غامدی سے نہ صرف یہ کہ شرف تلمذ حاصل ہے بلکہ اسے اس پر فخر بھی ہے۔ وہ اس گمراہ شخص کو نہ صرف دانشور گردانتا ہے بلکہ اسے مجتہدین کی صف میں بھی شمار کرنے کی علی الاعلان جراءت بھی کرتا ہے۔ مزید برآں جناب عمار کو بزعم خود ''اجتہاد'' کا ملکہ بھی حاصل ہے، ھذا فلیحفظ۔

کیا آنجناب کی نظر میں ان میں سے کوئی بات بھی ''فی الواقع گمراہی'' میں داخل نہیں؟ اگر نہیں تو موصوف اور آپ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور اگر یہ سب فی الواقع گمراہی ہے اور یقیناً ہے جیسا کہ خود آنجناب کی بعض تحریرات اور مکالمات سے واضح ہے، تو پھر آپ نے کتنی دفعہ موصوف کو اس کھلی گمراہی سے باز آنے اور توبہ کر کے رجوع الی الحق کی دعوت دی، اور اس نصیحت و فہمائش کو قبول کر کے تا حال رجوع الی الحق نہ کرنے اور فی الواقع گمراہی پر اصرار در اصرار کی صورت میں کیا آپ نے اسے گمراہ قرار دے کے اس سے براءت کا اعلان کیا، یا پھر موجودہ خط کی طرح اس کے لیے

گمراہی کی فہرست اور وضاحت کا موقعہ دینے کے نام پر دفاعی مورچہ کا کام دیا، فلیتأمل.

۹۔ آنجناب کا دعویٰ ہے کہ آپ تمام امور میں جمہور علمائے دیوبند کے مسلک ومشرب کی پابندی کرتے ہیں، حالاں کہ ''آزاد فورم'' آپ ہی کا جاری کردہ ہے جو جمہور علمائے دیوبند کو ہرگز بھی قابل قبول نہیں۔ علماء میں صرف آپ اور آپ کے صاحبزادہ کی تحریریں ہی ایسی کیوں ہیں کہ اہل باطل اور گمراہ فرق انہیں بلا جھجک اپنے مؤقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں؟!! اگر آپ درحقیقت تمام امور میں جمہور علمائے دیوبند کے مسلک ومشرب کے پابند ہیں تو پھر بتلائیے کہ الشریعہ کا آزاد فورم آخر کس بلا کا نام، کیا اسی کا نام آپ نے اکابر دیوبند کا مؤقف تو نہیں رکھ لیا؟

۱۰۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جمہور علمائے دیوبند کا مسلکی مزاج اور دینی ونظریاتی افکار اب کسی بیان کے محتاج نہیں، اپنے تو اپنے غیر بھی علمائے دیوبند کے دینی تشخص اور فکری نظریات سے علی العموم واقف ہیں، چناں چہ اصلاح کی خاطر دی گئی بائیکاٹ کی تجویز پر ''شخصی اور گروہی'' کی پھبتی کس کر مزید کسی کمیٹی کا مطالبہ کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں ہوسکتا، لہٰذا معروضی حالات کے تحت دی گئی بائیکاٹ کی تجویز اس وقت جمہور علمائے دیوبند کی تائیدات پر مشتمل ہے۔ کیا جمہور علماء، جن میں وفاق کی اکثر قیادت بھی شامل ہے ''شخصی اور گروہی'' کا مصداق ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر آنجناب کو سوچنا چاہیے کہ آخر کچھ تو ہے کہ مخلصین کی یہ جماعت آپ اور آپ کے صاحبزادے سے بائیکاٹ کی تجویز دے رہی ہے۔ کیا ان سب کو آنجناب سے کوئی ذاتی عداوت ہے؟ یا سب شریعت کے مسلمہ اصولوں ناواقف ہیں؟ یا ان حضرات نے بغیر کسی جرم کے کسی کو مجرم قرار دے ڈالا؟ کیا اسے کوئی صاحب عقل وخرد تسلیم کرلے گا؟ تلك عشرة كاملة.

الحاصل ہم نے نہایت اخلاص اور پوری دیانت داری سے آپ کی اصلاحِ احوال اور عوام الناس کے ایمان وفکر کی حفاظت کے لیے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا، لیکن آپ کے معاملے کو طُول دینے والے طرزِ عمل اور بات کو اُلجھانے والی پالیسی نے سخت مایوس کیا ہے، گویا کہ آپ صرف وقت گزارنے کے خواہش مند ہیں، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ لہٰذا ہم اپنے بائیکاٹ کے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے آپ سے گفتگو ختم کر رہے ہیں کیوں کہ طول اور بحث برائے بحث کا کوئی فائدہ نہیں، البتہ آپ کو دوبارہ یہی دعوت دیتے ہیں کہ: ذرا سوچئے! اور اپنے طرز عمل کا اصلاح کی غرض سے جائزہ لیجیے اور ٹھنڈے دل ودماغ سے اصلاح کی خاطر دی گئی تجاویز پر غور فرمائیں اور انہیں قبول کر کے بہت سے ''فتنوں'' کا سد باب کیجیے، اور

[۱] آزاد فورم کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے ماہنامہ الشریعہ کی پالیسی کو جمہور علماء دیوبند کے مسلک کے مطابق بنائیں۔

[۲] عمار خان ناصر کی گمراہی کا اعلان کر کے اس سے ہر قسم کی برأت کا اظہار کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کے ایمان کی حفاظت فرمائے اور آخر خاتمہ ایمان پر فرمادے، آمین ثم آمین۔

سلیم اللہ خان

مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی

۱۶؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ ..... ۱۷؍ مارچ ۲۰۱۴ء

باسمہ تعالیٰ

بگرامی خدمت مخدومی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم، رئیس جامعہ فاروقیہ کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

میرے عریضہ کے جواب میں آنجناب کا گرامی نامہ موصول ہوا جس کی طوالت اس لحاظ سے خوشی اور اطمینان کا باعث ہے کہ آنجناب کی صحت ماشاءاللہ اب بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر صحت وعافیت کے ساتھ سلامت رکھیں، آمین۔

آپ کے گرامی نامہ میں شامل بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں مگر سرِ دست تمام امور کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کے ارشادات کا خلاصہ میں یہ سمجھا ہوں کہ آنجناب میرے مسئلہ کے بارے میں کسی نئے بحث ومباحثہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اسے ہی فیصلہ کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ اگر آنجناب کی منشا یہی ہے تو میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں صرف ایک شرط کے ساتھ کہ آنجناب چند غیر جانبدار اصحابِ علم کی ایک کمیٹی کی تشکیل سے اتفاق فرما لیں جو:

☆ اس بات کی وضاحت کرے کہ علمی، فکری اور فقہی اختلافات کی حدود کیا ہیں اور کون سے اختلاف پر کسی کو گمراہ اور اہل سنت یا دیوبندیت سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے؟

☆ اس کمیٹی کے سامنے ہمارے مسئلہ کے بارے میں دونوں طرف سے اب تک شائع ہونے والا مواد پیش کر دیا جائے جو اس کا مطالعہ کرنے کے بعد وضاحت طلب امور کی وضاحت طلب کرے اور اس کے بعد جو فیصلہ مناسب سمجھے صادر کر دے۔

آنجناب نے وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کی طرف سے (۱) حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر مدظلہ (۲) حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہ (۳) حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ اور (۴) حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری مدظلہ پر مشتمل جس کمیٹی کے تقرر کا ذکر فرمایا ہے اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں منعقد ہونے والے علماء دیوبند کے ملک گیر مشترکہ اجتماع کے موقع پر مجھ سے بات کی تھی تو میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مین نے ماہنامہ ''وفاق المدارس'' کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرایا تھا کہ اس نے میرے خلاف جبکہ میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کا رکن اور تخصصات کے نصاب کی کمیٹی کا سربراہ تھا، ایک تند وتیز مضمون مجھ سے رابطہ قائم کیے بغیر اور میرا موقف معلوم کیے بغیر شائع کر دیا تھا۔ اور اس کی وضاحت کے لیے میرا جوابی مضمون شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا، اسی وجہ سے میں نے کمیٹی کی سربراہی اور مجلس عاملہ کی رکنیت سے استعفیٰ دیا تھا۔ اور غالباً اسی موقع پر وفاق المدارس کی مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وفاق کے جریدہ میں علماء دیوبند کے مابین متنازعہ امور کے بارے میں کوئی مضمون شائع نہیں کیا جائے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ سے میں نے جامعہ اشرفیہ لاہور کے مذکورہ اجلاس کے موقع پر یہ عرض کر دیا تھا کہ اب آپ بزرگ اس مسئلہ کے حل کے لیے جو طریق کار مناسب سمجھیں گے میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ مگر اس کے بعد آج تک اس سلسلہ میں مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا۔ اس لیے اگر کسی نئی کمیٹی کے قیام میں آنجناب کو شرح صدر نہ ہو تو ان بزرگوں کی خدمت میں درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ اس مسئلہ کے حل میں کردار ادا کریں۔ میں نے حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب سے اس وقت جو عرض کیا تھا اس کے لیے اب بھی حاضر ہوں۔

مخدوم گرامی! میرے اب تک کی تمام گزارشات کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ دونوں طرف کا موقف سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے اور یکطرفہ معلومات کو کسی فیصلہ کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی وضاحت اور ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تأثر قطعی طور پر خلاف واقعہ ہے کہ علمی وفکری مسائل پر میرا طرز عمل اور الشریعہ میں آزادانہ مباحثہ کی پالیسی حضرت والد محترم رحمہ اللہ تعالیٰ کی علالت اور وفات کے بعد شروع کی گئی ہے۔ یہ سب کچھ حضرت والد محترمؒ کی صحت وحیات کے دور میں اور ان کے علم میں اسی طرح ہوتا رہا ہے جس طرح اب ہو رہا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس سلسلہ میں شواہد آپ کی خدمت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

امید ہے کہ آنجناب ان گزارشات پر مشفقانہ غور فرما کر جواب سے جلد نوازیں گے۔ شکریہ!

والسلام

ابوعمار زاہد الراشدی

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

۲۰ مارچ ۲۰۱۴ء

ابوعمار زاہد الراشدی

ناقدین کی خدمت میں!

میں نے ۲۰ مارچ ۲۰۱۴ء کو حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا تھا جس کے جواب کے طویل انتظار کے بعد ۲۲ مئی کو یہ سطور تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور چونکہ میری معروضات اور استدعا کا جواب دیے جانے کی بجائے اس سارے مواد کی ملک بھر میں اشاعت، تشہیر اور تقسیم کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا گیا ہے، اس لیے میں بھی مجبوراً یہ گزارشات مطبوعہ صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ محسوس نہیں کیا جائے گا۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم نے اپنے ۱۸ مارچ کے تحریر فرمودہ تفصیلی گرامی نامہ میں مجھ پر اور عمار خان پر الزامات کی جو فہرست بیان فرمائی ہے، ان کے حوالہ سے عرض ہے کہ وہ سب کم و بیش وہی ہیں جو اس سے قبل متعدد بار بعض حضرات کی طرف سے سامنے آتے رہے ہیں اور ان کے تفصیلی جوابات ماہنامہ الشریعہ اور ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر اب وہی سب باتیں جوابی موقف کا مطالعہ کیے بغیر پھر سے یک طرفہ طور پر اس گرامی نامہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ مزاج راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ ہم نے جس کے خلاف کچھ کہنا ہوتا ہے، اس کا موقف اس سے نہیں پوچھتے بلکہ اس کی چند عبارات کو سامنے رکھ کر خود طے کرتے ہیں اور اگر وہ جواب میں اپنے موقف کی وضاحت کرے تو اسے یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ماضی میں یہ طرز عمل مولانا احمد رضا خان نے اختیار کیا تھا کہ اکابر علماء دیوبند کی کتابوں سے اپنے مطلب کی چند عبارات منتخب کر کے ان سے اپنی مرضی کے نتائج اخذ کیے تھے اور ان پر ایک استفتا کی بنیاد رکھی تھی جس پر حرمین شریفین کے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کیا گیا تھا اور جب اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ نے ''المہند علی المفند'' کی صورت میں اپنا موقف واضح کیا تو ان کی وضاحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا جو اب تک جاری ہے۔

ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا ہے کہ ہماری تحریروں سے اپنے مطلب کی عبارات چھانٹی گئی ہیں اور ان پر فتویٰ اور مہم بازی کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔ ہمارا موقف ہم سے پوچھنے کی بجائے از خود طے کر لیا گیا ہے اور سب کچھ ہو جانے کے بعد ہم اپنے موقف کی وضاحت کا حق مانگ رہے ہیں تو اسے ''بحث کو آگے بڑھانے اور مزید طول دے کر معاملہ کو الجھانے'' کا عنوان دے کر یہ حق دینے سے صاف انکار کر دیا گیا ہے۔ حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کے مکتوب گرامی میں جتنی باتیں تحریر فرمائی گئی ہیں، وہ سب الزامات ہیں۔ کسی ایک کے ساتھ کوئی دلیل،

حوالہ یا ثبوت موجود نہیں ہے، بلکہ اس سے قبل جس فتویٰ کو ''متفقہ فتویٰ'' قرار دیا گیا ہے، اس میں بھی صرف یک طرفہ دعویٰ اور الزامات کا ذکر ہے جبکہ ملک بھر کے جن ذمہ دار مفتیان کرام نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا ہے، ان کی فہرست سامنے لائی جائے تو دستخط کرنے والے بزرگوں کی تعداد اس کے ''متفقہ'' ہونے کی حیثیت کو واضح کر دے گی۔

مکتوب گرامی میں وفاق المدارس کے معاملہ کا حوالہ دیا گیا ہے اور دو شکوے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے زبانی گفتگو کے ذریعے مسئلہ حل کرنے کی بجائے تحریری مکالمہ کو ترجیح دی ہے اور دوسرا یہ کہ وفاق المدارس نے جو کمیٹی قائم کی تھی، میں نے اس کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ زبانی گفتگو کی بجائے تحریری مکالمہ کا راستہ میں نے اختیار نہیں کیا بلکہ دونوں مرتبہ دوسری طرف سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ وفاق المدارس کے مجلّہ نے میرے خلاف تند و تیز مضمون شائع کیا تھا تو اس سے قبل مجھ سے زبانی بات چیت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اور جب اس مضمون کے جواب میں اپنا وضاحتی مضمون میں نے بھجوایا تو اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ دوسری بار بھی فتویٰ صادر کرنے سے پہلے مجھ سے گفتگو مناسب نہیں سمجھی گئی تھی اور فتویٰ صادر ہونے کے بعد میں نے جب غیر جانبدار مفتیان کرام کی کمیٹی گفتگو کے لیے قائم کرنے کی درخواست کی تو اس سے انکار کر دیا گیا۔ اس لیے میں نے اگر تحریری دفاع کا راستہ اختیار کیا ہے تو یہ جواباً ہے، اس کی پہل میں نے نہیں کی۔

جہاں تک وفاق المدارس کی کمیٹی کی بات ہے، یہ درست ہے کہ میں نے اپنا جواب اور وضاحتی موقف ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں شائع نہ کرنے پر احتجاج کیا تھا اور میں اب بھی اس احتجاج میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں، بالخصوص اس پس منظر میں کہ وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کے ۹/اپریل ۲۰۰۹ء کے اجلاس میں جہاں ''الشریعۃ'' پر ''وفاق المدارس'' کے تبصرے اور میرے احتجاجی استعفے کے حوالے سے میرے ساتھ گفتگو کے لیے اکابر علماء کرام کی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ ہوا، وہیں یہ بھی طے ہوا کہ ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں ''ایسے مضامین جو اکابر علماء دیوبند میں اختلاف یا انتشار کا ذریعہ بن سکتے ہوں، ان سے اجتناب کیا جائے گا۔'' (بحوالہ کارروائی مجلس شوریٰ) اس کا مطلب یہ ہے کہ وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ نے بھی اختلافی مضمون کی اشاعت کو پسند نہیں کیا تھا۔

بہرحال اس کے بعد جب اپریل ۲۰۱۰ء کے دوران جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہونے والے علماء دیوبند کے ملک گیر اجتماع کے موقع پر اس کمیٹی کے بزرگ رکن حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تو میں نے ان سے عرض کر دیا تھا کہ میں نے اس وقت احتجاج ریکارڈ کروایا تھا۔ اب میں حاضر ہوں۔ آپ بزرگ ہیں، جو فرمائیں گے اس کے مطابق کروں گا۔ لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، جبکہ صدر وفاق کی خدمت میں اس کے بعد تین مرتبہ میری حاضری ہو چکی ہے اور وہی اس کمیٹی کے سربراہ ہیں جو اس حوالے سے قائم کی گئی تھی۔

☆ جامعہ اشرفیہ کے مذکورہ اجلاس کے موقع پر میں مسلسل دو روز ان کی خدمت میں حاضر رہا۔

☆ جامعہ احسن المدارس کراچی کے معصوم طلبہ کی شہادت کے بعد چند سرکردہ حضرات کا جو اجلاس اسلام آباد میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن کی رہائش گاہ پر حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوا، اس

اجلاس میں ان کی خدمت میں میری حاضری ہوئی۔

☆ ۱۷اپریل ۲۰۱۳ءکو وفاق المدارس کے مسئولین کا جو اجلاس ملتان میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان کی صدارت میں ہوا، اس کی ایک نشست میں مجھے خصوصی طور پر بلایا گیا۔ یہ نشست وفاق المدارس کے زیر اہتمام مجوزہ عالمی اجتماع کی تیاریوں کے لیے تھی۔ اس میں سات رکنی ''میڈیا کمیٹی'' قائم کر کے مجھے اس کا مسئول بنایا گیا اور میں نے اس حوالے سے اسلام آباد میں باضابطہ اجلاس کر کے سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا تھا۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ کو یاد ہوگا کہ ملتان کے مذکورہ اجلاس کے بعد میں ان کی مجلس میں بیٹھا تھا تو انہوں نے ایک بات بطور شکوہ فرمائی تھی کہ ''تم نے وفاق المدارس کے تحت قدیم فضلاء کے امتحان میں فرضی نام سے شرکت کی تھی''۔ میں نے عرض کیا تھا کہ نہیں، میں اپنے اصل نام کے ساتھ امتحان میں شریک ہوا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ ''کیا تم نے عبد القیوم کے نام سے امتحان نہیں دیا تھا؟'' میں نے عرض کیا کہ نہیں، میں نے عبد المتین کے نام سے امتحان دیا تھا اور وہ میرا اصل نام ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تمہارا نام زاہد الراشدی نہیں ہے؟ میں نے اس کے جواب میں اپنا شناختی کارڈ ان کی خدمت میں پیش کیا تھا جس میں میرا نام ''محمد عبد المتین خان زاہد'' درج ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا ''اچھا! میں تو اس حوالے سے تم سے بدگمان ہی رہا''۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور ''بدگمانی'' ان کے ذہن میں ہوتی تو اس کا بھی اظہار فرماتے یا ان تین حاضریوں میں سے کسی موقع پر اس کا ذکر فرما دیتے۔ اس لیے اس ملاقات کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا کہ ماضی کے معاملات ماضی کا حصہ بن گئے ہیں اور نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی سب معاملات بھلا دیے اور حضرت موصوف کے حکم پر ''میڈیا کمیٹی'' کے مسئول کے طور پر وفاق المدارس کے لیے پھر سے متحرک ہو گیا جس کی رپورٹ ماہنامہ ''وفاق المدارس'' کے جون ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ اس پس منظر میں میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ جس ''فتویٰ'' پر حضرت مدظلہ سے دستخط لیے گئے ہیں اور پھر ان کے نام پر دوسرے بزرگوں سے دستخط لینے کی مہم چلائی گئی ہے، وہ خود ان کا تحریر کردہ نہیں ہے جس کی تائید اس تحریر کی زبان اور اسلوب سے بھی ہوتی ہے۔ میں ان کا پرانا نیازمند ہوں۔ ان کی بزرگانہ شفقت سے ہمیشہ فیض یاب ہوتا رہا ہوں اور ان کے دینی، علمی اور اخلاقی مرتبہ و مقام سے کچھ نہ کچھ ضرور آگاہ ہوں۔ اس لیے کسی طرح بھی اس تحریر کو ان کے قلم سے باور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

دراصل کچھ لوگوں کا مزاج اور شوق یہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں سے اپنے مطلب کی بات کہلوانے یا ان کی بات میں اپنی بات شامل کر کے اس کا وزن بڑھانے کے لیے ان کے گرد ''تلک الغرانیق العلی'' جیسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور جتنا بڑا بزرگ ہوتا ہے، اسی درجہ کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس اور ماحول تک کو معاف نہیں کیا گیا تو دوسرا کون اس سے بچ سکتا ہے؟ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ اس وقت وحی جاری ہونے کی وجہ سے ''فینسخ اللّٰہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللّٰہ آیاتہ'' کا اہتمام ہو گیا تھا اور اب وحی کا دروازہ بند ہونے کے بعد اس کا امکان نہیں رہا۔ اب صرف فراست و بصیرت کے ذریعے ہی اس قسم کے ماحول سے بچا جا سکتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت والد محترم نور اللہ مرقدہ جب کئی سال سے مسلسل بستر علالت پر تھے اور میں وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک بار حاضر ہوا تو کچھ نوجوان ان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت والد محترمؒ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ اچھا ہوا، تم آ گئے۔ یہ لڑکے دو روز سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کسی تحریر پر دستخط کرانا چاہتے ہیں۔ ذرا دیکھ لو، یہ کیا کہتے ہیں؟ میں ان نوجوانوں کو دوسرے کمرے میں لے گیا، وہ تحریر پڑھی جو میرے خیال میں حضرتؒ کے شایان شان نہیں تھی۔ میں نے ان نوجوانوں کو ڈانٹا اور کہا کہ دو چار باتیں سنا کر اس بزرگ سے دستخط لینا چاہتے ہو جن کی تحقیق کا معیار یہ رہا ہے کہ جب تک کسی کتاب میں مطلوبہ حوالہ خود نہیں دیکھ لیتے تھے، اس کا ذکر نہیں کرتے تھے اور ایک ایک حوالہ کی تلاش میں سینکڑوں میل سفر کر کے لائبریریوں تک رسائی حاصل کرتے تھے؟ یہ ان کے ساتھ زیادتی ہے کہ دو چار باتیں سنا کر اپنی مرضی کی کسی تحریر پر ان سے دستخط کرا لیے جائیں۔ یہ بات جب میں نے والد محترمؒ کو بتائی تو انہوں نے فرمایا کہ ''تم نے اچھا کیا ہے۔''

میرا دل اب بھی اس ''فتویٰ'' کو حضرت مولانا موصوف کی تحریر نہیں مانتا، لیکن چونکہ انہوں نے اس پر دستخط فرما دیے ہیں اور اپنے دوسرے خطوط میں ان کی توثیق بھی فرما دی ہے، اس لیے بادل نخواستہ اسے ان کا موقف سمجھ کر میں نے بار بار درخواست کی ہے کہ دوسری طرف کا موقف بھی معلوم کر لیا جائے اور دوسرے فریق کو بھی اپنی بات عرض کرنے کا موقع دیا جائے۔ مگر اخبارات و جرائد میں اس سے قبل دونوں طرف سے شائع ہونے والے مضامین کو ہی کافی سمجھ کر مزید تحقیق سے صاف انکار کر دیا گیا ہے۔ مجھے اپنے بزرگوں کی خدمت میں یہ گزارش کرنے کی ضرورت خدا جانے کیوں محسوس ہو رہی ہے کہ اخبارات و جرائد کی تحریریں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اور مکالمہ کا ذریعہ تو ضرور ہو سکتی ہیں، لیکن قضا، فتویٰ یا تحکیم کے لیے کافی نہیں ہوتیں اور نہ ہی کبھی کسی عدالت نے محض اخباری مضامین کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر کیا ہے۔ فیصلہ اور فتویٰ کا اپنا دائرہ ہوتا ہے اور اس کا صحیح طریقہ کار وہی ہوتا ہے جو میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ جس کے خلاف الزام ہو، اس سے جواب طلب کیا جائے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ صادر کیا جائے۔ اس کے بغیر جاری کیے جانے والا کوئی بھی فیصلہ یک طرفہ ہوتا ہے اور اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوتی۔

پھر حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم نے میرے خلاف یہ فتویٰ کسی ''استفتا'' کے جواب میں دیا ہوتا تو یہ بات سمجھی جا سکتی تھی کہ استفتا میں جو کچھ پوچھا گیا ہے، یہ اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ فتویٰ کسی استفتا کے جواب میں نہیں بلکہ خود حضرت مدظلہ کی طرف سے ہے۔ اس لیے میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ ''فتویٰ'' اور فیصلے کے تقاضے پورے کیے بغیر ایک تحریر پر ان سے دستخط کرا لیے گئے ہیں۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ نے اپنے تفصیلی مکتوب میں میرے بارے میں الزامات کی جو فہرست دہرائی ہے، ان میں سے ایک بھی ایسا الزام نہیں ہے جس کا جواب نہ دیا جا چکا ہو۔ اس لیے کوئی نئی بات کہنے کی بجائے میں پہلے سے شائع شدہ مضامین میں سے ایک انتخاب ''الشریعہ'' کے زیر نظر شمارے میں شامل کر رہا ہوں اور مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ان میں ہر سوال اور اعتراض کا جواب موجود ہے جو تحقیق حق کی نظر سے پڑھنے کے لیے

ان شاء اللہ العزیز کافی ہوگا۔ البتہ عمار خان کے بارے میں لگائے گئے الزامات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے نام کے ساتھ ''غامدی'' کا لاحقہ جوڑنے کی کم از کم ان بزرگوں سے توقع نہیں تھی، اس لیے کہ اس نے جاوید احمد غامدی صاحب سے بعض معاملات میں تلمذ ضرور حاصل کیا ہے، لیکن کیا تلمذ کے ساتھ نسبت بدل جاتی ہے؟ ہمارے مخدوم ومکرم حضرت مولانا قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ کے اساتذہ میں مولانا عبد الستار خان نیازی مرحوم اور حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمی قدس اللہ سرہ العزیز کے اساتذہ میں مولانا محمد چراغ مرحوم، جبکہ والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کے اساتذہ میں مولانا غلام محمد رحمانی مرحوم اہل حدیث کا نام آتا ہے۔ تو کیا یہ بزرگ انہیں بھی نیازی اور رحمانی وغیرہ کی نسبت سے نوازیں گے؟

عمار خان کی چند سال قبل کچھ عرصے کے لیے غامدی صاحب کے ادارے کے ساتھ بطور ریسرچ اسکالر وابستگی رہی ہے، لیکن یہ بزرگ کیا فرمائیں گے کہ سر سید احمد خان مرحوم نے اپنے کالج کے شعبہ دینیات کے لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد حضرت مولانا عبد اللہ انصاریؒ کا انتخاب کیا تھا اور انہوں نے حضرت نانوتویؒ کے حکم پر سالہا سال تک سر سید احمد خان مرحوم کے کالج میں ملازمت کی تھی۔ کیا یہ بزرگ اس بنیاد پر مولانا محمد عبد اللہ انصاریؒ کو سر سید احمد خان مرحوم کے خیالات ونظریات کا حامل ومؤید قرار دے دیں گے؟

عمار خان نے بعض مسائل میں غامدی صاحب کے موقف کی تائید کی ہے تو بعض معاملات میں ان پر تنقید بھی کی ہے جو ''الشریعہ'' کے صفحات میں شائع ہو چکی ہے۔ خود میں نے غامدی صاحب کے بہت سے نظریات پر تنقید کی ہے، لیکن بعض معاملات میں ان کی تائید بھی کی ہے اور یہی صحیح اور منصفانہ علمی رویہ ہے۔

مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں عمار خان کا ناجائز دفاع کرتا ہوں۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ میں دفاع ضرور کرتا ہوں، مگر ناجائز نہیں کرتا۔ ایک دوست میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم عمار خان کا دفاع کیوں کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں مزاج بن گیا ہے کہ ہر اختلاف کو کفر واسلام کا معرکہ بنالیا جاتا ہے۔ ہر جھگڑے کو ۳۰۲ کا کیس بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور فرضی طور پر توہین رسالتؐ کا کیس قائم کرنے پر پورا زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ ملک میں توہین رسالت کے بیسیوں کیس ایسے موجود ہیں جو مسلکی تعصب کی بنیاد پر درج کرائے گئے ہیں اور بے بنیاد ہیں۔ خود گوجرانوالہ میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔ ایک حافظ صاحب کو توہین قرآن کریم کا مجرم قرار دے کر سڑک پر گھسیٹ کر مار ڈالا گیا، لیکن جب تحقیق ہوئی تو اس کے پیچھے مسلکی عصبیت کارفرما تھی۔ اس طرز عمل کا ایک شکار ہمارے بھانجے اور جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم کے مہتمم مولانا قاری محمد ابوبکر صدیق سلّمہ بھی ہیں جنہوں نے گزشتہ سال اسی قسم کے ایک جھوٹے کیس سے بمشکل جان چھڑائی ہے۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ اگر عمار خان کسی جھگڑے میں دفعہ ۱۵۱/۱۰۷ کے درجہ کا ملزم بنتا ہو اور اس کے خلاف ۳۰۲ کی ایف آئی آر کٹوانے کی کوشش کی جائے تو مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ اس پر وہ صاحب خاموش ہو گئے۔

میں نے ہمیشہ دوستوں سے کہا ہے کہ عمار خان کے خلاف جس درجہ کی بات ہے، اتنی کرو تو میں آپ کے ساتھ

ہوں۔ اور اگر ۱۵۱/۱۰۷ کے کیس پر ۳۰۲ کا پرچہ درج کرانے کی کوشش کی جائے گی تو میں اس کے ساتھ ہوں گا اور مجھے اس کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ اور یہ صرف عمار خان کی بات نہیں ہے، جس کے ساتھ بھی اس قسم کی زیادتی ہوتی ہے، میں نے ماضی میں بحمد اللہ اسی کا ساتھ دیا ہے اور آئندہ بھی میرا طرز عمل ان شاء اللہ تعالیٰ یہی رہے گا۔

عمار خان کی بعض تحریروں سے میں نے بھی اختلاف کیا ہے جو ''الشریعہ'' میں شائع ہوا ہے۔ اپنے جد مکرم رحمہ اللہ تعالیٰ اور میرے توجہ دلانے پر اس نے بعض مسائل میں رجوع بھی کیا ہے اور وہ بھی ''الشریعہ'' کے ریکارڈ میں ہے اور اب بھی بعض مسائل پر ہمارے درمیان گفتگو جاری ہے جو ان شاء اللہ تعالیٰ حسب سابق مثبت نتیجہ تک ہی پہنچے گی۔ البتہ اس حوالے سے میرا موقف سمجھنے کی ضرورت ہے جو کئی بار وضاحت کے ساتھ پیش کر چکا ہوں:

☆ میں فکری طور پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا پیروکار ہوں جنہوں نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں صراحت کی ہے کہ وہ عقائد میں فرق کی بنیاد پر تو کسی کو اہل سنت سے خارج قرار دیتے ہیں، لیکن عقائد کی تعبیرات میں اختلاف کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ: **لست أستصح ترفع احدی الفرقتین علی صاحبتھا بانھا علی السنة** ۔ (میں اس بات کو صحیح نہیں سمجھتا کہ کوئی فریق دوسرے پر اس بات میں برتری جتائے کہ میں اہل سنت ہوں اور وہ نہیں ہے۔)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر، تینوں عقائد کی تعبیرات میں بیسیوں اختلافات کے باوجود اہل سنت میں شامل ہیں اور ان میں سے کسی کو اہل سنت سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

☆ فقہی طور پر بحمد اللہ تعالیٰ متصلب اور شعوری حنفی ہوں، لیکن اہل سنت کے دیگر فقہی مذاہب مالکیہ، شوافع، حنابلہ اور ظواہر کو گمراہ اور باطل قرار نہیں دیتا۔ حنفی مذہب کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہوں اور اگر کوئی حنفی کسی مسئلہ میں اپنے مذہب سے بلا جواز خروج کرتا ہے تو اسے خطا کار کہتا ہوں، لیکن باطل پرست اور گمراہ قرار نہیں دیتا، جیسا کہ فقہی معاملات میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔

☆ کسی بھی صاحب علم اور صاحب مطالعہ کا یہ حق سمجھتا ہوں کہ اگر مطالعہ و تحقیق کے دوران اس کی کوئی رائے قائم ہو تو اس کا اظہار کرے، بشرطیکہ صرف رائے کے درجہ میں ہو، اسے حکم یا فیصلے کے طور پر پیش نہ کیا جائے۔ اور اس رائے کا یہ حق ہے کہ اس پر غور کیا جائے اور بحث و مباحثہ کے ذریعے اس کے صحیح یا غلط ہونے کے نتیجے تک پہنچا جائے۔

☆ جمہور اہل سنت کے مسلمات کے دائرے کو حق کا معیار سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو گمراہی قرار دیتا ہوں۔ مگر اہل سنت میں شوافع، حنابلہ، مالکیہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔

اس دائرے میں میرا فکر و نظر کا توسع صرف عمار خان کے لیے نہیں، بلکہ مطالعہ و تحقیق کا ذوق رکھنے والے تمام حضرات کے لیے ہے۔ بیسیوں حضرات ایسے موجود ہیں جن کی میں نے اس دائرے میں حوصلہ افزائی کی ہے اور اب بھی کرتا ہوں اور اس حق سے عمار خان کو صرف اس لیے محروم نہیں کر سکتا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔

یہ میرا اصولی موقف ہے۔ جہاں تک مسائل کا تعلق ہے، بعض مسائل میں مجھے بھی عمار خان سے اختلاف ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ حق و باطل کے درجہ اور گمراہی کے دائرے کا نہیں ہے۔ اسے میں نے متنازع فیہ مسائل میں اپنا موقف خود تحریر کرنے کے لیے کہا ہے جو اس کے قلم سے ''الشریعۃ'' کے زیر نظر شمارے میں شائع ہو رہا ہے۔ احباب سے میری گزارش ہے کہ وہ اس کے موقف کو اس کے قلم سے ملاحظہ کریں اور پھر اس سے اختلاف کریں۔ کسی بھی جائز اختلاف میں وہ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ اگر کوئی دوست محاذ آرائی سے ہٹ کر عمار خان کے کسی موقف کے بارے میں افہام و تفہیم کے لہجے میں مجھے سمجھا دیں کہ وہ گمراہی کے درجہ کا ہے اور حق و باطل کے فرق کے دائرے میں آتا ہے، تو میں اس دوست کا شکر گزار ہوں گا، عمار خان کو اس سے رجوع کے لیے کہوں گا اور اگر وہ اس پر ضد کرے گا تو اس کے موقف سے لاتعلقی کا اعلان کرنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کروں گا۔

میرے اس طرز عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں خود اس مرحلہ سے گزر چکا ہوں اور میرے بزرگوں نے میرے بارے میں وہی طرز عمل اختیار کیا تھا جو میں آج کیے ہوئے ہوں۔ جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد درخواستی گروپ اور فضل الرحمٰن گروپ کے دو دھڑوں میں تقسیم ہوئی اور باہمی بیان بازی اور محاذ آرائی کا بازار گرم ہوا تو اس محاذ آرائی اور بیان بازی میں درخواستی گروپ کی طرف سے میں پیش پیش تھا۔ یہ گرم بازاری جب بہت زیادہ بڑھ گئی تو دوسری طرف کے چند اکابر بزرگ جو سب کے سب میرے مخدوم و محترم ہیں اور جن میں حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ، حضرت مولانا سید محمد شاہ امروٹیؒ، مولانا سید امیر حسین گیلانیؒ اور مولانا محمد لقمان علی پوریؒ شامل تھے، میرے خلاف شکایت لے کر حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس آئے اور فرمایا کہ مجھے اس حد تک آگے جانے سے روکا جائے۔ دونوں بزرگ اس گروپ بندی میں حضرت درخواستیؒ کے ساتھ تھے بلکہ حضرت والد محترمؒ تو اس وقت بھی جمعیۃ علماء اسلام کے ضلعی امیر تھے۔ دونوں بزرگوں نے ان محترم بزرگوں کی بات سنی اور معذرت کر دی۔ حضرت والد محترمؒ نے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، البتہ حضرت صوفی صاحبؒ نے مجھے بعد میں بلایا اور بتایا کہ یہ بزرگ تشریف لائے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ اگر زاہد نے جماعتی معاملہ میں کوئی مالی بد دیانتی کی ہے یا کسی بزرگ کی شان میں گستاخی کی ہے یا کوئی اور بد اخلاقی کی ہے تو میں اسے ابھی آپ بزرگوں کے سامنے بلا کر ڈانٹوں گا اور سختی کے ساتھ منع کر دوں گا۔ لیکن اگر مسئلہ صرف رائے کا ہے تو میں اسے کچھ نہیں کہوں گا، اس لیے کہ اپنی رائے اختیار کرنا اگر دوسرے لوگوں کا حق ہے تو اس کا بھی اتنا ہی حق ہے اور وہ اپنی رائے میں مکمل آزاد ہے۔ یہ فرما کر حضرت صوفی صاحبؒ نے مجھے کہا کہ کسی اور معاملے میں شکایت کا موقع نہ دینا تو رائے کے معاملہ میں ہم کوئی دخل نہیں دیں گے۔

اسے میری کمزوری سمجھا جائے یا مجبوری کہ میں نے ان بزرگوں کے سائے میں تربیت پائی ہے جو جائز حدود میں اختلاف کا حق دیتے تھے، بات کو سنتے تھے، دلیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور اپنی رائے مسلط کرنے کا راستہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ اب جو ماحول ہمیں فراہم کرنے کی تگ و دو کی جا رہی ہے، وہ کم از کم میرے لیے اجنبی ہے۔ اس لیے کہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ، حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ میں سے کسی کا مزاج اور

ذوق ایسا نہیں تھا۔ میں جو کچھ بھی ہوں، ان بزرگوں کے فیض و برکت سے ہوں اور دنیا و آخرت میں انہی کے ماحول اور زمرے میں رہنا چاہتا ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

بعض حلقوں کی طرف سے میرے بارے میں یہ بھی کہا جا رہا ہے بلکہ اس پر ایک بڑی پروپیگنڈہ مہم کی بنیاد رکھی جا رہی ہے کہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات کے بعد ان کے راستے سے ہٹ گیا ہوں اور میں نے ان سے متضاد طرز عمل اختیار کر لیا ہے۔ جبکہ اہل خاندان اور دیگر متعلقین واحباب سب جانتے ہیں کہ دینی، تعلیمی، سیاسی، تحریکی اور صحافتی حوالوں سے میرا طرز عمل آج بھی وہی ہے جو حضرت والد محترمؒ کی زندگی میں تھا اور انہیں یہ سب کچھ معلوم تھا، بلکہ بہت سے معاملات میں مجھے ان کی رفاقت اور سرپرستی بھی حاصل تھی۔ میں اس وقت بھی وہی ہوں جو ان کی زندگی میں تھا اور میرے نظریات وافکار، طرز عمل اور کردار میں سر مو کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر کسی ایک بات کی بھی نشاندہی کر دی جائے جو میں اب کہہ یا کر رہا ہوں اور ان کی زندگی میں نہیں کرتا تھا تو نشاندہی کرنے والے دوست کا ''الشریعہ'' کے صفحات میں شکریہ ادا کروں گا۔

مثال کے طور پر سر دست ان میں سے دو باتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو بطور خاص بیان کی جا رہی ہیں۔ ایک یہ کہ ''الشریعہ'' کو علمی وفکری مسائل پر آزادانہ بحث ومباحثہ کا فورم بنایا گیا ہے جو ان ناقد دوستوں کے نزدیک درست نہیں ہے اور انہیں اس بارے میں اپنی رائے قائم کرنے کا حق ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اکتوبر ۸۹ء میں شائع ہونے والے پہلے شمارہ سے ہی اصولی طور پر یہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اگر ابتدائی قارئین کو یاد ہو تو ہم نے ''الشریعہ'' میں اس آزادانہ علمی بحث ومباحثہ کا آغاز شیخ الازہر الشیخ جاد الحق علی جاد الحق رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک تفصیلی مقالہ سے کیا تھا جو انہوں نے راقم الحروف کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا تھا اور اس میں چند ایسے مسائل پر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا جو فقہی دنیا میں اب بھی مختلف فیہ ہیں۔ ان کا تفصیلی مضمون ہمارے محترم دوست پروفیسر غلام رسول عدیم کے اردو ترجمہ کے ساتھ ''الشریعہ'' کے پہلے شمارے کی زینت بنا تھا اور تب سے ہماری پالیسی یہ ہے کہ کسی بھی علمی، فقہی یا فکری مسئلہ پر مختلف نقطہ ہائے نظر کو شائع کیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ قارئین کے سامنے مسئلہ کے ضروری پہلوؤں کے بارے میں سب کا موقف اور دلائل پیش کر دیے جائیں تاکہ انہیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی رہے۔

یہ مکالمہ ہماری علمی روایت کا حصہ ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی علمی مجلس اسی مکالمہ اور آزادانہ بحث ومباحثہ پر مشتمل ہوتی تھی اور حضرت امام ابوجعفر طحاویؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف ''شرح معانی الآثار'' اسی فقہی مکالمہ اور مجادلہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ''میلہ خدا شناسی'' میں شرکت اور ان کے خطاب کا تو فخر سے ذکر کرتے ہیں جو پبلک جلسہ میں ہندو، عیسائی اور دیگر مذاہب کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ براہ راست مکالمہ کی صورت میں ہوتا تھا اور اس میں عامۃ الناس کے ہجوم میں غیر مسلم مذہبی راہ نماؤں کے خطابات غور سے سنے جاتے تھے اور ان کے جوابات دیے جاتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے مختلف طبقات کے درمیان فکری اور علمی مکالمہ سے ہمیں وحشت ہونے لگتی ہے۔ والد محترمؒ شروع سے ''الشریعہ'' کے قاری تھے۔ انہیں یہ شکایت رہتی تھی کہ ''الشریعہ''

کا کمپوزنگ پوائنٹ باریک ہے جو آسانی سے پڑھا نہیں جاتا اور اپنے مخصوص لہجے میں انہوں نے متعدد بار فرمایا کہ:

''زاہد! تمہاری شریعت پڑھی نہیں جاتی، اس کا پوائنٹ بڑا کرو۔''

آخری عمر میں نظر بہت کمزور ہو جانے کے باعث وہ ''الشریعۃ'' کے مضامین دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے اور ان پر اظہار خیال کرتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے ایک مضمون کے بارے میں فرمایا کہ اس میں مخالف کے دلائل کا جو جواب دیا گیا ہے، وہ کمزور ہے، اس پر مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ایک بار بھی انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ اس مکالمہ کی ضرورت نہیں ہے یا اسے بند کر دینا چاہیے۔ ہاں، عزیزم محمد عمار خان ناصر کی بعض انفرادی آرا پر انہوں نے ضرور تبصرہ کیا ہے، بلکہ اسے بلا کر سمجھایا ہے، بعض امور میں اس نے وضاحت کی ہے اور حضرت شیخؒ کی رائے کے مطابق رجوع بھی کیا ہے، لیکن علمی وفکری مکالمہ کی پالیسی پر انہوں نے کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ جبکہ یہ پالیسی ان کی زندگی میں اور ان کے علم میں سال ہا سال تک جاری رہی اور اسی تسلسل سے اب بھی جاری ہے۔ اس لیے اگر کسی بزرگ یا دوست کو اس طرز عمل پر اشکال ہے تو یہ ان کا حق ہے، لیکن ہر دوست کے ہر اشکال کو دور کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب بھی ہماری پالیسی یہی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر اگر ایک طرف کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف کا موقف بھی پیش کر دیا جائے تاکہ توازن رہے۔

دوسری بات جس کا شد ومد کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے، وہ مشترکہ تحریکات میں میری شرکت اور مختلف مکاتب فکر کے مراکز اور محافل میں میرا آنا جانا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے یہ میرے معمولات کا حصہ ہے کہ میں دوسرے مکاتب فکر کے ایسے جلسوں اور میٹنگوں میں جاتا ہوں جو کسی مشترکہ قومی اور دینی موضوع پر ہوتے ہیں، بلکہ ان کے ساتھ مشترکہ قومی اور دینی تحریکات میں شریک ہوتا ہوں اور بھرپور کردار ادا کرتا ہوں۔ میرا یہ طرز عمل اور کردار والد محترم رحمہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا، بلکہ اس میں مجھے ان کی رفاقت اور سرپرستی بھی حاصل تھی۔ میں نے جامعہ نصرۃ العلوم سے فراغت کے بعد جب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی عبد الواحد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نائب خطیب کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا تو ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں گوجرانوالہ شہر کی کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا مجھے سیکرٹری جنرل چنا گیا اور میں نے جلسوں اور جلوسوں میں بھرپور شرکت کی۔ حضرت والد محترمؒ نے نہ صرف سرپرستی فرمائی بلکہ بہت سے جلسوں سے خطاب بھی کیا۔ جبکہ مجلس عمل میں بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور شیعہ مکتب فکر کے راہ نما شریک تھے، بلکہ بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین مولانا ابوداؤد محمد صادق مجلس عمل کے صدر تھے۔

کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا میں اس کے بعد سے مسلسل حصہ چلا آ رہا ہوں اور کافی عرصے تک مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی ذمہ داریاں بھی میرے سپرد رہی ہیں۔ ہر مرحلہ میں حضرت والد محترمؒ کی بھرپور رفاقت اور سرپرستی سے بہرہ ور رہا ہوں اور انہوں نے تحریک ختم نبوت کے ہر مرحلہ میں عملی کردار ادا کیا ہے۔

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کی قیادت میں ہر سطح پر نمایاں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، جماعت اور شیعہ راہ نما شریک تھے۔ میں پاکستان قومی اتحاد صوبہ پنجاب کا سیکرٹری جنرل تھا اور صوبہ بھر میں مسلسل متحرک تھا۔ حضرت والد محترمؒ

بھی جمعیۃ علماء اسلام ضلع گوجرانوالہ کے امیر کی حیثیت سے پاکستان قومی اتحاد کا حصہ تھے۔ اسی تحریک میں انہوں نے گرفتاری پیش کی تھی اور ایک ماہ جیل میں رہے تھے۔ باقی بہت سی ایسی تحریکات کو نظر انداز کرتے ہوئے حضرت والد محترمؒ کے ایام علالت کے ایک مشترکہ فورم کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ''متحدہ مجلس عمل'' کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اس کی قیادت میں بھی شیعہ سمیت تمام مکاتب فکر کے اکابرین شامل تھے۔ گکھڑ کے قومی اسمبلی کے حلقہ سے جماعت اسلامی کے ضلعی امیر جناب بلال قدرت بٹ متحدہ مجلس عمل کے امیدوار تھے۔ حضرت والد محترمؒ نے علالت اور صاحب فراش ہونے کے باوجود نہ صرف متحدہ مجلس عمل کی کھلم کھلا حمایت کی بلکہ جناب بلال قدرت بٹ کی عملی سپورٹ بھی کی تھی۔

میں آج بھی اسی طرز عمل پر قائم ہوں اور زندگی بھر اسی پر قائم رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حوصلہ اور استقامت سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔ میرے اس مسلسل طرز عمل اور پالیسی پر حضرت والد محترمؒ کو کوئی اشکال نہیں تھا۔ وہ مجھے ہر مرحلہ میں سرپرستی بلکہ رفاقت سے نوازتے رہے، اور اس سب کچھ کے باوجود انہوں نے بے حد شفقت اور اعتماد کے ساتھ اپنی علمی، تدریسی اور روحانی ذمہ داریاں وفات سے پہلے میرے سپرد فرمائیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اس کے باوجود اگر کچھ حضرات اسے موضوع بحث بنا کر ملک میں منفی مہم چلا رہے ہیں تو وہ یہ مہم صرف میرے خلاف نہیں چلا رہے بلکہ حضرت والد محترم رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلاف بھی بے اعتمادی کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔

یہ مہم دیکھ کر مجھے وہ تاریخی واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا تذکرہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے ''امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے کہ جب مشہور خارجی کمانڈر ضحاک نے کوفہ پر قبضہ کر لیا تو اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت کوفہ کی جامع مسجد میں تلواریں تان کر بیٹھ گیا اور اعلان کیا کہ کوفہ کے سب لوگ مرتد ہیں، اس لیے میرے سامنے آ کر توبہ کریں اور جو توبہ نہیں کرے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس سے قبل انہی خارجیوں کا ایک گروہ بصرہ پر قابض ہو کر ہزاروں افراد کو شہید کر چکا تھا۔ اس لیے اس کے اس اعلان سے کوفہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس موقع پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کا حوصلہ و تدبر کام آیا۔ وہ ضحاک کے سامنے پیش ہوئے اور پوچھا کہ وہ کس بنیاد پر کوفہ کی آبادی کے قتل کا اعلان کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں، اس لیے اگر توبہ نہیں کریں گے تو میں انہیں قتل کر دوں گا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ مرتد اسے کہتے ہیں جو اپنا دین ترک کر کے دوسرا دین اختیار کر لے، جبکہ کوفہ کی آبادی تو اسی دین پر ہے جس پر وہ پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا دین ترک نہیں کیا، انہیں مرتد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ضحاک خارجی نے امام صاحبؒ سے کہا کہ وہ اپنی بات پھر دہرائیں۔ امام صاحبؒ نے دوبارہ اپنے موقف کی وضاحت کی تو ضحاک نے یہ کہہ کر اپنی تلوار کا رخ زمین کی طرف کر دیا کہ أخطأنا، ہم سے غلطی ہو گئی ہے اور باقی لشکر کو بھی تلواریں جھکانے کا حکم دے دیا جس پر اہل کوفہ کی جان بخشی ہو گئی۔ ایک بزرگ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کوفہ کی ساری آبادی ابوحنیفہؒ کے آزاد کردہ غلام کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے کہ ان کی وجہ سے وہ قتل ہونے سے بچ گئے ہیں۔

اس وقت کے ''ضحاک'' کو تو یہ سادہ سی بات سمجھ آ گئی تھی اور اس نے أخطأنا کہہ کر تلواریں جھکا لی تھیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہمارے آج کے ''مہربان'' بھی اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟

محمد عمار خان ناصر

میری اختلافی آرا اور ان کی علمی بنیاد

راقم الحروف نے گزشتہ دس بارہ سال کے عرصے میں مختلف علمی وفکری مسائل کے ضمن میں اپنے جو طالب علمانہ نتائج فکر اہل علم کی خدمت میں نقد وتبصرہ کے لیے پیش کیے ہیں، ان میں سے بعض چونکہ روایتی طور پر معروف نقطہ نظر سے مختلف اور روایتی انداز نظر سے مسائل کو دیکھنے والے ذہن کے لیے خاصے اجنبی ہیں، اس لیے ان پر اضطراب و تشویش کا پیدا ہونا اور مختلف ذہنی سطحوں کے مطابق تنقید وتبصرہ کا عمل شروع ہو جانا بالکل فطری اور متوقع بات تھی۔ میں اپنی ہر تحریر میں اپنے نقطہ نظر کے علمی دلائل کی بھی ساتھ ہی ساتھ وضاحت کرتا رہا ہوں اور بہت سے مسائل پر سامنے آنے والی تنقید کے حوالے سے مزید توضیح وتشریح کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ یہ مباحث چونکہ سیکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور یقیناً ہر قاری ان پر براہ راست نظر بھی نہیں رکھتا، اس لیے اگر ان آرا کو علمی استدلال اور فکری بنیاد سے معرا کر کے ایک خالی الذہن قاری کے سامنے رکھا جائے، جیسا کہ بعض حالیہ تنقیدات میں کیا گیا ہے، تو اس سے ایک عمومی ذہنی توحش کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں، یقینی بھی ہے اور دراصل استدلال کی وضاحت کے بغیر صرف ''احتیاط'' سے منتخب کردہ جملوں کو ناواقف قاری کے سامنے پیش کرنے کے اسلوبِ تنقید کا اصل ہدف بھی یہی ہوتا ہے۔

اس تناظر میں، میں والد گرامی کی ہدایت پر اہم اختلافی مسائل کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر اور اس کے استدلال کے بنیادی نکات نہایت مختصر طور پر یہاں بیان کر رہا ہوں تا کہ ایک حد تک متعلقہ مسئلے کی نوعیت عام قارئین کے سامنے آ سکے۔ اگر اس تحریر میں کوئی تشنگی محسوس ہو تو وہ بالکل فطری ہوگی اور تفصیل کے طالب حضرات سے میری گزارش یہ ہوگی کہ وہ اس نکتے سے متعلق میری مفصل تحریروں کو ملاحظہ فرمالیں۔

ا۔ مسجد اقصیٰ کی تولیت کا مسئلہ

مسجد اقصیٰ کا نام قرآن مجید نے بیت المقدس میں قائم بنی اسرائیل کی اس عبادت گاہ کے لیے استعمال کیا ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا اور اللہ کے حکم سے اسے بنی اسرائیل کا قبلہ مقرر کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے بیت المقدس کو فتح کرنے سے صدیوں قبل یہودیوں کو اس شہر اور عبادت گاہ سے بے دخل کیا جا چکا تھا اور ان کی جگہ اس وقت یہاں نصاریٰ قابض تھے۔

تاریخی روایات کے مطابق بیت المقدس کی فتح کے موقع پر سیدنا عمرؓ جب یہاں تشریف لائے تو آپ نے نومسلم یہودی عالم کعب الاحبارؒ سے دریافت کیا کہ صخرہ، جسے یہود کے قبلے کی حیثیت حاصل ہے، کس جگہ پر واقع ہے؟ کعبؒ نے پیمایش کر کے اس کی جگہ متعین کی۔ اس جگہ کو نصاریٰ نے یہودیوں کے ساتھ اظہار نفرت کے لیے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ میں تبدیل کر رکھا تھا۔ سیدنا عمرؓ نے گندگی کو وہاں سے ہٹا کر صخرہ کو پاک صاف کرنے کا حکم دیا اور خود بھی اس کی صفائی میں شریک ہوئے۔ پھر آپ نے کعبؒ سے مشورہ طلب کیا کہ مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لیے کون سی جگہ منتخب کی جائے؟ کعبؒ نے کہا کہ نماز صخرہ کے پیچھے ادا کی جائے تاکہ بنی اسرائیل اور امت محمدیہ، دونوں کے قبلوں کی تعظیم ہو جائے۔ سیدنا عمرؓ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور اس کے بجائے مسجد کے اگلے حصے میں یعنی جنوبی دیوار کے قریب ایک جگہ کو مسلمانوں کی نماز کے لیے مخصوص کر دیا۔

راقم الحروف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کا وہ حصہ جسے حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی عبادت کے لیے خاص کیا، اس پر تولیت وتصرف تاریخی وشرعی طور پر مسلمانوں کا حق ہے۔ تاہم اس کے علاوہ عبادت گاہ کا وہ حصہ جہاں اصل ہیکل سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا اور جو یہود کے قبلے کی حیثیت رکھتا ہے، اس پر بنی اسرائیل کا حق اصولی طور پر حسب سابق برقرار ہے۔ شریعت اسلامیہ میں ان کے اس حق کی تنسیخ کے لیے کوئی تصریح موجود نہیں، جبکہ بطور ایک مذہب کے یہودیت کے لیے دنیا میں باقی اور قائم رہنے کا حق تسلیم کرنے کے بعد ان کے لیے اپنے قبلے پر تولیت وتصرف کا حق تسلیم نہ کرنا ایک غیر منطقی اور داخلی تضاد پر مبنی موقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبادت گاہ کے مرکزی حصے کو مسلمانوں کے تصرف میں لینے سے گریز کیا اور ان کی عبادت کے لیے وہاں سے ہٹ کر ایک جگہ مخصوص کی۔ بعد میں خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ نے جب اصل عبادت گاہ کے حصے میں قبۃ الصخرہ تعمیر کروایا اور اسے ایک مذہبی زیارت گاہ کا درجہ دے دیا تو اس کے انتظام وانصرام میں یہودیوں کو بھی شریک کیا اور انھیں بطور مجاور یہاں خدمت انجام دینے کا موقع فراہم کیا۔
بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر عبادت کے جنوبی حصے میں قائم مسلمانوں کی مسجد پر مسلمانوں کا حق برقرار رکھتے ہوئے اصل اور مرکزی حصے میں، جہاں حضرت عمرؓ نے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا، یہود اپنی عبادت گاہ دوبارہ تعمیر کرنا چاہیں تو اسلامی شریعت کا کوئی حکم اصولی طور پر اس میں مانع نہیں ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ علمی وفقہی مسائل میں اجماع کی حیثیت

اجماع کے حوالے سے راقم نے جو اپنی متعدد تحریروں میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

ا۔ جن معاملات میں قرآن وسنت کے نصوص ساکت ہوں یا ایک سے زیادہ تعبیرات کا احتمال رکھتے ہوں، ان میں ایک فقیہ یا مجتہد کا ''اجتہاد'' دلیل شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجماع چونکہ اجتہاد ہی کی ایک صورت اور اس کی فرع ہے، اس لیے اس کے فی نفسہ ایک قابل اتباع دلیل شرعی ہونے میں کوئی کلام نہیں جس کا درجہ بدیہی طور پر انفرادی واختلافی اجتہاد سے برتر ہے۔

۲۔ قرآن یا سنت کے نصوص، دلائل شرعیہ میں بنیادی اور اساسی دلیل کا درجہ رکھتے ہیں، جبکہ اجتہاد اور اجماع ان نصوص پر متفرع ہونے کی وجہ سے ثانوی دلیل کا۔ اس وجہ سے اجماع کی قوت یا ضعف اور قطعی یا ظنی ہونے کا تعین اس شرعی دلیل کی نوعیت کے لحاظ سے ہوگا جس پر وہ مبنی ہے۔ اگر اجماع کی اساس بننے والے شرعی دلائل قطعی اور یقینی ہیں تو اجماع کا درجہ بھی یہی ہوگا اور اگر دلائل ظنی واستنباطی ہیں تو اجماع بھی اسی درجے کی دلیل ہوگا۔

۳۔ اگر شرعی نصوص فی نفسہ ایک سے زیادہ تعبیرات کا احتمال رکھتی ہوں اور ان میں سے کسی ایک تعبیر پر کسی دور کے فقہا اتفاق کر لیں تو کیا وہ مسئلہ قطعی طور پر منصوص حکم کی حیثیت حاصل کر لے گا جس سے کوئی فقیہ متبادل اجتہاد واستنباط کی بنیاد پر اختلاف نہیں کر سکتا؟ اس ضمن میں اکابر فقہاء ومجتہدین اور محقق علمائے اصول کے طرز عمل سے یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ ایسے اتفاق کو ایک ظنی درجے ہی کی دلیل سمجھتے ہیں جس سے دلیل کی بنیاد پر انفراداً بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ایک دور کے اہل علم کے متفقہ نقطہ نظر کے برعکس بعد کے ادوار کے اہل علم اجتماعی طور پر بھی کوئی مختلف نقطہ نظر اختیار کر سکتے ہیں۔ امت کی فقہی واجتہادی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں اور نظائر موجود ہیں۔

۴۔ کسی بھی مسئلے میں اجماع کا دعویٰ کرتے ہوئے اور اس کی بنیاد پر متبادل امکانی تعبیرات کو قطعاً خارج از بحث قرار دیتے ہوئے اجماع کے عملی تحقق کے پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ علمی وفقہی مسائل میں اجماع سکوتی ہی ممکن ہے، کیونکہ کسی بھی دور میں پورے عالم اسلام کے تمام علماء وفقہا کی آرا کو معلوم کرنا اور یہ یقین حاصل کرنا کہ کوئی بھی فقیہ معروف رائے سے مختلف سوچ نہیں رکھتا، قطعی ناممکن ہے۔ اس لیے اجماع سکوتی کو ظاہری اور مجازی طور پر ہی اجماع کہنا درست ہے، حقیقی معنوں میں اس پر اجماع کا حکم لگانا مشکل ہے۔

۳۔ رجم کی شرعی حیثیت

رجم کی سزا کی شرعی حیثیت کے ضمن میں میری معروضات کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ زنا کے مجرموں کو سنگسار کیا جانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے ثابت ہے اور اسے شریعت کی مقرر کردہ مستقل سزا کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں خوارج کا، قرآن میں رجم کی سزا مذکور نہ ہونے کی بنا پر اس کا سرے سے انکار کر دینے کا موقف غلط اور ناقابل قبول ہے۔

۲۔ قرآن میں زانی کے لیے صرف سو کوڑے کی سزا ذکر کی گئی ہے، جبکہ سنت سے اس پر رجم کی سزا کا اضافہ ثابت ہے۔ ان دونوں بظاہر متعارض حکموں کے مابین تطبیق وتوفیق یا علمی وفقہی درجہ بندی کے لیے چودہ صدیوں میں مختلف علمی توجیہات پیش کی گئی ہیں جن میں سے زمانی لحاظ سے آخری توجیہ مولانا اصلاحیؒ اور بعض دیگر معاصر اہل علم نے پیش کی ہے۔ ان کی رائے کی مطابق رجم کی سزا، اصلاً زنا کی نہیں، بلکہ فساد فی الارض اور محاربہ کی سزا ہے اور اسے زنا کے عادی مجرموں یا اوباشوں پر نافذ کیا جانا چاہیے، چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔

۳۔ راقم کے طالب علمانہ مطالعے کے مطابق قرآن کے ظاہری حکم اور سنت کے بیان کردہ اضافے کے مابین تطبیق

کے ضمن میں پیش کی جانے والی کوئی بھی توجیہ علمی اشکالات سے خالی نہیں۔ اس لیے علمی ونظری طور پر اس مسئلے میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ قرآن کی بیان کردہ سزا کو اصل اور حقیقی سزا قرار دیتے ہوئے رجم کو اضافی اور صواب دیدی سزا قرار دیا جائے اور، اس کے برعکس، اس نقطہ نظر کی بھی کہ قرآن کے ظاہری بیان کو قطعی اور فیصلہ کن نہ سمجھتے ہوئے سنت کو شرعی حکم کا مکمل بیان تسلیم کیا جائے۔

۴۔ جہاں تک کسی اسلامی ریاست میں عملی قانون سازی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق میرا اصولی موقف یہ ہے کہ وہ اسی رائے پر مبنی ہونی چاہیے جسے جمہور اہل علم کا اعتماد حاصل ہو تا آنکہ کوئی بھی نئی رائے بحث ومباحثہ کے بعد عمومی تائید حاصل کر لے۔ ۲۰۰۷ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ:

> ''جہاں تک نظری اور علمی سطح پر بحث وتحقیق کا تعلق ہے تو اسے نہ آئینی طور پر آرا اور تعبیرات کے کسی مخصوص دائرے میں محصور کیا گیا ہے اور نہ علمی وعقلی طور پر ہی اس قسم کی کوئی پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔......
> البتہ کسی بھی رائے کو عملاً قانون سازی کی بنیاد بنانے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وسیع تر اور ہمہ جہتی بحث ومباحثہ کے ذریعے سے اس رائے کے استدلال اور افادیت پر قوم کے نمائندہ طبقات کو اعتماد میں لینے کا اہتمام کیا جائے، ورنہ کسی ایسی متنازعہ تعبیر کو جسے علمی وفکری اور قانونی حلقوں، بلکہ خود رائے عامہ کا اعتماد حاصل نہ ہو، قانون سازی کی بنیاد بنانے سے نہ صرف یہ کہ قانون اپنی اخلاقی قوت سے محروم ہو جائے گا، بلکہ یہ طریقہ عمومی طور پر بھی مزید الجھنیں پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔'' (''حدود وتعزیرات: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ''، ص۱۲، ۱۳)

۴۔ ارتداد کی سزا

ارتداد کی سزا سے متعلق میری مختلف تحریروں کا حاصل یہ ہے کہ:

۱۔ ارتداد کی سزا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے دی ہے اور بغاوت یا محاربہ کی اساس پر نہیں، جیسا کہ بعض معاصر اہل علم کا نقطہ نظر ہے، بلکہ نفس ارتداد پر دی ہے۔

۲۔ اس سزا کی شرعی اساس 'اتمام حجت' کا اصول ہے، یعنی حق واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کرنا، جیسا کہ امام شافعیؒ کا موقف ہے۔

۳۔ 'اتمام حجت' کی کیفیت اور درجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور بعثت اور بعد کے ادوار میں فرق واقع ہونا بدیہی ہے، چنانچہ اس اساس پر مبنی فقہی احکام کے عملی اطلاق میں بھی دور اور زمانے کے بدل جانے سے فرق کا واقع ہونا فقہی اصول کے مطابق ہے۔

۴۔ سیدنا عمرؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے بعض مرتدین پر سزائے موت نافذ کرنے کے فیصلے سے اختلاف کیا، جبکہ تابعین میں سے امام ابراہیم نخعیؒ کا موقف یہ ہے کہ مرتد کو قتل کرنے کے بجائے عمر قید کی سزا دی جائے۔ اس سے واضح

ہوتا ہے کہ خود صدر اول میں بعض اکابر مجتہدین اس حکم کی نوعیت اور اس کے عملی اطلاق کے حوالے سے عمومی نقطہ نظر سے مختلف رجحان رکھتے تھے۔

۵۔ دور جدید میں بعض اہل علم نے اس مسئلے کو اس پہلو سے بھی دیکھا ہے کہ آج اگر مسلم ممالک میں اسلام سے کھلے ارتداد پر، جس کا تناسب بہت کم ہے، قانونی سزا نافذ کر دی جائے اور اس کے نتیجے میں غیر مسلم ممالک میں اسلام کی دعوت کے راستے میں قانونی رکاوٹیں کھڑی ہونے لگیں تو یہ شرعی مصالح کے خلاف ہوگا۔

۶۔ اس تناظر میں اگر دور جدید میں مسلم ریاستوں میں علی العموم ارتداد کی سزا کے نفاذ سے گریز کیا گیا ہے تو فقہی طور پر یہ فیصلہ درست اور زیادہ قرین حکمت ہے۔ چنانچہ قادیانیوں کے بارے میں جمہور علماء کا موقف اسی کی غمازی کرتا ہے، جبکہ پاکستان کے علماء کا منکرین حدیث کو خارج از اسلام قرار دینے کے بعد ان کے بارے میں ارتداد کی سزا کے نفاذ کا مطالبہ نہ کرنا بھی اسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے ہے۔

۵۔ اقدامی جہاد کا انکار؟

انیسویں صدی میں برصغیر میں جہاد کے حوالے سے جس مذہبی بحث ومباحثہ کا آغاز ہوا، اس نے بعض وجوہ سے یہ عنوان اختیار کر لیا کہ اسلام میں جہاد آیا صرف دفاع کے لیے مشروع ہے یا اس سے ہٹ کر اقدامی نوعیت کا جہاد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں آج بھی جہاد کے حوالے سے کسی بھی بحث کو اسی نکتے کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جاتا ہے، حالانکہ علمی طور پر اس بحث کے کئی دوسرے زاویے بھی ہو سکتے ہیں۔ راقم الحروف نے عہد نبوی وعہد صحابہ میں جہاد وقتال کی نوعیت کے حوالے سے اپنے جو تفصیلی نتائج تحقیق ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں پیش کیے ہیں، انھیں بھی بعض ناقدین نے دفاعی اور اقدامی جہاد کے تصور کے تحت اور اس بحث کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ مذکورہ تحریر میں بنیادی طور پر اس زاویے سے مسئلے پر گفتگو ہی نہیں کی گئی۔ میرے نزدیک یہ سوال بے معنی ہے کہ جہاد دفاعی ہوتا ہے یا اقدامی۔ یہ دفاعی بھی ہو سکتا ہے اور اقدامی بھی۔ اصل سوال یہ ہے کہ جہاد کی شرعی وجہ جواز کون سے امور بن سکتے ہیں اور بین الاقوامی نظام میں مسلمان ریاستوں کے غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات کی شرعی وفقہی اساس کیا ہے۔

مذکورہ بحث میں راقم الحروف نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد نبوی وعہد صحابہ میں غیر مسلم حکومتوں کے خلاف قتال ایک مخصوص شرعی اساس یعنی اتمام حجت کے قانون پر مبنی تھا جو شریعت کا عمومی قانون نہیں، بلکہ اس کا ظہور اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانی تاریخ کے بعض ایسے مراحل پر کیا جاتا ہے جب خدائی فیصلے کے تحت کسی قوم کو اس کے کفر وشرک اور اجتماعی بداعمالیوں کی سزا دینا مقصود ہو۔ اس مقصد کے لیے تکوینی اسباب کے تحت بھی کسی قوم کو دوسری قوم پر غلبہ اور حکومت عطا کر دی جاتی ہے اور بسا اوقات اہل ایمان کے کسی گروہ کو بھی یہ اذن اور اختیار دے دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے اس فیصلے کی تنفیذ کے لیے آلہ وجارحہ بن کر اہل کفر پر حملہ آور ہوں اور انھیں حکومت واقتدار سے محروم کر کے اپنا محکوم بنا لیں۔

اس بحث کا نتیجہ فقہا کے اس روایتی موقف سے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ

مسلمانوں کا اصل تعلق، جنگ کا ہے اور یہ کہ اگر مسلمانوں کے پاس طاقت موجود ہو اور کوئی عارضی مصلحت مانع نہ ہو تو اصل حکم یہی ہے کہ غیر مسلم ممالک کو فتح کر کے وہاں کے باشندوں کو محکوم بنالیا جائے اور ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے۔ دور جدید میں عالم اسلام کے بیشتر فقہا و محققین اس روایتی فقہی موقف سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان میں اکابر علمائے دیوبند مثلاً مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا مفتی ظفیر الدین عثمانی اور مولانا تقی عثمانی وغیرہ بھی شامل ہیں جو پرامن اور صلح پسند غیر مسلم اقوام وممالک کے ساتھ مستقل بنیادوں پر مصالحانہ تعلقات کے جواز کے قائل ہیں۔ اسی طرح دور جدید کے بیشتر علما وفقہا اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں پر جزیہ وغیرہ کے نفاذ پر اصرار نہیں کرتے اور خاص طور پر پاکستان کے دستور میں تو غیر مسلموں کو چند ایک کلیدی عہدوں کے استثنا کے ساتھ ریاستی نظم میں ہر سطح پر مسلمانوں کے ساتھ شریک کیا گیا اور انھیں مساوی حقوق کا حامل شہری تسلیم کیا گیا ہے اور اسے پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کی تائید حاصل ہے۔

۶۔عورت کی دیت

دیت کی مقدار سے متعلق میں نے مختلف تحریروں میں جو بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی مستند روایت میں مرد وعورت کی دیت میں فرق بیان کرنا ثابت نہیں۔

۲۔قرآن مجید نے دیت کے معاملے میں 'معروف' کی پیروی کا حکم دیا ہے جس سے مراد ہر معاشرے کا اپنا معروف ہے۔

۳۔صحابہ کرامؓ نے اپنے دور کے عرف کے مطابق مرد وعورت کی دیت میں فرق کیا جو قرآن کی ہدایت کے مطابق درست تھا، تاہم اس عرف کی پیروی ہر دور اور ہر معاشرے میں از روئے شریعت لازم نہیں۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں مختلف معاشرے مختلف قانون سازی کر سکتے ہیں۔

۴۔عورت کی دیت کے نصف ہونے کا موقف فقہا کا اجماعی موقف بھی نہیں، کیونکہ صدر اول کے دو معروف اصحاب علم ابوبکر الاصمؒ اور ابن علیہؒ اس کے قائل نہیں اور فقہ حنبلی کی مستند کتاب 'کشاف القناع' میں اسی بنیاد پر اس مسئلے پر اجماع کے دعوے کی تردید کی گئی ہے۔ اسی طرح امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ نقطہ نظر کو جس اسلوب میں بیان کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کے حق میں رجحان رکھتے یا کم از کم اسے قابل غور ضرور سمجھتے ہیں۔

۵۔ پاکستان میں بھی قصاص ودیت کا جو قانون نافذ کیا گیا ہے، اس میں مرد وعورت کی دیت میں فرق نہیں کیا گیا، جبکہ یہ قانون تمام مکاتب فکر کے جید علماء کرام کی مشاورت کے بعد نافذ کیا گیا ہے اور اسے مذہبی جماعتوں کی عمومی تائید بھی حاصل ہے۔

۷۔لعان اور تحقیق نسب کے جدید سائنسی ذرائع

اگر شوہر اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے تو شریعت نے اسے چار گواہ پیش کرنے کا پابند نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ یہ شرط پوری کرنا عادتاً ممکن نہیں، جبکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ اپنے الزام میں سچا ہو۔ ایسی صورت میں زنا سے پیدا ہونے والے بچے کو عورت کے شوہر کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس کے مقابلے میں محض شوہر کے دعوے پر الزام کو درست بھی نہیں مانا جا سکتا، کیونکہ الزام کے جھوٹا ہونے کا امکان بھی اتنا ہی مضبوط ہے۔ شریعت نے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ ایسی صورت میں میاں بیوی باہم لعان کرنے کے بعد جدا ہو جائیں تاکہ دنیوی معاملات کی حد تک دونوں فریق سزا سے (یعنی شوہر قذف کی سزا سے جبکہ بیوی زنا کی سزا سے) بری ہو جائیں۔

لعان کا دوسرا قانونی اثر یہ مرتب ہوگا کہ عورت جس بچے کو جنم دے گی، اس کا نسب اس کے شوہر سے ثابت نہیں مانا جائے گا۔ اس آخری نکتے کے حوالے سے دور جدید میں یہ اجتہادی بحث پیدا ہوگئی ہے کہ اگر جدید طبی ذرائع کی مدد سے بچے کے نسب کی تحقیق ممکن ہو اور عورت یہ مطالبہ کرے کہ اس پر زنا کا الزام جھوٹا ہے، اس لیے سائنسی ذرائع سے تحقیق کرنے کے بعد اگر ثابت ہو جائے کہ بچہ اس کے شوہر ہی کا ہے تو بچے کے نسب کو اس سے ثابت قرار دینا درست ہوگا؟

میرا طالب علمانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ عورت کا یہ مطالبہ درست اور اس کو وزن دینا مقاصد شریعت کے عین مطابق ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے لعان کے بعد بچے کے نسب کو شوہر سے منقطع کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے، اس کا مقصد بدیہی طور پر یہ نہیں ہوسکتا کہ اگر بچے کے نسب کی تحقیق ممکن ہو تو بھی عورت کو اپنے اوپر عائد کیے جانے والے الزام کی صفائی کا موقع نہ دیا جائے اور بچے کو اپنے نسب کے ثبوت کے حق سے محروم رکھا جائے۔ دور قدیم میں چونکہ تحقیق نسب کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ میسر نہیں تھا، اس لیے شریعت نے اتنا ہی حکم دینے پر اکتفا کی جو نصوص میں بیان ہوا ہے۔ تاہم اگر آج ایسا کوئی قابل اعتماد ذریعہ موجود ہو تو عورت اور بچے، دونوں کے حق کے تحفظ کے لیے اس سے مدد لینا شریعت کے مقصد اور منشا کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے عین مطابق ہوگا۔ اس کی عملی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ زنا کے الزام کی صورت میں میاں بیوی کے مابین لعان کروانے کے بعد دونوں کو جدا کر دیا جائے اور پیدا ہونے والے بچے کا نسب شوہر سے منقطع کر دیا جائے۔ اگر بیوی الزام کا انکار کرتے ہوئے سائنسی ذرائع کی مدد سے نسب کی تحقیق کا مطالبہ کرے اور طبی تحقیق سے اس کا دعویٰ درست ثابت ہو جائے تو بچے کے نسب کو اس کے باپ سے ثابت تسلیم کیا جائے۔ اس صورت میں لعان کا فقہی اثر اور فائدہ یہ ہوگا کہ شوہر پر قذف کی سزا جاری نہیں ہوگی۔

۸۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی

سیدنا مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی سے متعلق میرا نقطہ نظر، سابقہ تحریر (براہین، ص ۹۰۷۔۱۰۷) میں بعض توضیحی اضافوں کے ساتھ حسب ذیل ہے:

۱۔ کتب حدیث میں متعدد روایات میں قیامت کے قریبی زمانے میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے اور دجال کو قتل کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ محدثین کے معیار کے مطابق یہ روایات مستند اور قابل اعتماد ہیں، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بہت سی پیش گوئیوں کی طرح، اس پیش گوئی کے سچا ہونے پر بھی یقین رکھنا آپ

پر ایمان کا تقاضا ہے۔

۲۔ اس پیش گوئی سے متعلق علمی طور پر بعض اشکالات یقیناً پیش آتے ہیں، مثلاً قرآن مجید کا اس اہم واقعے کی صراحت سے صرف نظر کرنا اور متعلقہ احادیث میں بیان ہونے والے بعض امور کا بظاہر تاریخی واقعات کے مطابق نہ ہونا۔ تاہم چونکہ باعتبار سند یہ روایات قابل اعتماد ہیں اور ان میں وضع کے آثار نہیں پائے جاتے، اس لیے اشکالات کو اشکالات ہی کے درجے میں رکھنا زیادہ قرین احتیاط ہے۔ ان کی بنیاد پر پیش گوئی کا مطلقاً انکار کر دینا درست نہیں، خاص طور پر جبکہ روایات سے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ بالمعنیٰ نقل ہوئی ہیں اور کسی بھی واقعے سے متعلق تفصیلات کے نقل کرنے میں راویوں کا سوءِ فہم کا شکار ہو جانا ذخیرۂ حدیث میں ایک جانی پہچانی چیز ہے۔

۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ایک پیش گوئی کے طور پر سیدنا مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر اعتقاد رکھتے ہوئے، یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اپنی بنیادی نوعیت کے لحاظ سے یہ 'عقیدے' کا مسئلہ نہیں، یعنی کوئی ایسی بات نہیں جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمانیات کے ایک جزو کے طور پر بیان کیا ہو۔ ایمانیات کے معروف اور مسلمہ اجزا کے ساتھ موازنے سے اس مسئلے کی یہی نوعیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اللہ کی صفات، تقدیر، رسالت، ختم نبوت، قیامت وغیرہ، ان تمام عقائد پر اسلام کے اعتقادی وعملی نظام کی بنیاد ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جگہ سے ہٹانے سے یہ پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف احادیث میں بیان ہونے والے مستقبل کے واقعات میں سے کسی واقعے کے رونما ہونے یا نہ ہونے پر اسلام کے دینیاتی نظام کا ہرگز مدار نہیں اور بالفرض ان میں سے کوئی ایک واقعہ بھی رونما نہ ہونا ہو تو بھی اسلام کے اعتقادی نظام میں کسی طرح کا کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

۴۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کی روایات محققین کے نزدیک اپنی اصل کے لحاظ سے اخبار آحاد ہیں اور اس دائرے میں آتی ہیں جہاں روایات کی تحقیق وتفتیش کے ضمن میں باہم مخالف قرائن کی روشنی میں اشتباہ کا لاحق ہو جانا ممکن ہے۔ بعض صحابہ کے آثار سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی قطعی الثبوت اور متواتر روایت کے طور پر نہیں جانتے تھے۔ اس وجہ سے کوئی صاحب علم اگر ان روایات کے استناد سے اختلاف کریں تو یہ ایک علمی نوعیت کا اختلاف ہوگا جس پر دلائل کی روشنی میں شائستگی سے ہی تنقید کرنی چاہیے اور اس مسئلے کو ایمانیات کے بجائے احادیث کے حوالے سے بحث وتحقیق کے درجے میں ہی رکھنا چاہیے۔

۹۔ عورت کے لیے حق طلاق

عورت کے لیے مرد کے مساوی اور مطلق حق طلاق کی بات میرے نزدیک شرعی ترجیحات کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حق مرد کو و**للرجال علیهن درجة** کی تصریح کے ساتھ دیا ہے۔ اس تناظر میں، راقم نے لکھا ہے کہ:

''اگر آپ مطلق طور پر عورت کو حق طلاق دے دیں تو جو سوئے استعمال آپ مرد کی طرف روکنا چاہتے ہیں، اس کا امکان عورت کی طرف بھی ہے۔ اگر خاتون کو آپ علی الاطلاق، بالکل absolute right دے دیتے

ہیں کہ وہ جب چاہے، مرد سے الگ ہو جائے تو رشتہ نکاح کی وہ اصل ہیئت بھی قائم نہیں رہے گی جو اللہ نے قائم کی ہے اور غلط استعمال کی مثالیں بھی خواتین کی طرف سے زیادہ سامنے آئیں گی۔'' (براہین، ص ۸۲)

البتہ عملی مشکلات ومسائل کے تناظر میں خواتین کو بعض شرائط کے ساتھ محدود دائرے میں شوہر کے ساتھ حق طلاق میں شریک کرنے کی گنجائش فقہا کے ہاں ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے۔ اس ضمن میں، میں نے عرض کیا ہے کہ:

''لڑکی نکاح کے وقت طلاق کا حق مانگ سکتی ہے، لیکن عام حالات میں یہ خاوند کی رضامندی سے مشروط ہے کہ وہ بیوی کو حق طلاق تفویض کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ قانون اس کو پابند نہیں کرتا۔ لڑکی مطالبہ کرے تو شوہر کہہ سکتا ہے کہ میں یہ حق نہیں دیتا۔ ایسی صورت میں اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو ریاست قانون کا اختیار استعمال کرتے ہوئے خاوند کو پابند کر سکتی ہے۔ قانون اس کا پورا اختیار رکھتا ہے کہ کسی بھی فرد کے حق کو restrict کردے یا کسی بھی فرد کو ایسا حق جو عام طور پر اس کو حاصل نہیں ہوتا، مخصوص صورت حال میں وہ حق اس کو دے دے۔ تو اگر آپ ایک قانونی پابندی لگا دیں کہ ہر نکاح کے موقع پر خاوند اپنا حق طلاق ان ان شرائط کے ساتھ بیوی کو دے دے تو میرے نزدیک فقہی طور پر اس کی گنجائش موجود ہے۔...... اس سلسلے میں مثال کے طور پر یہ شرط لگائی جا سکتی ہے کہ بیوی اگر کسی موقع پر یہ مطالبہ کرے کہ مجھے طلاق چاہیے اور بیوی کا باپ یا سرپرست یا خاندان کا کوئی دوسرا ذمہ دار آدمی اس مطالبے کی توثیق کر دے کہ ہاں اس کا مطالبہ بجا ہے تو پھر خاوند پابند ہوگا۔'' (براہین، ص ۸۲، ۸۳)

''بعض صورتوں میں عورت بالکل جائز بنیادوں پر طلاق لینے کی خواہش مند ہوتی ہے، لیکن خاوند اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، جبکہ عورت کسی جائز وجہ سے خاوند سے علیحدگی چاہتی ہو تو یہ اس کا حق ہے اور خاوند شرعاً اس کے اس مطالبے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔...... معاصر تناظر میں اس الجھن کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ نکاح کے وقت طلاق کے حق کو مناسب شرائط کے ساتھ کسی ثالث یا خود عورت کو تفویض کر دینے کو قانونی طور پر لازم کر دیا جائے یا یہ قرار دیا جائے کہ اگر عورت خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے تو ایک مخصوص مدت کے اندر شوہر بیوی کو مطمئن کرنے یا اسے طلاق دینے کا پابند ہوگا، ورنہ طلاق از خود واقع ہو جائے گی۔'' (براہین، ص ۴۹، ۵۰)

۱۰۔ قادیانیوں سے متعلق حکمت عملی

قادیانیوں سے متعلق راقم الحروف کا رجحان کچھ عرصہ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے موقف کی طرف رہا ہے جو انھیں تاویل کا فائدہ دیتے ہوئے ان کی تکفیر نہ کیے جانے کے قائل تھے۔ تاہم بعد میں غور سے واضح ہوا کہ جمہور علما کا موقف شرعی وعملی مصالح کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس ضمن میں میری وضاحتی تحریر الشریعہ کے مئی ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ البتہ قادیانیوں کے ساتھ بطور ایک طبقے سماجی تعلقات منقطع کر دینے کی حکمت عملی سے مجھے اختلاف ہے۔ راہ حق سے بھٹک جانے والے ایک گروہ کو حق کی تبلیغ کی جو ذمہ داری امت پر عائد ہوتی ہے، اس

کے لحاظ سے یہ حکمت عملی اصولاً بھی درست نہیں اور عملاً بھی اس کے نتیجے میں قادیانی مائل بہ اصلاح نہیں ہوئے، بلکہ قادیانی قیادت کو اپنے متبعین کو کفر اور گمراہی کے دائرے میں محصور رکھنے میں مدد ہی ملی ہے۔ چنانچہ اس حکمت عملی سے اختلاف کرتے ہوئے میں نے محولہ بالا تحریر میں لکھا ہے کہ:

''میرے نزدیک قادیانیوں کو من حیث المجموع قانونی اعتبار سے کافر قرار دینے کا فیصلہ تو بالکل درست اور دینی وشرعی مصالح کے مطابق ہے، تاہم یہ نکتہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ عام مسلمانوں میں سے جو لوگ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے قادیانی تاویلات کے فریب کا شکار ہو چکے ہیں، ان کے ساتھ نفرت ومخاصمت اور سماجی مقاطعہ کا رویہ درست نہیں، بلکہ وہ اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ایک داعیانہ ہمدردی کے ساتھ انھیں مسلمانوں کے قریب تر کرنے اور ان کے لیے اسلام کے صحیح عقائد سے متعارف ہونے کے مواقع پیدا کیے جائیں، اس لیے کہ دعوت دین کا کام لوگوں کو حق اور اہل حق سے دور رکھنے کا نہیں، بلکہ راہ حق سے بھٹک جانے والے لوگوں تک پہنچ کر انھیں حق کے قریب لانے کی جدوجہد کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔'' (مئی ۲۱۰۲ء، ص ۲۴، ۲۵)

۱۱۔ صحابہ کرامؓ پر طعن وتشنیع کا الزام

صحابہ کرامؓ پر طعن وتشنیع ایمان کے منافی ہے اور کوئی مسلمان ارادتاً اور دیدہ ودانستہ ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے جس اقتباس کو صریح بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے اور میری طرف سے وضاحت کے باوجود مسلسل صحابہؓ پر طعن کی مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، وہ دراصل عہد نبوی کے منافقین سے متعلق ہے اور اس میں بھی طعن وتشنیع کے پہلو سے نہیں، بلکہ قرآن مجید کی ایک آیت کا مصداق متعین کرنے کے ضمن میں بعض ایسے افراد کا ذکر کیا گیا ہے جو بدکاری کو بطورِ عادت اختیار کیے ہوئے تھے۔ متعلقہ اقتباس (براہین، ص ۱۶۰ تا ۱۶۲) حسب ذیل ہے:

''سورۂ نساء کی آیات ۱۵، ۱۶ میں 'و اللاتی یاتین الفاحشة' اور 'و الذان یاتیانها' کا مصداق کون سے زانی ہیں اور پہلی آیت میں خواتین کو الگ ذکر کر کے ان کی سزا الگ بیان کرنے کی وجہ کیا ہے؟...... ہم نے آیات کے داخلی قرائن کی روشنی میں اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ یہاں زنا کا اتفاقیہ ارتکاب کرنے والے عام مجرم نہیں، بلکہ اس کو پیشہ اور عادت کے طور پر اختیار کر لینے والے مجرم زیر بحث ہیں اور قرآن نے پہلی آیت میں پیشہ ور بدکار عورتوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کی تدبیر بیان کی جبکہ دوسری آیت میں یاری آشنائی کا مستقل تعلق قائم کر لینے والے جوڑوں کی تادیب وتنبیہ کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔......

مولانا محترم نے ہماری اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے ...... یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اس توجیہ کو ماننے کی صورت میں یہ تصور کرنا پڑے گا کہ ''ایک انتہائی صالح مسلمان معاشرہ میں جس کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہوں، اس میں ایسے مسلمان افراد بھی ہوں جو بدکاری کے اڈے چلا رہے ہوں یا جن کا ناجائز تعلق یاری آشنائی کی صورت میں روزمرہ کے معمول کی صورت اختیار کر چکا ہو۔'' مولانا کا فرمانا ہے کہ ''کوئی بھی

باغیرت مسلمان اس تصور کو اپنے دل ودماغ میں جگہ نہیں دے سکتا۔'' (مقام عبرت، ص ۳۰)

تاہم مولانا محترم نے یہ سامنے کی بات نظر انداز کر دی ہے کہ عہد نبوی کے معاشرے نے اخلاقی تزکیہ وتطہیر کے سارے مراحل ایک ہی جست میں طے نہیں کر لیے تھے، اور اس معاشرے میں آپ کے تربیت یافتہ اور بلند کردار صحابہ کے علاوہ منافقین اور تربیت سے محروم کمزور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو مختلف اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں میں مبتلا تھی اور ان کی اصلاح وتطہیر کا عمل، جتنا بھی ممکن تھا، ایک تدریج ہی کے ساتھ ممکن تھا۔ اس طرح کے گروہوں میں نہ صرف پیشہ ورانہ بدکاری اور یاری آشنائی کے تعلقات کی مثالیں پائی جاتی تھیں بلکہ اپنی مملوکہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کر کے ان کے ذریعے سے کسب معاش کا سلسلہ بھی جاری وساری تھا، چنانچہ قرآن مجید کو اس تناظر میں اس بات کی باقاعدہ وضاحت کرنا پڑی کہ جن لونڈیوں کو اپنی مرضی کے خلاف مجبوراً اس دھندے میں ملوث ہونا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔''

۱۲۔ توہین رسالت کے قانون پر اعتراض

چند سال قبل پاکستان میں توہین رسالت کی سزا سے متعلق نافذ قانون کے حوالے سے بحث اخبارات وجرائد میں چھڑی تو راقم الحروف نے بھی ایک مفصل مقالے میں، جواب ''براہین'' میں شامل ہے، اس مسئلے کے مختلف پہلووں سے متعلق اپنا نقطہ نظر واضح کیا اور مروجہ قانون میں بعض اصلاح طلب امور کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی۔ بحث کے خلاصے کے طور پر میں نے ''براہین'' (ص ۵۹۵، ۵۹۶) میں لکھا ہے کہ:

''توہین رسالت سے متعلق حالیہ قانون چند بنیادی اور اہم پہلووں سے نظر ثانی کا محتاج ہے، اس لیے جید اور ذمہ دار علما کی راہ نمائی میں مذہبی جماعتیں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ترمیم شدہ اور جامع مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں کریں:

الف۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شہریت کے لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کے احترام کو بنیادی شرط قرار دیا جائے اور کوئی بھی شخص جو اپنے قول وفعل سے اس شرط کی دانستہ خلاف ورزی کرے، اس کے حقوق شہریت منسوخ کر دیے جائیں۔

ب۔ توہین رسالت کا جرم کسی ایک فرد کے خلاف نہیں، بلکہ پورے مسلمان معاشرے اور ریاست کے خلاف جرم ہے، اس لیے اس میں قانونی طور پر مدعی بھی کسی فرد کو نہیں، بلکہ ریاست کو ہونا چاہیے، جبکہ عام لوگوں کا کردار ایسے کسی بھی معاملے کو محض قانون کے نوٹس میں لانے تک محدود ہونا چاہیے۔

ج۔ مجرم سے پہلی مرتبہ جرم سرزد ہوا ہو تو اسے توبہ، معذرت اور معافی کا موقع دیا جائے، البتہ جرم کے مکرر ارتکاب کی صورت میں قرائن وشواہد سے یہ واضح ہو جائے کہ مجرم صرف دفع الوقتی کے لیے معذرت کا سہارا لے رہا ہے جبکہ حقیقی طور پر اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہیں تو اس کی توبہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

د۔ جرم کی نوعیت اور اثرات کے لحاظ سے سزائے موت کے ساتھ ساتھ متبادل اور کم تر سزاؤں کی گنجائش بھی قانون میں شامل کی جائے، جبکہ موت کی سزا کو اس جرم کی انتہائی سزا قرار دیتے ہوئے اسی صورت میں نافذ کیا جائے جب جرم کے سد باب اور اس کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لیے یہی سزا ناگزیر ہو۔

ہ۔ اگر توہین رسالت کا الزام جھوٹا ثابت ہو تو الزام لگانے والے کو سخت سے سخت سزا دی جائے تاکہ شخصی اور گروہی وطبقاتی نزاعات میں اس الزام کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔''

شق ''ج'' اور ''د'' میں توہین رسالت کے مجرم کو توبہ کا موقع دیے جانے اور موت سے کم تر تعزیری سزاؤں کی گنجائش کا جو موقف پیش کیا گیا ہے، وہ طبع زاد نہیں بلکہ احادیث، آثار صحابہ اور فقہائے احناف میں سے بالخصوص امام ابو یوسفؒ، امام طحاویؒ اور علامہ شامیؒ کی تصریحات پر مبنی ہے اور بہت سے معاصر اہل علم نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اس ضمن میں تفصیلی حوالہ جات ''براہین'' میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

۱۳۔ افغان طالبان کے دفاعی جہاد کی حیثیت

الشریعہ کے اکتوبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر، جواز اور اس کے خلاف طالبان کی مزاحمت کی شرعی حیثیت کے موضوع پر مختلف اہل قلم کے مابین ہونے والی ایک تفصیلی بحث شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس بحث میں یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ کیا طالبان کا القاعدہ کی قیادت کو، ان کے عالمی منصوبوں سے واقف ہونے کے باوجود، افغانستان میں ٹھکانہ مہیا کیے رکھنا اور پھر نائن الیون کے بعد براہ راست معلومات کی روشنی میں ان کے خلاف عدالتی تحقیق کے بجائے مخالفین سے ثبوت کا مطالبہ کرنا، شرعی واخلاقی طور پر کس حد تک درست تھا اور کیا اس پوری صورت حال میں ان کے طرز عمل کو سیاست وجہاد سے متعلق شریعت کے اعلیٰ اخلاقی تصورات کے مطابق کہا جا سکتا ہے؟ اس ساری بحث کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے طرز عمل کی خامیوں اور کمزوریوں کا داخلی طور پر بھی احتساب کرنا چاہیے اور کھلے بحث ومباحثہ کی مدد سے ایسے کمزور پہلووں کی نشان دہی کرنی چاہیے تاکہ آئندہ ان کے اعادہ سے اجتناب کیا جا سکے۔ بعض حضرات نے اس کو یہ مفہوم پہنایا ہے کہ میں نے امریکی حملے کے خلاف طالبان کے حق دفاع کا ہی انکار کر دیا ہے، حالانکہ مذکورہ بحث میں ہی پوری صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ طالبان کی دفاعی جنگ بالکل جائز اور مشروع ہے اور یہ کہ دشمن اگر کھلی جارحیت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائے تو بعض عملی کوتاہیوں یا غلط فیصلوں کی بنیاد پر مسلمانوں کے حق مزاحمت ودفاع ہی کی نفی کر دینا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں۔ متعلقہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''گیارہ ستمبر کے حملوں کے جواب میں طاقت کے بے محابا اور غیر ضروری استعمال سے [افغانستان کے] پوری ریاستی نظم کو تباہ کر دینے کا کوئی جواز نہیں تھا اور دہشت گرد عناصر کی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے متبادل اور زیادہ حکیمانہ طریقے اختیار کیا جا سکتے تھے۔ چنانچہ ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر طالبان یقیناً اس کا حق رکھتے تھے اور رکھتے ہیں کہ اپنی حکومت اور اقتدار کا دفاع کریں اور اسے بچانے یا بحال کرنے کے لیے حملہ آور طاقتوں کے خلاف جنگ کریں۔'' (الشریعہ، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۶)

''افغانستان پر حملے کے متعلق میرا کہنا یہ ہے کہ امریکہ القاعدہ کے ملوث ہونے کا قانونی ثبوت فراہم کر دیتا تو بھی یہ حملہ جائز نہیں تھا۔ بین الاقوامی قانون میں اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے مختلف طریقہ تجویز کیا گیا ہے جس کی امریکہ نے خلاف ورزی کی۔'' (ص ۲۸)

''القاعدہ کے حملوں میں ملوث ہونے کے اثبات سے مقصود امریکی حملے کو جواز فراہم کرنا نہیں۔ قانونی طور پر طالبان کا ثبوت مانگنا بالکل درست تھا اور یہ بھی ان کا حق تھا کہ وہ ثبوت نہ دیے جانے پر بن لادن کو امریکہ کے حوالے نہ کریں۔ فرض کریں، امریکہ ثبوت دے دیتا اور طالبان اسامہ کو حوالے نہ کرتے، تب بھی بین الاقوامی قانون کی رو سے حملے کا کوئی جواز نہیں تھا۔'' (ص ۳۱)

۱۴۔ القاعدہ کی قیادت پر تنقید

راقم الحروف پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ میں نے القاعدہ کی قیادت کی شان میں ''گستاخی'' کا ارتکاب کیا ہے۔ جہاں تک القاعدہ کے قائدین کی جرات وحوصلہ، وقت کی سپر پاور سے ٹکر لینے کے عزم، امت مسلمہ کی پستی اور زبوں حالی پر اضطراب اور آسودگی وآسائش کی زندگی چھوڑ کر جنگ کا کٹھن راستہ اختیار کرنے کا تعلق ہے تو شخصی اوصاف کے طور پر یہ چیزیں یقیناً قابل تحسین ہیں، لیکن اس بنیاد پر ان حضرات کی اختیار کردہ منفی حکمت عملی اور امت مسلمہ کے حق میں اس کے تباہ کن نتائج سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک یہ پہلو بے لاگ اور بے رحم تنقید کا تقاضا کرتا ہے اور اسی تناظر میں، میں نے بعض تحریروں میں القاعدہ کی قیادت پر سخت لب ولہجے میں تنقید کی ہے۔ یہاں ان میں سے بعض اقتباسات نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''القاعدہ اور اس قبیل کے عناصر کی اب تک کی ساری جهد وکاوش کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ مسلم معاشرے کی تائید اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نعرہ تو بلند کرتے ہیں اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے کا، لیکن حکمت عملی ایسی اختیار کرتے ہیں کہ ان کی سرگرمیوں، جدوجہد اور تباہ کاریوں کا سارا رخ خود مسلم معاشروں کے داخلی نظام اور ڈھانچے کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر جب ایک طرف امت کی مشکلات کے حل میں کوئی کامیابی نہیں ہوتی اور دوسری طرف خود مسلم معاشرے بھی اس طرز فکر کو عمومی تائید فراہم نہیں کرتے تو اس سے ایک نفسیاتی فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے جس کا اظہار مسلم حکمرانوں اور بارسوخ فکری طبقات کی تکفیر اور عام مسلمانوں کی کم سے کم تفسیق اور تنفیق کے فتووں کی صورت میں اور جہاں موقع ملے، ان کے خلاف مسلح جدوجہد کی شکل میں ہوتا ہے۔ جذباتی لفاظی اور الفاظ کی ملمع سازی سے صرف نظر کر لیا جائے تو القاعدہ کا اب تک کا نامہ اعمال اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے ''جہاد'' کے نام پر نائن الیون اور سیون سیون جیسے غیر شرعی کارنامے انجام دیے جس کے نتیجے میں پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی نہایت منفی تصویر ابھری اور امریکہ کو وار آن ٹیرر کے نام سے افغانستان اور عراق پر حملے کرنے کا موقع ملا۔ اسی کے براہ راست نتیجے کے طور پر افغانستان کی

امارت اسلامیہ کا سقوط ہوا اور پھر افغانستان میں گھیرا تنگ ہونے پر ان عناصر نے پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں آ پناہ لی۔ یوں اپنے وجود اور حرکتوں سے اس علاقے کے مسلمانوں کو بھی شدید مشکلات ومصائب کا نشانہ بنا دیا۔ اور اب امت مسلمہ کے مفاد میں یہ ساری ''خدمات'' انجام دینے کے بعد ان کی نظر کرم پاکستان پر ہے اور وہ یہاں کے عوام اور اہل علم کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ وہ پاکستان کے امن وامان اور ریاستی وحکومتی ڈھانچے کو تباہ کرنے کے اس ''کار خیر'' میں ان کا ہاتھ بٹائیں تاکہ عراق اور افغانستان کی طرح امریکہ اور عالمی طاقتوں کو یہاں بھی گھس آنے کا موقع ملے اور یوں ''مجاہدین'' امت مسلمہ کی سربلندی کا ایک اور کارنامہ اپنے نامہ اعمال میں درج کرا سکیں۔'' (الشریعہ، فروری ۲۰۱۲ء، ص ۶۲۶، ۶۲۷)

''اس تصور جہاد کے نمایاں خط وخال یہ ہیں: مسلمانوں کی ایک ریاست میں بیٹھ کر وہاں کے ارباب حل وعقد کی اجازت اور رضامندی کے بغیر ایک غیر مسلم ملک کے خلاف عسکری کارروائیاں کرنا، دشمن کی فوجی طاقت کو ہدف بنانے کی صلاحیت کے فقدان کا بدلہ دشمن کی عام آبادی کو نشانہ بنا کر لینا اور اس کے لیے احمقانہ شرعی جواز گھڑنا، چند برخود غلط جہادی نظریہ سازوں کا اپنی ذات کو لاکھوں مسلمانوں کی جان ومال سے زیادہ اہم سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرنے کے بجائے پوری کی پوری قوم کو جنگ کے بے پناہ مصائب وآلام کا شکار بنا دینا، عالمی طاقتوں کو اس ملک پر حملہ آور ہونے کا موقع فراہم کرنے کے بعد اپنے غیور میزبانوں کے ساتھ میدان جنگ میں ٹھہرنے اور ان کے شانہ بشانہ دشمن سے لڑنے کے بجائے وہاں سے فرار ہو کر ایک پڑوسی ملک میں پناہ لے لینا اور اس طرح اپنے وجود نامسعود سے اس ملک کے عوام اور فوج کو بھی جنگ کے شعلوں کی نذر کر دینا، پھر اپنی اور اپنے ہم نوا عناصر کی موجودگی کے خلاف اس ملک کی افواج کی طرف سے مجبوراً فوجی آپریشن کیے جانے پر پوری فوج کو مرتد قرار دینا اور اس بنیاد پر وہاں کے عوام کو اپنی ہی فوج کے خلاف برسر پیکار کر دینا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دو مسلمان ملکوں میں قتل وغارت اور فساد کی یہ ساری آگ لگانے کے بعد خود ''شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن'' کی تصویر بن کر بیوی بچوں سمیت کسی پر فضا مقام کی خفیہ سکونت اختیار کر لینا۔'' (الشریعہ، جولائی ۲۰۱۳ء، ص ۳۱، ۳۲)

آخر میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ میرے مطالعہ وتحقیق کا میدان بنیادی طور پر فقہ وشریعت کے مباحث اور بالخصوص عصر حاضر کے تناظر میں ان کی تشریح وتنفیذ سے متعلق مسائل ہیں اور اس دائرے میں، میں نے اپنے طالب علمانہ فہم کے مطابق اہل سنت کی مستند علمی روایت کی روشنی میں بعض روایتی فقہی مواقف پر ازسرنو غور وفکر کی ضرورت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اعتقادی وکلامی امور بنیادی طور پر میری بحث وتمحیص کا دائرہ نہیں اور اس حوالے سے میں دور قدیم میں ''الفقہ الاکبر'' اور ''العقیدۃ الطحاویۃ'' کو، دور متوسط میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے افکار کو اور اس پچھلے دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تشریحات کو بحیثیت مجموعی اہل سنت کے اعتقادی منہج کا مستند ومتوازن ترجمان تصور کرتا ہوں۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم

ابن تیمیہ اپنے معاصرین میں اپنے علمی تبحر میں ضرور ممتاز تھے، جیسا کہ ان کے معاصرین نے بلند کلمات میں اس کا اعتراف کیا ہے، لیکن ان کا اصلی امتیاز جس نے ان کو اپنے نامور اور فاضل معاصرین میں یگانہ روز اور تاریخ میں زندہ جاوید اور یادگار بنا دیا، وہ تنہا ان کا علمی تبحر نہ تھا بلکہ ان کا فکری استقلال، ذوق تحقیق اور مجتہدانہ طرز تھا۔ انہوں نے ان ہی علوم وفنون کا اور انہی کتابوں کا مطالعہ کیا جن کا ان کے معاصرین نے مطالعہ کیا تھا، مگر انہوں نے انہی علوم اور کتابوں کے اندر اپنی راہ پیدا کر لی اور جلد خصوصی مقام حاصل کر لیا۔ نحو سب نے پڑھی تھی اور سب سیبویہ کو واجب التقلید امام، اس کے قول کو حرف آخر مانتے تھے، لیکن ابن تیمیہ نے ''الکتاب'' کا بھی (جس کو علمائے نحو، نحو کا صحیفہ اور ناسخ کتب مانتے ہیں) ناقدانہ مطالعہ کیا تھا۔ ابوحیان نحوی نے جب سیبویہ کا حوالہ دیا تو انہوں نے صاف کہا کہ کیا سیبویہ کوئی نبی تھا جس پر نحو اتری ہے؟ اس نے ''الکتاب'' میں ۸۰ مقامات پر غلطی کی ہے۔ یونانی منطق وفلسفہ کے مطالعہ سے ان کے زمانہ کے اکثر علماء و فقہاء محتاط تھے اور جنہوں نے مطالعہ کیا تھا، وہ اس سے کم وبیش متاثر تھے۔ حد یہ ہے کہ فلسفہ کے سب سے بڑے ناقد اور مسلمانوں میں اس کے نبض شناس حجۃ الاسلام غزالی اپنی تصنیفات حتیٰ کہ احیاء العلوم کو یونانی الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق کے اثرات سے کلی طور پر محفوظ نہ رکھ سکے اور ان کی بہت سی تصنیفات میں مورخین فلسفہ کو یونانی فلسفہ کی جھلک اور پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ابن تیمیہ نے یونانی منطق اور فلسفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس سے وہ کہیں سمجھوتہ ...... کرتے نظر نہیں آتے۔ انہوں نے ''کتاب الرد علی المنطقیین'' میں یونانی منطق وفلسفہ کے مسلم الثبوت مسائل ومقدمات پر ناقدانہ بحث کی ہے اور ان پر عمل جراحی کر کے اس کے پورے نظام کو مجروح اور اپنے اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر کے رکھ دیا ہے۔

فقہ وحدیث میں بحث ونظر کے عرصہ سے کچھ محدود دائرے بن گئے تھے جن سے باہر قدم نکالنے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا تھا اور عرصہ دراز سے اس ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ابن تیمیہ نے بہت سے فقہی مسائل پر جو طے شدہ سمجھے جا رہے تھے، از سر نو غور کیا اور اپنی تحقیقات کے نتائج پوری شجاعت اور علمی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیے، جس کا اثر یہ ہوا کہ دماغوں اور علمی حلقوں کی ساکن سطح میں پھر جنبش پیدا ہوئی اور غور وفکر کا دروازہ کھلا۔ آخر میں انہوں نے استقلالاً محض کتاب وسنت اور آثار صحابہ کی بنا پر فتوے دینے شروع کیے۔''

(سید ابوالحسن علی ندویؒ، ''تاریخ دعوت وعزیمت، جلد دوم)

''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور جس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا، کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔''

جامعہ ملیہ دہلی کے تاسیسی اجلاس سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا خطاب

''دار العلوم کا مزاج ابتدا ہی سے بین الاقوامی ہے۔ اس نے قومی اور بین الاقوامی اسلامی تحریکات واجتماعات میں بھی شرکت سے کبھی گریز نہیں کیا۔...... آج دار العلوم کا یہی جذبہ ہے کہ اس کے ان علمی اور ثقافتی مقاصد کو اجتماعی رنگ سے عالمگیر بنایا جائے اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی قوت سے عالم کو آشکارا کیا جائے۔ نیز اسلام پر وارد کیے جانے والے شکوک وشبہات کا پردہ اجتماعی رنگ سے چاک کیا جائے۔ حالات وقت کے پیش نظر جامعہ دار العلوم کی یہ خواہش بجا اور برمحل ہے کہ اس نئی صدی میں امت مسلمہ، اسلام کے علمی مقاصد کو باہمی تعاون سے آگے بڑھائے اور جو کام اب تک شخصی یا انفرادی یا تن تنہا اداری قوتوں سے ہوا ہے، اسے اجتماعی بنائیں تا کہ پوری دنیا اسلام کے صحیح خدوخال سے واقف ہو۔''

دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس (فروری ۱۹۸۰ء)
میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب کا خطبہ استقبالیہ

''بعض حضرات کے طرز عمل سے کچھ ایسا تاثر قائم ہوا کہ مسلک علمائے دیوبند بھی (خدانخواستہ) ان ہی دھڑے بندیوں کا ایک حصہ ہے جو دنیا میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں اور جن کا مسلک یہ ہے کہ اپنے دھڑے کے ہر آدمی کی ہر خطا بھی معاف اور قابل دفاع ہے اور باہر کے آدمی کی ہر نیکی بھی دریا برد کرنے کے لائق ہے۔''

مولانا محمد تقی عثمانی، پیش لفظ ''علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' از مولانا قاری محمد طیب

سرورق کی تصاویر

جامعہ ازہر، قاہرہ
جامعہ ام القری، مکہ مکرمہ
دار العلوم، دیوبند
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنو
مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد